سیاست

علومِ معاشری کا سہ ماہی رسالہ

مجلسِ ادارت

سیاست

علومِ معاشری کا سہ ماہی رسالہ

جو

مارچ، جون، ستمبر اور دسمبر میں شائع ہوتا ہے

اس کا مقصد یہ ہے کہ سیاسی اور دیگر علومِ معاشری کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعہ اردو داں طبقہ میں مقبول بنایا جائے، اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دُنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہو اسے اُردو میں منتقل کیا جائے۔ یہ خالص علمی رسالہ ہے جس میں حیاتِ اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا مسلک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے علمی اور بعض اوقات مختلف فیہ مسائل پر بھی ہمارے صفحات میں جو بحث ہوگی وہ علمی انداز میں ہوگی۔

مضامین اور تبصرۂ کتب کے متعلق معتمد مجلسِ ادارت محمد عبدالقادر، لکچرار شعبۂ معاشیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے مراسلت کی جائے۔

اور

رسالہ کی خریداری، اُجرتِ اشتہارات اور دوسرے انتظامی امور کے متعلق شریک معتمد مجلسِ ادارت امتیاز حسین خاں، لکچرار کامرس، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے مراسلت کی جائے۔

مقامی خریداروں سے قیمت (عہ) روپے حالی سالانہ
بیرونی خریداروں سے قیمت (عہ) روپے کلدار ،،

فی پرچہ عصہ ۸ر

سیاست

جلد ۵	مارچ ۱۹۴۴ء	شمارہ ۱

فہرست مضامین

سیاست

جلد ۵ | جون ۱۹۴۴ء | شمارہ ۲

فہرست مضامین

سیاست

جلد ۵ — ستمبر ۱۹۴۴ء — شمارہ ۳

فہرست مضامین

سیاست

جلد ۵ دسمبر ۱۹۴۴ء شمارہ ۴

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی معاشیات کے چند فقہی اور قانونی ابواب

(بسلسلۂ گذشتہ)

شغلِ اصل

اب اس سلسلہ میں ایک آخری بات یہ رہ جاتی ہے کہ اسلام نے سودی کاروبار کو جب اپنے معاشیاتی نظام سے قطعاً خارج کر دیا ہے تو سوال ہوتا ہے کہ ملک کے جن افراد کے مصارف سے آمدنی کی جو رقم پس انداز ہو جاتی ہے آخر وہ اس کا صحیح استعمال کیا پیدا کریں۔ ماسوا اس کے یہ بھی مسلم ہے کہ جس طرح موجودہ زمانہ کی فاردنی مصارف والی کیمیائی اور سائنسی جنگوں کی ذمہ داری اگران سہولتوں پر عائد ہوتی ہے جو سود کی وجہ سے فراہمیٔ سرمایہ میں پیدا ہو گئی ہیں تو اسی کے ساتھ اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج دنیا کی ساری صنعتی ترقیاں جو کبیر پیمانہ کی پیداواروں پر مبنی ہیں بہت کچھ ان ہی آسانیوں کی رہینِ منت ہیں جو سود کی بدولت آج دنیا کو حاصل ہیں سودی کاروبار کو یک قلم بند کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ساری میکانیکی اور صنعتی چہل پہل کا بازار یکایک سرد پڑ جائے اور دنیا پھر اس عہدِ تاریک کی طرف

واپس ہو جائے جس میں بجائے بجلی کے قمقموں کے مٹی کا دیا اور بجائے طیاروں اور سیاروں کے بیل کی بنڈیوں پر آدمی راستہ طے کرتا تھا۔

بلاشبہ یہ دونوں سوالات قابل غور ہیں اگر اسلام کا معاشی نظام راہبانہ نظام ہوتا تو بآسانی کہہ دیا جاسکتا تھا کہ باسی بچانے کی ضرورت ہی کیا ہے جو کُتّے کھانے کی فکر کرنا پڑے۔ یعنی مصارف کے پس انداز کرنے کا اصول ہی غلط ہے۔ یا دنیا کو ریل وموٹر، برق وگیس ہی کی کیا حاجت ہے اور بعض جوگیانہ فطرتوں کو یہ کہتے ہوئے پایا بھی گیا ہے۔

مگر جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں اور آئندہ دخل کے صرف یا خرچ کا باب جب آئے گا۔ اس میں بھی بتایا جائے گا کہ یہ اسلامی نقطۂ نظر سے انحراف ہوگا۔ حقوق ومطالبات کے ادا کرنے کے بعد اسلام مال کے جمع کرنے یا رقم کے پس انداز کرنے کا مخالف نہیں ہے۔ بلکہ آیندہ معلوم ہوگا کہ وہ ایک حد تک اس کا ایک معاشی مشیر ہے۔ اسی طرح اسلام کی غلط ترجمانی ہوگی، اگر کائناتی اشیاء اور قدرت کے نت نئے قوانین سے استفادہ کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ اسلام اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ جس دین کے پیغمبرؐ نے غیر قوموں کی ایک سائنس کو یعنے جنگی ضرورت کے لیے (خندق کھودنے کو) اپنی اور اپنے اصحاب کی سنت قرار دی ہے جس نے منجنیق اور دبابوں کے استعمال کو عرب میں مروج کیا ہو، بجائے بے سلی لنگی (ازار) کے ایران کے سراویل (پائجامہ) کو پسند کیا ہو اور جس نے کفن اور قبر تک میں حُسن کاری کی تعلیم دی ہو، اس کو جدید صنعتی ترقیوں کا مخالف آخر کس بناء پر قرار دیا جاسکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ربوا کے حرام کرنے والے اسلام کے پیش نظر یہ دونوں سوالات تھے، اور جہاں تک میں خیال کرتا ہوں ان دونوں کا جواب اسلامی معاشیات میں موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے مصارف سے بچے ہوئے یا بچائے ہوئے سرمایہ کو جو لوگ سود پر چلاتے ہیں عموماً وہ یہی کرتے ہیں کہ اپنا یہ سرمایہ کسی دوسرے کے

حوالہ کردیتے ہیں، اور اس طور پر حوالہ کرتے ہیں کہ اس سرمایہ کے منافع میں تو وہ اپنے کو شریک رکھتے ہیں، لیکن نقصان کے تمام پہلوؤں سے اپنے آپ کو محفوظ کرلیتے ہیں۔ بلکہ جیسا کہ بیان کرچکا ہوں کہ ان کا سرمایہ بھی جوں کا توں اپنی تمام ذاتی وصفاتی خصوصیات کے ساتھ محفوظ رہتا ہے۔ اور جنھیں یہ سرمایہ حوالہ کیا جاتا ہے ان کو نفع ہو یا نقصان اس سے بالکل بے تعلق ہوکر اپنے مشروط منافع کو بھی قانون کے زور سے اتنے استوار اور مضبوط طریقہ سے اس طرح پر جکڑے رہتے ہیں کہ ان کے نفع کا ایک پیسہ بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ بلکہ سود درسود کی شکلوں میں تو صرف اصل سرمایہ کے منافع ہی نہیں بلکہ اس کے نفع کا بھی ہر دھیلا پیسہ اور ہر پیسہ روپیہ اور ہر روپیہ اشرفیاں مسلسل بغیر کسی انقطاع کے بنتا چلا جاتا ہے، جن کے حیرت انگیز ریاضیاتی نتائج پر دنیا نے اکثر سر دھنا ہے۔ سو سو روپے کے معاوضہ میں بذریعۂ سود درسود کے بعض اوقات لاکھ لاکھ روپے تک لوگوں نے وصول کئے ہیں۔ عدالتی رپورٹوں میں اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ ایک ہی ملک ایک ہی قوم، بلکہ ایک ہی شہر بس بلکہ بسا اوقات ایک ہی محلہ اور ایک ہی گھرانے کے چند افراد کے مصارف سے بچی ہوئی رقم کی حفاظت کا تو قانون اتنا زبردست انتظام کرتا ہے کہ صرف اصل رقم ہی نہیں بلکہ اس رقم کے منافع اور منافع کے منافع تک پر توپ و تفنگ کے بھروسہ پر اتنی کڑی نگرانی رکھی جائے، لیکن اسی ملک اسی قوم اسی شہر اسی محلہ میں اسی گھرانے کے جس آدمی نے اس رقم کو ضرورت میں لگایا یا شب و روز کی مسلسل محنتوں سے اس کے ذریعہ سے کچھ نفع حاصل کرنا چاہتا ہے، اس غریب کو یہی قانون اتنا لاوارث اور بے کسی کے حال میں چھوڑ دے کہ خواہ اس پر آسمان ٹوٹے، پہاڑ گرے، کچھ بھی گذر جائے، لیکن اصل رقم کے ایک ایک پیسہ اور اس کے منافع درمنافع درمنافع کے

ایک ایک چھدام کا اسے ذمہ دار ٹھیرایا جاتا ہے کہ جہاں سے ہو جس طرح سے ہو اپنے مصارف سے جن لوگوں نے یہ زائد رقم پس انداز کی تھی ان تک دام دام پہنچا تا چلا جائے

دنیا کے قانون نے اگر اس ظالمانہ بے جا طرفداری کو جائز رکھا ہو تو ظالم کو اس دنیا میں ہر ظلم کے اختیار کرنے کا اقتدار حاصل ہے، لیکن اسلام سے اس یک طرفہ یک چشمی، اجنبہ داری کی توقع فضول ہے اس لیے اس نے اس راہ کو تو مسدود کر دیا، لیکن اسی کے ساتھ اپنے مصارف سے ملک کے جو باشندے کچھ سرمایہ پس انداز کر سکتے ہیں، ان کے لیے اگر محض اس راہ سے اپنے سرمایہ سے استفادہ کے طریقہ کو اس نے قانوناً جرم اور ظلم قرار دیا ہے تو کون کہتا ہے کہ پھر اس سرمایہ کے استعمال اور اس استعمال سے استفادہ کی کوئی دوسری صورت بھی باقی نہیں رہی۔ اسلامی معاشیات کے نظام نامہ کو پڑھیے اور دیکھیے، اس نے ایک نہیں بلکہ بیسوں راہیں اور کھول دی ہیں جن کے ذریعہ سے اس پس انداز سرمایہ کو آمدنی کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ شرکت ہی کے ایک باب کو فقہ میں اٹھا کر دیکھیے تو ایک نہیں، متعدد شکلیں مختلف حالات کے لحاظ سے فقہاء نے بتائی ہیں کہ ایک یا ایک سے زائد آدمیوں کے ساتھ شریک ہو کر اس سرمایہ کو مختلف کاروبار میں لگایا جا سکتا ہے، شرکتِ عنان[1]، شرکتِ مفاوضہ[2]، شرکتِ وجوہ[3]، شرکتِ تقبل[4]، ان کے سوا بھی اور شکلیں ہیں جن میں اپنی اپنی سہولتوں کا اندازہ کر کے آدمی اس پس انداز سرمایہ کو لگا سکتا ہے۔ شرکت ہی کی ایک شکل مضاربت یا قراض ہے، یعنی ملک کے بے سرمایہ افراد کو سرمایہ دار لوگ سرمایہ دے کر کاروبار کرائیں، اور باہم منافع کو تقسیم کر لیا کریں۔ سرمایہ دار کو سرمایہ کا، اور بے سرمایہ والے شریک کو محنت کا نفع ملے گا۔ چونکہ یہ فقہ کے مطول ابواب ہیں، اس لیے تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے لیکن قدرِ مشترک ان تمام معاملات میں وہی بات ہے کہ جب سرمایہ لگانے والے منافع میں شریک ہیں تو نقصان میں بھی ان کو شریک رہنا پڑے گا۔

اور چونکہ شرکت کا معاملہ بھی ایک سے زیادہ آدمی کرسکتے ہیں۔ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ کوئی بے سرمایہ آدمی ایک سے زائد سرمایہ داروں سے سرمایہ لے کر کاروبار کرسکتا ہے، جس کے قیود و شروط فقہ کی کتابوں میں تفصیلاً موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پیمانۂ کبیر کی پیداواروں کی بھی کافی گنجائش نکل آتی ہے، اس ذریعہ سے بڑے سے بڑا سرمایہ جمع کیا جاسکتا ہے اور بڑے سے بڑا کاروبار کا امکان ہے۔ اور مسلمانوں میں ہمیشہ سے برّی و بحری تجارتوں اور صنعتوں میں یہ معاملات کروڑہا کروڑ روپے کے سرمایہ سے جاری تھے جن کے متعلق تاریخ سے بڑا مواد فراہم کیا جاسکتا ہے۔ پس یہ کہنا کہ سود کے روک دینے سے ملک کے پس انداز سرمایہ سے استفادہ کی کوئی دوسری صورت باقی نہیں رہتی، یا پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے امکانات کا دروازہ مسدود ہو جاتا ہے، قطعاً غلط ہے۔

ماسوا اس کے ملک کی ایسی ضرورتیں جن کی تکمیل "پیدائش بر پیمانۂ کبیر" ہی کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے۔ اس کے متعلق اسلام نے خود حکومت کو بھی متوجہ کیا ہے کہ رعایا کی سہولت کے لیے اس قسم کے کاموں کو خود حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور بیت المال کی مدِ خراج و عشر وغیرہ سے ان کی بجاآوری کی جائے۔ مثلاً دریاؤں سے نہروں کا نکالنا، سڑکوں کا بنانا، پل باندھنا وغیرہ جس کا ذکر حکومت کی آمدنی کے سلسلہ میں آئے گا۔

بہرحال پس انداز سرمایہ سے جو مادّی نفع اٹھانا چاہتا ہے اس کے لیے تو اسلام میں مذکورۂ بالا صورتیں رکھی گئی ہیں۔ لیکن ایسے لوگ جن کے نزدیک نفع صرف وہی نہیں ہے جو مادّی شکل میں اسی زندگی میں آدمی کو مل جائے۔ بلکہ ان کی نگاہیں بلند ہیں، اور اس زندگی کے سوا زندگی کے دوسرے اطوار و ادوار میں جو نفع آدمی کو پہنچ سکتا ہے اسے بھی وہ نفع ہی سمجھتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت کی دوسری رعایا سے نہیں تو مسلمانوں کے ہر فرد سے تو یقیناً اسی کی توقع کرنی چاہیئے، ایسے لوگوں کے لیے پس انداز سرمایہ کے استعمال کی اسلام نے ایک اور صورت بھی نکالی ہے۔

یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اپنے اس سرمایہ کو خیرات کردیں اور لوگوں میں اس پس انداز سرمایہ کو بانٹ دیں، یہ تو خیر ایک عام شکل ہے، اور اس کے لیے کسی خاص مشورے کی کیا حاجت ہے، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے اقوال جو کبھی کبھی آپ نے ارشاد فرمائے ہیں کہ

یاتی احدکم بجمیع ما یملک فیقول ھذہ صدقۃ ثم یقعد یستکف الناس (ابوداؤد)	تم میں کا ایک آدمی وہ سب کچھ جس کا وہ مالک ہے، لیکر آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صدقہ ہے، اس کے بعد بیٹھ جاتا ہے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔

اس میں تو مصارف سے بچے ہوئے کل سرمایہ کے خیرات کردینے کی مخالفت فرمائی، اس بناء پر اسلام نے خیرات کرنے کے سوا ایک اور صورت ایسی نکالی ہے کہ مصارف سے بچا ہوا سرمایہ لوگوں کا محفوظ بھی رہ جائے، اور چاہیں تو باوجود اس کے اس سے زندگی کے دوسرے مقامات و حالات میں نفع بھی اٹھا سکتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ لوگوں کا عام خیال یہی ہے کہ جس طرح خرید و فروخت، کرایہ، اجارہ وغیرہ، یہ سارے کاروبار دنیاوی معاملات ہیں، اور ان کا شمار خیرات و صدقات کے ذیل میں نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح سمجھا جاتا ہے کہ قرض کا لین دین بھی ایک خالص دنیاوی کاروبار ہے اور اس لیے قرض دینے والے کو جب کہا جاتا ہے کہ تم اس پر سود نہ لو، تو وہ بیچارہ پوچھتا ہے کہ آخر اس روپے پر مجھے نفع کیا ملا۔ جیسا کہ میں تفصیلاً عرض کر آیا ہوں کہ قرض کے کاروبار میں دینے والے کی طرف سے کسی قسم کی کوئی قربانی نہیں ہوتی، اتنی بھی نہیں جو ایک جھٹکہ (اِکّہ) ہکالنے والے کی طرف سے کرایہ پر چڑھنے والوں کی راہ میں ہوتی ہے کہ جتنی دیر بھی اس کا اِکّہ چلتا ہے اس عرصہ میں اس کے پہیئے نیز تمام پُرزوں کے صفات کی وہ حالت قطعاً باقی نہیں رہتی جو چلنے سے پیشتر تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر دنیا میں کبھی کوئی اِکّہ نہ پُرانا ہوتا اور

نہ خراب ہوتا، یقیناً مسلسل ان ہی مخفی فرسودگیوں کا چند سال کے بعد آخر میں یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اِکّے کی عمر ختم ہو جاتی ہے۔

مگر قرض کا روپیہ اگر دس سال بعد بھی واپس ہو تو اسی حال میں واپس ہوتا ہے جس حال میں دیا گیا تھا۔ اور روپیہ کی اس خصوصیت کو وہ لوگ بھی سمجھتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح جوازِ سود کے لیے اور اس کو ظلم کے دائرہ سے نکالنے کے لیے کوشاں ہیں۔ دماغوں پر بہت زیادہ زور دینے کے بعد ان لوگوں نے ایک مفہوم پیدا کیا ہے جس کی تعبیر یہ "انتظار کشی" کے لفظ سے کرتے ہیں، یعنی بغیر موجودہ خواہشوں کے ملتوی کئے، زمانۂ آیندہ کے لیے کوئی اپنی آمدنی سے پس انداز نہیں کر سکتا ہے۔ اب اگر آیندہ زمانہ میں بھی اس غریب کو کچھ نفع اس پس انداز والی رقم سے نہ ملا تو اتنے دن تک جو اپنی خواہش کے سینہ پر اس نے پتھر رکھا، اور انتظار کرتا رہا اس کا صلہ اس کو کیا ملا، گویا التوائے خواہش اور آیندہ کے توقعات کے انتظار کی جو زحمت اس کو ہوئی، یہی سود کی قیمت ہے۔ مادّی منافع کی لُوٹ میں عمریں بسر کرنے والوں کی طرف سے سود کی یہ سراسر غیر مادّی اور جذباتی مبہم، مجہول قیمت پیش کرنی خود ان کے دعوٰی کی انتہائی کمزوری کی دلیل ہے۔ لیکن اگر واقعی انتظار کشی کوئی چیز ہے اور اسی کی قیمت قرض دینے والا سود کی شکل میں چاہتا ہے تو اسلام نے اس قیمت کی پابجائی کا یہ نظم کیا کہ قرض جو اب تک ایک خالص دنیوی اور مادّی کاروبار سمجھا جاتا تھا، دنیوی معاملات سے اس کو نکال کر قرآن نے نیکی اور تبرع، خیر و خیرات کی طویل فہرست کی کوئی معمولی چیز نہیں۔ بلکہ اہم ترین جزء کی حیثیت سے شریک کر دیا۔ شاید آسمانی کتابوں میں قرآن ہی ایک ایسی دینی کتاب ہے جو

من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً — وہ کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے۔

کی آواز سے گونج رہی ہے، معاوضہ سے رقم بچانے والوں کے سامنے قرض خواہوں کو ہٹا کر خود حق تعالیٰ جل مجدہٗ نے اپنے کو لا کر کھڑا کر دیا، اور اعلانِ عام کر دیا گیا کہ انتظار کشی کی

اُجرت طلب کرنے والوں کو اُجرت دینے کے لیے خود ان کا مالک

فیضاعفہ اضعافاً کثیراً　　اللہ تعالیٰ (اس انتظارکشی کے صلہ میں)

دونا دون منافع اسے عطا فرمائے گا۔

کے وثیقہ کے ساتھ موجود ہے۔ قرآن نے خیرات کی یہ ایک نئی قسم نکالی کہ خیرات میں دی جانے والی رقم بالکلیہ محفوظ رہتے ہوئے بھی اس پر خیرات کے منافع کی توقع کی جاسکتی ہے اور توقع کیا جب قرضداروں کی طرف سے "دونا دون" منافع کا اعلان خود خدا کر رہا ہے تو اب اس سے زیادہ یقینی ربح اور نفع کی ضمانت اور کیا دی جاسکتی ہے۔ اسلام کی یہ ایک عجیب معاشی دقیقہ سنجی ہے کہ قرض کو اس نے صرف خیرات اور نیکی کی مد ہی میں شامل نہیں کیا ہے بلکہ قرآن کی مذکورۂ بالا آیت جس کا ذکر اس کتاب میں ایک سے زیادہ جگہ میں کیا گیا ہے، اس کے سوا حدیثوں میں اس کی تصریح بھی آتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

رایت لیلۃ اسری بی علی باب الجنۃ مکتوبا الصدقۃ بعشر امثالھا و القرض بثمانیۃ عشر

(ابن ماجہ)

جس رات میں مجھے معراج ہوئی میں نے جنت کے دروازہ پر یہ لکھا ہوا دیکھا کہ صدقہ کا بدلہ دس گنا، اور قرض کا اٹھارہ گنا ملے گا۔

اسی بنا پر بعض صحابہؓ فرمایا کرتے

لان اقرض دینارین ثم یرد ان ثم اقرضھما احب الی من التصدق بھما

(مغنی)

میں دو دینار قرض میں دوں، پھر مجھے واپس مل جائیں اور میں اسے پھر قرض میں دوں، یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ان دونوں کو خیرات کر دوں۔

صرف یہی نہیں کہ قرض کو صدقہ سے افضل قرار دیا گیا ہے، بلکہ اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ خیرات میں جو ایک پہلو اس کا تھا جس کا سوال کے ذیل میں ذکر گذر چکا ہے یعنے خیرات لینے اور بھیک پر زندگی گذارنے کی اسلام نے مذمت کی ہے لیکن قرض کو باوجود خیرات کی مد میں شمار کرنے کے خیرات کے اس مکروہ پہلو سے اس کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے اور اس طور پر مستثنیٰ کیا گیا ہے کہ صرف زبان سے نہیں بلکہ کائنات کی افضل ترین ہستی جس نے خود اپنے لئے اور قیامت تک آنے والی اپنی نسل کے لیے صدقہ کو حرام فرما دیا ہے اسی ذاتِ مبارک نے خود عمل کر کے اس میں بے عزتی یا کراہت کا جو اندیشہ تھا اس کو مٹا دیا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔

لیس القرض بسیئة وذلک لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یستقرض .... ولو کان مکروھا کان ابعد الناس منه (مغنی صفحہ ۳۵۳)	قرض لینا یہ بھیک مانگنا نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود قرض لیا کرتے تھے، اگر قرض لینا مکروہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سب سے زیادہ اس سے دُور رہتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ مصارف سے بچا کر ملک میں جن لوگوں کے پاس پس انداز سرمایہ ہے اگر وہ اس سے مادّی نفع اُٹھانا چاہتے ہیں تو نفع کے ساتھ نقصان میں بھی اپنے کو شریک کر کے وہ ایسا کر سکتے ہیں، اور اسلام میں اس کی متعدد راہیں کھُلی ہوئی ہیں۔ اور اگر نقصان میں شریک ہونے سے ڈرتے ہیں تو ان کے سرمایہ کو محفوظ کر کے انتظارکشی کے صلہ میں اسلام نے بجائے مادّی نفع کے خیراتی منافع کے کمانے کا وسیع میدان فراہم کر دیا ہے۔ قومیت اور وطنیت کے نشہ میں سرشاری کا ادعا رکھتے ہوئے جو یہ کہتے ہیں کہ اپنی انتظارکشی کا صلہ غیر مادّی منافع کی صورت میں لینے پر کتنے آدمی تیار

ہو سکتے ہیں، بالکل عجیب ہے۔ آخر جو رقم ضروریات سے بچ گئی ہے ظاہر ہے کہ یہ خود دلیل ہے کہ تمھاری ضرورت سے زیادہ تھی، ورنہ بچی کیسے۔ اپنی خواہشوں کو ملتوی کر کے پس انداز کرنا اولاً یہ ہمیشہ ضروری نہیں۔ دنیا میں ایسے دولت مندوں کی کمی نہیں ہے جن کے پاس ہر قسم کی خواہشوں کی تکمیل کے بعد بھی لاکھوں اور کروروں کی رقم آمدنی سے پس انداز ہو جاتی ہے، ماسوا اس کے اگر خواہشوں کو ملتوی کر کے جو پس انداز کرتے ہیں تو عموماً یہ (سِنے سے سری) ضروری خواہش قطعاً نہیں ہوتیں بلکہ (تعیشات) کی خواہشوں تک یہ التوا محدود ہو سکتا ہے، اور یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے۔ بہر حال کسی وجہ سے بھی ہو، اگر کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ رقم بچ گئی ہو تو اس میں اس کا کیا بگڑتا ہے کہ اپنے ملک اور اپنی قوم کے ضرورت مندوں کو دے کر یا بے کاروں کو کاروبار میں لگا کر اپنی رقم جوں کی توں واپس بھی لے لے اور اس حسنِ سلوک کا خدا کے یہاں سے صلہ کی امید اس دنیا میں یا آیندہ زندگی میں کرے آخر سوال ہوتا ہے کہ قرض نہیں بلکہ مطلق خیرات اور چیریٹی میں جو لوگ آج بھی اور ہر زمانہ، ہر ملک میں لاکھوں کروروں کی رقم دے ڈالتے ہیں، ان کا تو سرمایہ اور سرمایہ کے منافع ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کے ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں، آخر وہ کس بات کی توقع پر ایسا کرتے ہیں، لیکن جب ان ہی لوگوں کو بجائے خیرات کے سو دو سو روپے غیر سودی قرض میں دینے کے لیے کہا جاتا ہے تو پوچھتے ہیں کہ میرا کیا نفع ہوگا۔ خیرات جس میں نفع ہی نہیں، سرمایہ بھی چلا گیا۔ اس میں تو سوال نفع کا نہیں پیدا ہوتا، لیکن غیر سودی قرض میں اس سوال کو اٹھانا اس متناقض ذہنیت کا آخر کیا جواب ہو سکتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ محض ایک رواجی بات ہے۔ خیرات میں روپے لینے دینے کا چونکہ رواج ہے اس لیے لاکھوں اور کروروں کے دینے سے بھی لوگ دریغ نہیں کرتے لیکن غیر سودی قرض کے لین دین کا خیرات سمجھ کر چونکہ عام طور سے رواج

نہیں ہے اس لیے دس بیس پر بھی لوگ مادّی نفع تلاش کرنے لگتے ہیں خصوصاً جن ممالک میں (نیشن نیلٹی) اور قومیت و وطنیت کا صور پھونکا جاتا ہے ان کے مُنہ پر تو یہ سوال کسی طرح نہیں پھبتا۔

الحاصل اسلامی معاشیات سے سودی کاروبار کو خارج کر دینے کے بعد ملک کے پس انداز سرمایہ کے استعمال اور دنیوی و دینی منافع کے حاصل کرنے کی راہیں بے روک ٹوک کھلی ہوئی ہیں، اور جس طرح لین دین کے سلسلۂ سود اور سود کی مختلف چھوٹی بڑی شکلوں کو روک کر اسلام نے ملک کی اکثریت کو سرمایہ داروں کے ظلم سے نجات عطا کی ہے۔

اسی طرح لین دین کے دوسرے ابواب میں بھی جہاں معاشی مظالم نظر آئے ان کے سد باب کی بھی اس نے کوشش کی ہے ظلم و فریب، دھوکہ جھگڑے رگڑے کا انسداد اس نے صرف کلی قوانین ہی کے ذریعہ سے نہیں کیا ہے بلکہ بعض اہم جزئی شکلوں کو بھی قانون کی بندش میں لاکر ان کی جڑ کاٹ دی ہے۔ میرا مضمون اتنا کافی طویل ہوتا جارہا ہے کہ اب سب کا تفصیلی ذکر ناممکن ہے، اس لیے مختصر اشارے کرتا ہوا اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں۔

حکومت اور قیمتیں

"معاشیات" کا مشہور مسئلہ ہے کہ قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ کی بنیاد طلب و رسد کی باہمی مناسبتوں پر مبنی ہے۔ طلب اور رسد میں ایک نسبت تو وہ پیدا ہوتی ہے جس میں بجائے قدرتی ذرائع کے بعض لوگوں کے اختیار کو دخل ہوتا ہے، مثلاً حکومتیں درآمد اور برآمد پر ڈیوٹی لگا کر قیمت کے معیار کو گھٹاتی اور بڑھاتی رہتی ہیں، اور دوسری صورت وہ ہوتی ہے جس میں قدرتی عوامل زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور عمل سے معلوم ہوتا ہے آپ اس کو ناپسند کرتے تھے کہ قیمت کے مسئلہ کو اختیاری تصرفات سے متاثر کیا جائے۔ آپ سے ایک دفعہ درخواست کی گئی کہ

چیزوں کا بھاؤ حکومت کی جانب سے مقرر فرما دیا جائے لیکن جواب میں ارشاد ہوا۔

ان اللہ ھو المسعر ھو القابض	بھاؤ کا مقرر کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے،
الباسط الرزاق انی لارجوان	وہی تنگی پیدا کرتا ہے اور وہی کشادگی
القی اللہ تعالیٰ ولیس احد	وہی روزی پہنچانے والا ہے، میں
یطلبنی بمظلمۃ فی دم ولا مال	امیدوار ہوں کہ حق تعالیٰ سے ملوں،
(ترمذی)	اور مجھ سے کسی کا مطالبہ خون اور مال کے مظالم کا نہ ہو۔

جس سے معلوم ہوا کہ قیمت کے مسئلہ میں حکومت کی دراندازیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم قرار دیا۔ خواہ یہ ظلم پبلک پر ہو یا تاجروں پر۔ اور حکومتوں کا پنجہ تو آہنی پنجہ ہوتا ہے، اس لیے ان کی زبردستیوں کے نتائج تو بہت سنگین ہوتے ہیں، لیکن ملک کے عام باشندوں تک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ "بازار" کے مسئلہ کو اور قیمت کے معیار کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ عرب میں دستور تھا کہ مال لے کر جو قافلہ اونٹوں کا کسی بازار کی طرف آتا تو چند لوگ جو پہلے سے اس کی ٹوہ میں رہتے، خبر پاتے ہی سو دو سو میل آگے نکل کر مال پر قبضہ کر لیتے اور تاجروں سے کچھ بات طے کر لیتے، یا جیسے اس زمانہ میں کسی بازار کی "سول ایجنسی" کوئی لے لیتا ہے، یہ شکل اختیار کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمان کر دیا کہ

لا تلقوا الرکبان ولا بیع حاضر لباد	شتر سواروں کے قافلہ کو آگے نکل کر کوئی ان سے نہ ملا کرے اور باہر کے تاجر سے بازار کا کوئی آدمی بیع کا معاملہ نہ کرے۔

پھر اس فرمان کی غرض بھی بیان کر دی گئی

دعوا الناس یرزق اللہ	لوگوں کو چھوڑ دو، یوں ہی اللہ تعالیٰ

بعضهم ببعض — بعض کو بعض سے روزی پہنچاتا ہے۔

منشائے مبارک ان تمام ہدایتوں سے یہی تھا کہ تجارتی کاروبار میں لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور اس میں دخل اندازی کر کے خواہ مخواہ قیمتوں کے مسئلہ کو قبل از وقت ہاتھ میں نہ لیا جائے۔ یہاں تک اصرار تھا کہ جیسا کہ بخاری کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

نهى ان تتلقى السلع حتى يهبط بها الاسواق — تجارتی سامان پر آگے بڑھ کر قبضہ کرنے سے حضورؐ نے منع فرمایا تا آنکہ مال منڈی میں گر نہ جائے۔

کہاں یہ حکم کہ منڈی میں گرنے سے پہلے کوئی تجارتی مال کے متعلق کسی قسم کی کارروائی نہ کرے کہ بازار میں گرنے کے بعد طلب اور رسد کا قدرتی تناسب واضح ہو سکتا ہے، کہاں یہ حال ہے کہ موجودہ زمانہ کی حکومتیں درآمد اور برآمد دونوں پر من مانے طور پر جس قسم کے تصرفات چاہتے ہیں کرتے ہیں اور غریب پبلک کچھ نہیں بول سکتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جو چیزیں بغیر ان قیود کے محض تجارتی اصول پر جس قیمت پر بکتیں، اس سے سو سو گنا قیمت لوگوں کو ادا کرنی پڑتی ہے اور صبر کئے غیظ و غصہ کے ساتھ لوگ ادا کرتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں "احتکار" کا مسئلہ بھی ہے، یعنے غلّہ وغیرہ کو اس لیے روک لینا تاکہ جب اکثر تاجروں کا مال ختم ہو جائے گا، اور صرف میرے پاس یا متعدد چند آدمیوں کے پاس رہ جائے گا تو من مانگے داموں پر بیچیں گے۔

"احتکار" کے متعلق متعدد حدیثیں پائی جاتی ہیں جن میں اس کی ممانعت کی گئی ہے۔ مثلاً

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يحتكر الطعام (صحاح) — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے کہ غلّہ کا کوئی احتکار کرے۔

فقہائے اسلام نے عموماً اس حکم کو صرف غذائی مواد تک محدود رکھا ہے، اگرچہ بعضوں نے اور چیزوں کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔ نیز مختلف دوسرے قرائن اور روایات سے ہر حال میں اس فعل کو ممنوع نہیں قرار دیا گیا ہے، لیکن اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ فروشندہ کا کسی چیز پر اس طرح قبضہ کر لینا کہ گاہکوں کو "مقابلہ" کی وجہ سے جو فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ نہ پہنچے، اسلام اس کو کچھ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے بد نیت لوگوں کے متعلق ایسی پیشگوئیاں فرمائی ہیں کہ شائد دنیا میں بھی ان کو اس عمل کی پاداش بھگتنی پڑے گی۔ کہتے ہیں حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو احتکار سے منع کیا، لیکن نہ مانا، حضرت عمرؓ نے کہہ دیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے آدمی کے متعلق جذام اور افلاس کا خطرہ ظاہر فرمایا ہے۔

راوی کا بیان ہے کہ اس احتکار کرنے والے کو

رأیناہ مجذوماً (مغنی) میں نے دیکھا کہ وہ کوڑی ہو گیا ہے۔

تجارتی مسلک

ان چند جزئیات کے نقل کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ تجارت کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر معلوم ہو، اور اس کا اندازہ صرف

دعوا الناس یرزق اللہ بعضھم بہ بعض — لوگوں کو چھوڑ دو تاکہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں سے بعض کو روزی پہنچاتا ہے۔

سے ہو سکتا ہے کہ اسلام آزاد تجارت کا حامی ہے، جس کا جہاں جی چاہے ایک ملک سے دوسرے ملک میں، ایک شہر سے دوسرے شہر میں، دیہات سے شہروں میں، شہروں سے دیہاتوں میں مال لائے لیجائے، نہ باشندوں کو اس میں خلل اندازی کر کے "بھاؤ" کے طبعی معیار پست و بلند کرنا چاہیئے اور نہ حکومت کو اس باب میں خواہ مخواہ دخل دے کر رعایا پر زندگی تنگ کرنی چاہیئے۔

باقی درآمد و برآمد پر جو کرور گیری (چنگی) کی جاتی ہے، اگرچہ اس زمانہ میں اس کو ملک کے "معاشی حالات کے توازن" کا ذریعہ بنایا گیا ہے اور اس ذریعہ سے قوی ممالک ضعیف ممالک پر ظلم کر رہے ہیں، اسلام کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ کرور گیری کا محصول اموالِ تجارت میں اسلام میں بھی لیا جاتا ہے لیکن وہ حکومت کا ایک ٹیکس ہے، یعنی مسلمانوں سے تو زکوٰۃ لی جاتی ہے اور اسی مصرف میں صرف ہوتی ہے جس مصرف کے لیے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ یوں ہی اسلامی حکومت کی دوسری رعایا بھی اس کو بطور محصول ہی ادا کرتی ہے، اور اس لیے ادا کرتی ہے تاکہ جان و مال کی حفاظت کے مصارف کی پا بجائی ہو، اور ان تمام مسائل کی تفصیل حکومت کی آمدنی کے باب میں آئے گی۔ البتہ غیر ممالک کے تاجروں سے جو کرور گیری لی جاتی ہے، اس کی بنیاد بھی دوسری ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ جس ملک کے لوگ اسلامی حکومت کی رعایا کے اموالِ تجارت پر کوئی محصول نہ لیں گے ان سے اسلامی حکومت بھی کچھ نہ لے گی۔ ہدایہ میں ہے

ان کانوا لا یاخذون اصلا لا ناخذ	اگر غیر اسلامی حکومتیں ہماری حکومت کے باشندوں سے بالکل نہ لیں گے تو ہم بھی ان سے کچھ نہ لیں گے۔

لیکن اگر وہ ہمارے یہاں کے لوگوں کے مال پر محصول لیتے ہیں تو اس وقت ہم بھی ان سے اسی قدر لیں گے جتنا ہمارے یہاں کے لوگوں سے وہ لیتے ہیں۔ پھر کوئی ظالم حکومت اگر مسلمانوں کا سب مال لے لیا کرتی ہے، تو ہمیں حکم دیا گیا ہے

ان کانوا یاخذون الکل لا ناخذ الکل	اگر وہ سارا مال مسلمانوں کا لے لیتے ہوں تو ہم ان کے یہاں کے تاجروں سے سب مال نہ لیں گے۔

صاحبِ ہدایہ نے اس کی وجہ لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ

نحن احق بمکارم الاخلاق اعلیٰ اخلاقی امور کی پابندی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ "کرورگیری" کا تعلق اسلام میں معاشیات سے نہیں بلکہ سیاسیات سے ہے۔ حتیٰ کہ دنیا کی حکومتیں اگر اسلامی حکومتوں کی رعایا سے کرورگیری کے نہ لینے کا معاہدہ کرلیں تو سب سے پہلے بین الاقوامی تجارت کو آزاد قرار دینے پر جو دستخط کریں گے وہ مسلمان ہوں گے۔ ٹھیک جو حال غلامی میں ہوا کہ دنیا کی قومیں مسلمانوں کو غلام بنارہی تھیں تو ہم بھی بناتے تھے پھر انھوں نے مل کر خواہش کی کہ آیندہ سے مسلمانوں کو غلام نہ بنایا جائے گا۔ خلیفۂ وقت نے شیخ الاسلام کے مشورہ سے وہی "نحن احق بمکارم الاخلاق" کہتے ہوئے اس مقدس معاہدہ پر دستخط کردیا، اور آج بھی عام تجارت کو آزاد کرانے پر اگر غیرمسلم حکومتیں رضامندی ظاہر کریں تو "ان کانوا لا یاخذون اصلا لا ناخذ" پر عمل کرنے کے لیے ہمارے پاس پُرانا دستور موجود ہے۔

خیر کرورگیری کے مسئلہ کا ذکر یہاں تو ضمنی طور پر آگیا، تجارتی کاروبار کے متعلق میں نے چند تفصیلی احکام کا تذکرہ اس لیے کیا تاکہ تجارت کی آزادی و عدم آزادی کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر سامنے آجائے۔

اور اب اس بحث کو میں اسی پر ختم کرتا ہوں ورنہ تجارت کے متعلق اور بھی چند قوانین ہیں، جن پر بحث کی حاجت تھی لیکن بخوفِ طوالت ان کو ترک کرتا ہوں۔ بہرحال سب میں وہی قرآنی حکم "لا تظلمون ولا تظلمون" کی روح کارفرما ہے۔ جب کوئی تفصیلی کتاب معاشیات پر لکھی جائے گی تو اس سے نفع اٹھایا جاسکتا ہے البتہ مصارف سے بچے ہوئے سرمایہ کے متعلق ایک پہلو کا ذکر باقی رہ گیا ہے۔

سرمایہ کا استعمال و حفاظت:۔ مقصد یہ ہے کہ اس سرمایہ کے استفادہ کی

جو دو شکلیں اسلام نے بتلائی ہیں، یعنی اگر اس سے کوئی شخص نفع اٹھانا چاہتا ہے تو خسارہ اور خطرہ کی ذمہ داریوں کو بھی قبول کر کے ایسا کر سکتا ہے اور اس کی بہت سی صورتیں ممکن ہیں۔ اور اگر خطرہ کی ذمہ داریوں کو قبول نہیں کر سکتا، تو شخصی نفع سے دست بردار ہو کر ملک کے ضرورت مندوں یا بے سرمایہ لوگوں کو قرض دے کر قومی فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس قومی نفع کے ساتھ بالآخر اسی زندگی یا دوسری زندگی میں شخصی منافع سے بھی وہ محروم نہ رہے گا، بلکہ خیرات وصدقات سے زیادہ قرض دینے میں شخصی نفع کی توقع کی جا سکتی ہے، جس کی تفصیل گذر چکی۔ اور صرف یہی نہیں، بلکہ اس قرض اور دین کی ادائگی کی ضمانت کے لیے اسلام نے جو ممکن صورتیں اس دنیا میں ہو سکتی ہیں اسے بھی اختیار کیا ہے۔ یعنے رہن یا رجسٹری جس ذریعہ سے چاہے اپنے "دین" کو آپ محفوظ کر سکتے ہیں۔ رہن کا ایک مفصل باب فقہ میں موجود ہے۔ اور رجسٹری کے اصولی قوانین مع قانونِ شہادت کے تو خود قرآن میں موجود ہیں۔ وہی بات کہ اسلام نے زندگی کے معاشیاتی تعلقات کو کتنی اہمیت دی ہے، اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خلافِ دستورِ قانون رجسٹری کے لیے قرآن میں ایک پوری رکوع سورۂ بقرہ کے آخر میں مختص کر دی گئی ہے تاکہ کسی کا دین ضائع ہونے کے ممکنہ خطرات سے محفوظ ہو جائے، اور آخر میں تو

ما تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ	اپنے جی کی جو بات ظاہر کرو گے یا جسے
یحاسبکم بہ اللہ	چھپاؤ گے، اللہ تعالیٰ اس کا حساب
	فرمائے گا۔

کے ذریعہ سے اس پر بھی تنبیہ کر دی گئی ہے کہ معاشیاتی ذمہ داریوں کی رتی رتی کا حساب ایک دن ہو کر رہے گا، اور جس نے جس کسی کو جو کچھ دیا ہے وہ قطعاً ضائع نہیں ہو سکتا، بلکہ مل کر رہے گا۔ مگر یہ سب سامان تو "پس ماندہ سرمایہ" کے استعمال و

حفاظت کا اس وقت تک کے لیے ہے جب تک آدمی زندہ ہے، لیکن اگر کوئی اپنے بعد بھی کچھ پس انداز چھوڑ کر مرنے والا ہے تو اس سرمایہ کے متعلق بھی تقریباً اسلام نے دو ہی صورتیں مقرر کی ہیں، یعنے اگر اپنے جانشینوں میں اس کی صلاحیت نہیں پاتا کہ اس کی بچائی ہوئی دولت سے نفع نہیں اٹھا سکتے، یا کم از کم اس کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تو "وقف" خصوصاً "وقف علی الاولاد" کا عجیب و غریب قانون نافذ کر کے اسلام نے اس کی حفاظت کی ایک محکم اور استوار صورت پیدا کر دی ہے۔ گویا جیسے قرض میں اصل سرمایہ کو محفوظ کر کے دوسروں کو نفع پہنچایا جا سکتا ہے۔ یہی حال وقف کے اس قانون کا ہے، کہ بچا ہوا پس ماندہ سرمایہ جوں کا توں محفوظ بھی رہ جاتا ہے اور جن جن لوگوں کو واقف نفع پہنچانا چاہتا ہے وہ بھی پہنچتا رہتا ہے۔ "وقف" کے متعلق لوگوں کو عجب مغالطہ ہوا کہ اسے وہ خیرات کی ایک قسم قرار دے کر متحیر ہوئے اور بڑے بڑے قانونیوں نے اظہارِ تعجب کیا کہ اولاد پر "وقف" کے کیا معنے؟ قطع نظر اس کے کہ اسلام کا عام قانون صدقہ کے باب میں

وابدء بمن تعول امک واباک اختک واخاک ادناک فادناک	جس کا بار تم پر ہو پہلے ان میں سے شروع کرو، یعنی ماں باپ کو، بہن کو بھائی کو پھر رشتہ میں جو زیادہ قریب ہوتا جائے۔

کا ہے اور خود "صدقہ" کے مفہوم کو تو اس نے اتنا عام کیا ہے کہ بیوی کے ساتھ ہم بستری کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ قرار دیا۔ ماسوا اس کے "وقف" میں خیرات کے مفہوم سے زیادہ "پس ماندہ جائداد" کی حفاظت بھی مد نظر ہے۔ ابتدائے اسلام میں عموماً صحابہؓ نے بکثرت اپنی اولاد کے نام اوقاف کئے۔ علامہ مقدسی لکھتے ہیں

قال جابر لم یکن احد من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذو مقدرة الا وقف

قال الحمیدی تصدق ابو بکر بدارہ علی ولدہ وعمر بدارہ عند المروة علی ولدہ وعثمان وتصدق علی بارضہ بینبع وتصدق الزبیر بدارہ بمکة ودارہ بمصر وامواله بالمدینة علی ولدہ وتصدق سعد بدارہ بالمدینة ودارہ بمصر علی ولدہ وعمرو بن العاص بدارہ بالوھط ودارہ بمکة علی ولدہ وحکیم بن حزام بدارہ بمکة والمدینہ علی ولدہ کله الی الیوم (المغنی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کوئی مقدور والوں میں ایسا نہ تھا جس نے وقف نہ کیا ہو۔

حمیدی راوی ہیں کہ حضرت ابوبکر نے اپنی اولاد پر اپنے گھر کو وقف کیا، یوں ہی عمر نے بھی مروہ کے پاس جو گھر تھا اس کو اپنی اولاد پر وقف کیا، حضرت عثمان نے بھی یہی کیا، حضرت علی نے اپنی اس زمین کو جو ینبوع میں تھی وقف کیا، حضرت زبیر نے اپنے اس گھر کو جو مکہ میں تھا اور جو گھر مصر میں تھا اور مدینہ میں ان کا جو مال (بشکل باغ و زراعت تھا) اسے اپنی اولاد پر وقف کیا، حضرت سعد نے مدینے میں ان کا جو گھر تھا اور جو مصر میں تھا اپنی اولاد پر وقف کیا، عمرو بن عاص نے وہط کے گھر کو اور جو مکہ میں ان کا گھر تھا اپنی اولاد پر وقف کیا، یوں ہی حکیم بن حزام نے مکہ اور مدینہ کے گھروں کو اپنی اولاد پر وقف کیا اور یہ سارے اوقاف اس وقت تک موجود ہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "وقف" دراصل اس زمانہ میں اپنی پس ماندہ جائداد کی حفاظت کا ایک محفوظ طریقہ تھا اور اس قانون کی اصلی روح یہی تھی، اگرچہ اس قانون میں تبرع اور نیکی کا مفہوم بھی شریک تھا لیکن اس معنے میں جس معنے میں خود اپنے آپ کو اپنی بیوی کو کھانا کھلانا بھی اسلام میں صدقہ ہے۔ ہر ذو مقدرت صحابی کا اس پر عمل کرنا جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ کے قول سے معلوم ہوتا ہے اس سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی بلکہ پس ماندہ رہنے والی جائداد کے متعلق اسلام نے پہلے "وقف علی الاولاد" اور بعد کو وراثت کا قانون پیش کیا ہے، یعنے اگر جانشینوں سے جائداد کے برباد ہونے کا خطرہ ہے تو اس کو وقف کر کے محفوظ کر دینا چاہیئے اور اگر ان میں اس کی صلاحیت نظر آتی ہے کہ ان میں ہر ایک کو کچھ سرمایہ اگر دے دیا جائے گا، تو اس کے الٹ پھیر اور اس کو اصل بنا کر اپنی معاشی ترقیوں میں مدد حاصل کر سکتے ہیں، تو ایسی صورت میں وراثت کے قانون سے نفع اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے ورثہ جو اپنی زندگی کی مدت ختم کر کے موت کے انتظار میں ہوں مثلاً ماں باپ وغیرہ ان کو تومیت کے مال سے بقدر گذر اوقات دلا دیا جاتا ہے لیکن جن کے سامنے زندگی کے آیندہ عملی مراحل پیش آنے والے ہیں، مثلاً اولاد تو ان میں جس کو دوسرے سے بھی کچھ مدد مل سکتی ہے، یعنے لڑکیاں جو شوہر کی نوت بھی رکھتی ہیں ان کو لڑکے کے حساب سے نصف دلایا جاتا ہے اور لڑکوں کو عموماً چونکہ کسی دوسرے سے امداد کی توقع نہیں ہوتی بلکہ مزید بیوی کا بار اس پر پڑتا ہے، اس لیے اس کو بجائے نصف کے پورا دلایا گیا۔ اور یہ تو اس وقت ہے کہ آدمی اپنی تمام اولاد کو ایک حال میں چھوڑ کر مر رہا ہو، لیکن اگر بجائے اس کے یہ دیکھتا ہو کہ اس کا کوئی بیٹا یا بیٹی ایسے معذور اور بیمار یا کسی ایسی حالت میں ہیں کہ اگر ان کو صرف قانونی حصہ ملے گا تو کفایت نہ کرے گا، ایسی صورت میں اسلام اجازت دیتا ہے کہ اپنی کسی خاص اولاد کو میراثی

حصہ سے زیادہ اپنی زندگی میں ہبہ کر دے۔ امام احمد بن حنبل کا فتویٰ ہے کہ

لا باس اذا کان لحاجۃ و اکرھہ اذا کان علی سبیل الاثرۃ

اپنی اولاد میں سے کسی کو زیادہ حصہ ہبہ کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں اگر اس کی ضرورت ہو، مگر بغیر ضرورت یہ بات مجھے ناپسند اور میرے نزدیک مکروہ ہے، یعنے بلا وجہ ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دینی چاہیئے۔

مقدسی نے ان حاجات کی کچھ تفصیل بھی کی ہے

مثل اختصاصہ لحاجۃ او زمانۃ او عمی او کثرۃ عائلۃ او اشتغالہ بالعلم او نحو من الفضائل

مثلاً کسی بچّہ کو اس کی کسی ضرورت کی وجہ سے ترجیح دی جائے یا وہ کسی مزمن مرض میں بیمار ہو، یا اندھا ہو، یا اس کی اولاد زیادہ ہو، یا علم کے ساتھ مشغول ہو، یا اسی قسم کی کوئی فضیلت حاصل کر رہا ہو۔

اور اس سے ایک عام سوال کا جواب بھی سمجھا جا سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ وقف وہبہ وغیرہ کے ذریعہ سے جب کوئی اپنی جائداد کا نظم کئے بغیر مر جاتا ہے تو اسلام نے میراث کا قانون اسی قسم کی جائدادوں کی تقسیم کے لیے بنایا ہے، اور قانون ظاہر ہے کہ شخصی خصوصیات کو پیشِ نظر رکھ کر نہیں بنتا۔ عموماً کلیاتی اصول واضع قانون کے سامنے ہوتے ہیں۔ میراثی قانون کی بنیاد یہ رکھی گئی ہے کہ براہ راست قریب ترین رشتہ داروں کو ترجیح دی جائے گی اور اسی اصول کو پیشِ نظر رکھ کر عمل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے اور وراثت کے لیے صرف رشتہ داری کافی ہو تو غالباً ایک ایک مورث کے سینکڑوں وارث بلکہ شائد سارے بنی آدم وارث ہو جائیں، کیونکہ بالواسطہ رشتہ دارنو

تقریباً ہر آدمی کا دوسرا آدمی ہے کم از کم آدم میں تو سب ہی جا کر شریک ہو جاتے ہیں۔
مگر اس اصول پر کبھی براہ راست قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ مورث کا کوئی بالواسطہ
رشتہ دار ایسا بھی پایا جاتا ہے جو واقعہ کے اعتبار سے براہ راست رشتہ داروں سے
زیادہ قابل رحم اور محتاج امداد ہوتا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ کبھی بیٹوں کے ساتھ کوئی یتیم پوتا
کسی کا رہ جاتا ہے، میراثی قانون کے مذکورۂ بالا نقطۂ نظر کی وجہ سے ظاہر ہے کہ ایسی
صورت میں پوتا محروم ہو جاتا ہے، کیونکہ پوتا اپنے دادا کا براہ راست نہیں بلکہ اپنے باپ
کے واسطہ سے رشتہ دار ہے۔ حالانکہ کبھی کبھی پوتا بوجہ یتیم اور کمسن ہونے کے امداد کا
زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ ایسے مواقع جو کبھی کبھی پیش آجاتے ہیں، ان کی وجہ سے لوگوں کو میراث
کے قانون میں کچھ نقص نظر آتا ہے۔ حالانکہ یہ قانون کا نقص نہیں بلکہ قانون استعمال کرنے
والے کا عقلی نقص ہے۔ یہ تو دادا کا فرض ہے کہ جب وہ اپنے پوتے کو اس حال میں پاتا ہے
اور وہ جانتا ہے کہ براہ راست رشتہ دار نہ ہونے کی وجہ سے وہ میراثی قانون کے
تحت میں نہ آئے گا تو اس کو کس نے منع کیا ہے کہ قانونِ ہبہ اور عطیہ سے اس قابل رحم
پوتے کو نفع نہ پہنچائے خصوصاً جب خاص حالات میں ایک وارث کو دوسرے وارث پر
ہبہ اور عطیہ میں ترجیح دی جاسکتی ہے، اور مرنے کے بعد کسی وارث کو یہ حق نہیں
ہے کہ اس عطیہ کو اس سے واپس لے لے۔ مقدسی لکھتے ہیں کہ

اذا فاضل بین ولدہ فی العطایا	اگر عطیہ اور ہبہ میں کوئی اپنی اولاد
او خص بعضهم بعطیة ثم مات	میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دے اور
قبل ان یسترده ثبت ذلک	اور بعضوں کو کسی خاص عطیہ کے ساتھ
للموهوب له ولزم ولیس	مختص کرے، اور دینے والا اس عطیہ کو
لبقیة الورثة الرجوع	واپس کر لینے سے پہلے مر جائے تو جسے
	یہ چیز ہبہ کی گئی ہے اس کی ملک ثابت

ہو جائے گی اور اس کا حق واجب ہو جائیگا۔
باقی وارثوں کو اس کا حق نہیں ہے کہ
اس عطیہ کے متعلق اس پر دعویٰ کریں۔

اس مسئلہ کو تفصیل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

به قال مالک والشافعی و اصحاب الرامی واکثراھل العلم

امام مالک امام شافعی اور اصحاب رائے (حنیفیہ) اور اکثر اہل علم کی یہی رائے ہے۔

اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آیت قرآن

فی اموالھم حق للسائل والمحروم

ان کے مال میں مانگنے والوں اور جو (قانونی حقوق) سے محروم ہیں ان کا بھی حق ہے۔

میں "المحروم" کے تحت اس قسم کے محروموں کا حق قرآن نے سرمایہ داروں کے اموال میں اگر نہیں قائم کیا ہے تو پھر یہ اور کن کے حقوق ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے اگرچہ اپنے یا اپنے بال بچوں، اپنی آیندہ نسلوں کی رزاقیت کے سررشتہ کو تو اپنے ہاتھ میں لینے کا حکم نہیں دیا ہے، اور "الرزاق ذوالقوۃ المتین" ہی کو اس کا متکفل قرار دیا ہے، اسی بنا پر صرف ان ہی لوگوں کو نہیں جو مالتھس وغیرہ وسواسیوں کی طرح نسل انسانی اور زمین کی غذائی پیداواروں میں عدم توازن کا خطرہ محسوس کر کے خود بھی ڈرے اور دوسروں کو ڈراتے رہتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو بھی اس نے ڈانٹا ہے جنھیں اولاد کی کثرت میں معاشی تنگ حالی کا خطرہ محسوس ہو حتیٰ کہ ان میں بعضوں نے تو اتنی تنگ دلی اختیار کی کہ پیدا کرنے کے بعد اپنے ہاتھوں اپنی اولاد کی گردن تک مروڑنے پر آمادہ ہو گئے اور ایسا فعل جو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ضرورت ہوئی کہ اس کے

متعلق قرآن میں

لا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق — اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو تنگ معاشی کے خوف سے۔

کا حکم دیا جائے۔ اور یہ تو کہا جاتا ہے کہ "ایام جاہلیت" کی قساوات تھی، لیکن آج بجنسہ ان ہی معاشی مشکلات کے بھوت کو سامنے کھڑا کر کے نسلِ انسانی کے ہمدردوں کا ایک گروہ (برتھ کنٹرول) (ضبطِ حمل) کے ذریعہ سے پیدا ہونے سے پیشتر انسانی نسل کو تباہ کر دینے کا جو وعظ سنا رہا ہے "کیا جاہلیت" کی اس سنگدلی سے "عالمیت" کی یہ رحم دلی کچھ کم ہے۔ وہی برتھ کنٹرول کا وعظ کہنے والا اگر خدانخواستہ برتھ کنٹرول کی لپیٹ میں آجاتا تو آج اسٹیجوں پر چہک چہک کر یہ باتیں کیا کر سکتا تھا؟۔ بہرحال "اسلام" نے "رزاقیت" کی فکر میں شہر کے ناضیوں کو کھلنے سے تو بے نیاز کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی بعض معاشیوں نے العزل (صحبت کا ایسا طریقہ جس سے حمل قرار نہ پائے) کی راہ سے جب برتھ کنٹرول کے متعلق منشائے مبارک دریافت کیا تو ارشاد ہوا کہ یہ (وادخفی) ہے، یعنی اولاد کو زندہ مار ڈالنے کی یہ ایک مخفی تدبیر ہے، اور اس کی واقعیت میں کون شبہہ کر سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت بھی نہیں دی ہے کہ خواہ مخواہ اپنی آمدنی کو کوئی اس بے ترتیبی سے اڑائے یا خرچ کرے کہ نتیجۃً اس کی اولاد دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو مشہور واقعہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حدیثوں میں آتا ہے کہ اپنی ایک سخت بیماری میں ان کو زندگی سے جب مایوسی ہوگئی تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کے لیے تشریف لائے تو سعد نے کہا کہ میری وارث صرف میری ایک لڑکی ہے کیا مناسب نہ ہوگا کہ میں اپنے مال کا دو تہائی حصہ خیرات کر دوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں" سعد نے کہا تو آدھا؟ پھر جواب ملا "نہیں" سعد نے کہا تو ایک تہائی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تہائی"

بہت ہے۔ اس کے بعد آپ کے الفاظ یہ تھے

انک ان تذر ورثتک اغنیاءً	تم اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ کر جاؤ یہ
خیر من ان تذعھم عالۃ	اس سے بہتر ہے کہ انھیں ایسے افلاس کی
یکففو الناس	حالت میں چھوڑو کہ لوگوں کے سامنے
(صحاح)	ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اپنی ذات ہی کے لیے نہیں بلکہ اپنی اولاد کے لیے بھی اگر کسی کو پس انداز کرنے کا موقعہ ہے تو اسلام اس موقعہ سے نفع اُٹھانے کا حکم دیتا ہے۔ پھر پس ماندوں کی حالت اگر وقف کی مقتضی ہو تو منافع کو ان تک پہنچا کر اصل کو محفوظ کر دیا جائے۔ یا اولاد میں سے کوئی لڑکا یا لڑکی زیادہ ضرورت مند ہو یا کوئی رشتہ دار قابلِ امداد ہونے کے باوجود میراثی حصہ سے محروم ہوتا ہوا نظر آرہا ہو ان کو ہبہ کے ذریعہ سے کچھ دیدیا جاسکتا ہے اور باقی کو ارثی قانون سے تقسیم ہونے کے لیے چھوڑ دیا جائے تاکہ ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ سرمایہ پہنچ جائے جس کے ذریعہ سے اگر کافی ہو وہ زندگی گذاریں، ناکافی ہو تو اس کو اصل بنا کر آمدنی پیدا کریں۔

مضمون گویا زندگی سے شروع ہو کر ایک حد تک موت اور موت کے بعد تک پہنچ چکا ہے۔ اختصار کی کوشش کے باوجود بات پھیلتی جارہی ہے اور ابھی چند اہم نقاط اور مصارف و خرچ کا مستقل باب باقی ہے۔

محنت و مزدوری

باہمی لین دین کے سلسلہ کی ایک بڑی اہم چیز اجارہ ہے، اُردو میں تو اجارہ)

ٹھیکہ اور گتہ کے معاملہ کو کہتے ہیں، لیکن فقہاء کی اصطلاح میں نوکری، مزدوری، کاریگری، کرایہ داری مکان کی ہو، یا زمین کی، سب اجارہ کا معاملہ ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ خود چیز دے کر معاوضہ لینا نہیں جیسا کہ تجارت میں ہوتا ہے بلکہ چیز سے استفادہ کا حق دے کر اس کے معاوضہ میں کچھ لینا یہی اجارہ کا معاملہ ہے۔ پھر اگر مکان، گاڑی، گھوڑا وغیرہ کے متعلق یہ معاملہ کیا جائے تو کرایہ کا معاملہ ہوا۔ اور اگر بجائے اپنی کسی چیز کے خود آدمی اپنی خدمت اور محنت کا معاوضہ حاصل کرے تو اس کی بھی دو صورت ہے مستاجر کی ماتحتی میں اگر کام نہ کرے بلکہ اپنے گھر میں مثلاً کام کرتا ہو، تو یہ کاریگری ہے۔ اور اگر مستاجر کی ماتحتی میں کرتا ہے تو اس کی بعض شکلوں کو نوکری، بعضوں کو مزدوری کہتے ہیں۔ فقہائے اسلام نے ہر ایک کے متعلق اپنی کتابوں میں مفصل قوانین بنائے ہیں۔ اس زمانہ میں ربوا (سود) کی وجہ سے سرمایہ کے ملنے میں جو آسانیاں ہوئیں تو عموماً کاریگروں کو لوگوں نے نوکر اور مزدور رکھ کر ان کی اجتماعی محنت سے نفع حاصل کرنا شروع کیا۔ اس طریقہ سے پیداوار نو اجتماعی شکل میں ہونے لگی، یعنے ایک ایک کارخانہ میں دس دس ہزار مزدور کام کرنے لگے، اور سرمایہ چونکہ ایک ہی یا چند محدود اشخاص کا ہوتا ہے اس لیے آمدنی شخص یا چند محدود اشخاص کو ملتی رہی۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں کا سوال اسی شکل نے پیدا کر دیا۔ سرمایہ داروں کو ظاہر ہے بوجہ محدود افراد ہونے کے لاکھوں اور کروروں کی شکل میں نفع ملتا رہا، اور مزدور جن کی اجتماعی محنت کا یہ ثمرہ ہے ان کو صرف مزدوری ملتی رہی۔ لیکن چونکہ انفرادی طور پر کام کرنے سے اتنا نفع بھی ان کو نہیں ملتا تھا، اس لیے تدریجاً کارخانوں میں کام کرنے کو انھوں نے اپنے لیے زیادہ منفعت بخش پایا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر مزدور نہ ان مشینوں کو خرید سکتے ہیں اور نہ خام مواد کا اتنا ذخیرہ فراہم کر سکتے ہیں جو

سرمایہ دار خود یا اپنی ساکھ پر بنکوں سے سود پر قرض لیکر مہیا کر سکتے ہیں۔ کارخانہ داروں نے چونکہ اس کا اندازہ کر لیا کہ انفرادی مزدوری سے زیادہ اگر مزدوروں کو کارخانہ میں مزدوری دے دی جائے گی تو سود کے حساب سے نقصان کیا نفع اور کافی نفع ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ شکل میں بھی اگر غور کیا جائے تو مشکلات کی بڑی وجہ یہی سودی اور بنکنگ کا کاروبار ہے۔

اسلام نے اس کا کیا حل پیش کیا ہے، ایک مستقل مسئلہ ہے، اور اس مختصر مقالہ میں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ ہم چند کلیات اجارہ کے متعلق ذیل میں درج کرتے ہیں، اور علمائے معاشیات کو توجہ دلاتے ہیں کہ سرمایہ و محنت کی جو گتھی کسی جتن سے آج تک سلجھتی نظر نہیں آرہی ہے، انسانی زندگی کے پہلوؤں کے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیمات میں ان کو پیچیدگیوں کا کوئی حل کیا مل سکتا ہے۔ یا کم از کم ان کو اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آج جو باتیں نئی خیال کی جاتی ہیں واقع میں وہ کتنی پرانی ہیں۔ بہر حال بخاری شریف کی ایک حدیث ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اخوانکم خولکم جعلکم اللہ	خول (یعنے تمہارے ہاتھ کے نیچے کام
تحت ایدیکم فمن کان اخوہ	کرنے والے) تمہارے بھائی ہیں حق تعالیٰ نے
تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل و	ان کو تمہارے ہاتھ کے نیچے ڈال دیا ہے،
لیلبسہ مما یلبس و لا تکلفوھم	پھر جس کا بھائی کسی کے ہاتھ کے نیچے
ما یغلبھم فان کلفتموھم	پڑ جائے تو چاہیئے کہ جو کچھ خود کھاتا ہو،
فاعینوھم	اسے کھلائے اور جو خود پہنتا ہو، اسے
	پہنائے اور ان پر اتنا کام نہ لادو جو
	ان کو مغلوب کر دے اور اگر اتنا بار

ڈالو تو پھر ان کی مدد و اعانت کرو۔

اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) مزدور اور جو مزدوری پر لوگوں سے کام لیتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء ہے کہ ان کو وہ اپنا بھائی خیال کریں، اور دونوں میں تعلقات کی نوعیت ایسی ہو جیسے کہ بھائی بھائی میں ہوتی ہے۔

(۲) کم از کم کھانے پہننے رہنے سہنے کی حد تک دونوں کی معاشی سطح برابر ہو، جو خود کھائے وہ مزدور کو کھلائے، اور جو خود پہنے وہ مزدور کو پہنائے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُجرت کے معاملہ میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ یعنے کم از کم اتنی اُجرت تو بہر حال ہر مزدور کو ملنی چاہیئے کہ کھانے اور پہننے کی حد تک وہ اپنے مالک کے برابر ہو جائے۔ مزدوری کی شرح اگر آج اتنی بھی بلند کردی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ شورش میں بہت حد تک کمی کی توقع ہوسکتی ہے۔

(۳) وقت اور کام دونوں کے حساب سے مزدوروں پر اتنا بوجھ نہ لادا جائے جو ان کو مغلوب کر کے تھکا دے۔ "لا تکلفوھم ما یغلبھم" یہ ایسا فقرہ ہے جس سے موجودہ زمانہ میں وقت اور کام کی نوعیت کے مسئلہ کو طے کیا جاسکتا ہے۔

(۴) اور اگر کوئی کام ایسا پیش آجائے جس کی انجام دہی میں مزدوروں کو دشواری پیش آرہی ہو تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اس کام کو نہ کرایا جائے، اور نہ یہ مطلب ہے کہ خواہ مزدور پر کچھ ہی گذر جائے لیکن بہر حال اس سے وہ کام لیا ہی جائے۔ بلکہ ایسی صورت میں یہ کام کرنا چاہیئے کہ مزدور کی اعانت مزید قوت سے کی جائے "فاعینوھم" کا یہی مطلب نہیں ہے کہ خود اس کام میں لگ جائے، بلکہ یہ بھی ہے کہ بہر حال مزید قوت سے مزدور کی اعانت کی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "محنت اور سرمایہ" کے جتنے جھگڑے اس زمانہ میں

اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں مندرجۂ بالا حدیث کے ذریعہ اس کا حل پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کی یہ صرف کوئی خوشگوار نری تجویز ہی نہیں ہے بلکہ ایسے عملی واقعات کی ایک فہرست پیش کی جا سکتی ہے جن میں مسلمانوں نے اسے عملاً کرکے دکھایا۔ اس حدیث کے راوی حضرت ابو ذرؓ ہی کی زندگی کا دستور العمل تھا، اور حضرت عمرؓ کا سفر بیت المقدس میں نصف راستہ خود سوار ہونا اور نصف راستہ غلام کو اونٹ پر سوار کرانے کا واقعہ تو مشہور ہی ہے۔ مزدوری کے متعلق دوسری حدیث بخاری کی یہ ہے

قال اللہ ثلثہ انا خصمھم یوم القیامۃ رجل اعطی بی ثم غدر ورجل باع حرا ثم اکل ثمنہ ورجل استاجر اجیرا فاستوفی منہ ولم یعطہ اجرہ	اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تین آدمیوں کا قیامت کے دن میں فریق مخالف ہوں گا، ایک شخص جس نے میرے نام سے کسی کو کچھ دیا اور پھر عہد شکنی کی (یہ پہلا آدمی ہی ہے) دوسرا وہ جو کسی آزاد آدمی کو بیچ کر اس کی قیمت کھائے، تیسرا وہ جس نے کسی کو مزدور رکھا اور اس سے پورا کام لیا، لیکن اس کی پوری مزدوری ادا نہ کی۔

تیسری حدیث

ان ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف رشحہ (رواہ ابو یعلی)	حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مزدور کو اس کی مزدوری ادا کردو قبل اس کے کہ اس کا پسینہ خشک ہو۔

ایک اور روایت مسند احمد میں یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

۱عطوا العامل من عمله فان عامل اللہ لا یخیب	مزدور کو اس کے کام سے بھی حصہ دو کیونکہ اللہ کا عامل ومزدور نامراد نہیں کیا جا سکتا۔

اس حدیث کا کیا مطلب ہے، کیا علاوہ مزدوری کے منافع میں بھی مزدور کا کچھ حصہ اسلام مقرر کرنا چاہتا ہے۔ افسوس ہے کہ فقہائے اسلام کی کتابوں میں اب تک اس کے متعلق کوئی بات نہیں ملی۔ لیکن ایک اور حدیث ہے جس میں اس کی ایک گونہ تشریح ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد مبارک ہے

۲ ذا صنع لاحدکم خادمه طعاما ثم جاء به وقد ولی حره ودخانه فلیقعده معه فلیاکل فان کان الطعام مشفوها فلیضع منه فی یده اکلة او اکلتین (صحیح بخاری)	تمھارا خادم اگر تمھارا کھانا تیار کرے اور لے کر تمھارے پاس آئے اور گرمی دھوئیں کو اس نے برداشت کیا تھا تو چاہیئے کہ اپنے ساتھ اس کو بٹھالو، اور کھانے پر زیادہ آدمی ہوں تو پھر خادم کے ہاتھ میں کھانے سے کچھ چیز اٹھا کر رکھ دو ایک لقمہ یا دو لقمے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اس کام سے بھی جو خادم نے کیا خادم کو کچھ نہ کچھ حصہ ملنا چاہیئے۔ کیا مزدور کو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے؟

مزدوروں اور نوکروں کے ساتھ کس قسم کا معاملہ کرنا چاہیئے۔ ایک تو اس باب میں بخاری کی روایت گذر چکی کہ بھائی بھائی کا معاملہ کیا جائے۔ نیز اس سلسلہ میں ان کے ساتھ درگذر اور چشم پوشی کے متعلق ایک قابلِ ذکر حدیث وہ ہے جس میں آیا ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے دریافت کیا

یا رسولُ اللہ کم اعفو عن الخادم	میں اپنے نوکر کو کتنی دفعہ معاف کیا کروں۔

راوی کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ اس نے پھر اسی سوال کو دہرایا۔ آپ نے تب اس کے جواب میں جو بات کہی وہ یاد رکھنے کی ہے، ارشاد ہوا

اعفی عنہ کل یوم سبعین مرۃ　　　روز ستر دفعہ معاف کیا کرو۔

(ابو داؤد و ترمذی)

اسی بناء پر فقہائے اسلام نے یہ طے کر دیا ہے کہ نوکر یعنے

الذی یستاجر مدۃ فلا ضمان علیہ مالم یتعد　　　کسی مقررہ مدت کے لیے جو تنخواہ پر نوکر رکھا جائے اس پر (چیزوں کے نقصان کرنے کا تاوان قانوناً عائد نہ ہوگا، اگر اس کی طرف سے قصداً نقصان کرنے کا ارادہ نہ ہوا ہو)۔

مقدسی نے اس جزئیہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے

وھذا مذھب مالک وابی حنیفۃ واصحابہ　　　یہی امام مالک اور امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب ہے۔

اس سلسلہ میں بعض ایسی حدیثیں بھی قابلِ ذکر ہیں جن کا تعلق اگرچہ غلاموں سے ہے لیکن میرے نزدیک یہ احکام ہر شخص کے لیے عام ہیں جو کسی کی ماتحتی میں کام کرتا ہو۔

ابو مسعود بدری صحابی کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ کوڑے سے اپنے غلام کو مار رہے تھے، پیچھے سے ایک آواز

اعلم ابا مسعود　　　خبردار ابو مسعود

کی آئی۔ ابو مسعود کہتے ہیں غصہ میں مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ کون ہے کہ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور فرما رہے ہیں

اعلم ابا مسعود ان اللہ اقدر　　　خبردار ابو مسعود حق تعالیٰ تم پر تمھارے

علیک منک علی ھذا الغلام — غلام سے زیادہ قابو رکھتے۔

(مسلم)

اور غالباً یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ غلاموں اور لونڈیوں کو عبدی (میرا غلام) امتی (میری لونڈی) کہنا اور ان لوگوں کا اپنے آقاؤں کو ربّی (میرا رب اور مالک)، ربتی (میری مالکہ) کہنے کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرما دی تھی اور حکم تھا کہ بجائے غلام کے فتائی (میرا جوان) اور آقا کو بجائے رب کے سیدی (میرے سردار) کہا کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک میں غریبوں کے اس طبقہ کا کتنا خیال تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آخری آواز دنیا کے کانوں نے خدا کے آخری پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانِ مبارک سے جو سُنی وہ

الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم — نماز اور جن کے تم مالک ان کی خبر لیتے رہنا (یعنے ان دونوں کے حقوق کا سب سے زیادہ لحاظ رکھنا)۔

کی تھی صلی اللہ تعالیٰ علی النبی الامی وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین۔

اسی طرح قرآن کی مشہور آیت

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم — اللہ کے پاس سب سے زیادہ شریف وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

میں "پیشہ ورانہ" طبقات کی جن درجہ بندیوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے اور بجائے پیشوں اور نسلوں کے تقویٰ کو معیارِ فضیلت قرار دیا گیا ہے اس سے مزدوری کے کسی پیشہ کو افضل اور کسی کو کمتر قرار دینے کی بنیاد ہی نکل گئی۔ اسلام اور اسلام پر صحیح معنوں میں چلنے والوں نے اس سلسلہ میں جو عملی نظائر پیش کئے ہیں تاریخ کے اوراق اس سے معمور ہیں جتنی کہ اسی بنیاد پر

ہندوستانی تمدن کے نشہ کا ایک متوالا ابوالفضل تعریضاً کہا کرتا تھا کہ فلاں حلوائی اور فلاں کفش دوز کی باتوں کا کیا اعتبار۔ یعنے اسلام میں عموماً بڑے بڑے علماء، فقہاء جو گذرے ہیں ان میں زیادہ تر لوگوں کا تعلق مزدوری کے معمولی پیشوں سے تھا۔ افسوس کہ جو چیز اسلام میں باعثِ فخر ہے، اس ہندی تمدن کے مسحور کی نگاہ میں وہی باعث ننگ قرار پائی۔ مگر بحمداللہ اب دنیا فہم کے جس نقطہ پر آچکی ہے وہ فیصلہ کرسکتی ہے کہ آج جس چیز کے ماننے کے لیے عالم مضطرب ہے، اسلام صدیوں پہلے اس نظریہ کو پیش کرچکا ہے اور عمل کرکے دکھاچکا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ٹھٹھیروں کو بھی اسلام نے جب تخت و تاج کا مالک بنایا تو صفاریت[1] کے لقب کو انھوں نے بطورِ فخر کے استعمال کیا، اور غلاموں کی جو قدر و عزت اسلام میں ہوئی دنیا کی تاریخ اپنے پاس اس کی نظیر نہ اس سے پہلے رکھتی ہے اور نہ بعد۔ تقریباً ائمہ حدیث و فقہ کی بڑی جماعت موالی ہی کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ صرف دین ہی میں نہیں، مختلف مقامات میں دنیا کے حساب سے بھی دنیوی ارتقاء کے آخری نقطہ سلطنت و بادشاہت تک غلاموں کو عروج پاتے ہوئے تم مسلمانوں میں پاسکتے ہو۔

لیکن باوجود اس کے ذلت کی وجہ سے نہیں بلکہ بعض پیشوں کا چونکہ گندگی اور نجاست سے تعلق ہے اس لیے چند خاص پیشوں کے متعلق علمائے اسلام میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے، جن میں ایک تو سنگھی لگانے (حجامت) کا پیشہ ہے۔ چونکہ سنگھی لگانے والے خون کو چوستے ہیں اور خون نجس چیز ہے اس لیے بعض حدیثوں میں آیا ہے

کسب الحجام خبیث — سنگھی لگانے والے کی کمائی گندی ہے۔

لیکن باوجود اس کے بھی اکثر ائمہ اسلام نے اس کی اُجرت اور مزدوری کو حلال ہی قرار دیا ہے۔ علامہ مقدسی نے "اجرہ مباح" یعنے "سنگھی لگانے کی مزدوری حلال ہے" لکھنے کے بعد ارقام فرماتے ہیں

ھذا قول ابن عباس قال — یہ ابن عباس کا قول ہے، انھوں نے

---

[1] صفار عربی میں ٹھٹھیروں کو کہتے ہیں خاندان صفاریہ حکومت اسلامی کے خاندانوں میں مشہور تاریخی خاندان ہے۔

انا آکله و به قال عکرمة والقاسم	فرمایا کہ میں اس کو کھاتا ہوں اور یہی فتویٰ
وابو جعفر و محمد بن علی بن الحسین	عکرمہ، قاسم ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین،
و ربیعة و مالک و الشافعی و	اور ربیعہ امام مالک، امام شافعی اور
اصحاب الرائے	اصحاب رائے (ابو حنیفہ) کا ہے۔

اگرچہ بعضوں کو اس سے اختلاف بھی ہے تاہم یہ اختلاف حجام کے صرف سنگھی لگانے کے کام کی حد تک محدود ہے باقی عموماً حجام جو دوسرے کام کرتے ہیں ان کے جواز میں تو کسی کو کلام ہی نہیں ہے۔ مقدسی کا بیان ہے

استیجار الحجام بغیر الحجامه	پچھنا لگانے کو چھوڑ کر حجاموں کے یہ کام یعنی
کالفصد وحلق الشعر وتقصیرہ	فصد کا کام بال مونڈنے کا کام یا تراشنے کا
والختان و قطع شی من الجسد	یا ختنہ کرنے کا یا جسم کے کسی حصہ کے کاٹنے کا اگر
للحاجة فجائز۔	ضرورت پیش آئے تو اس کی مزدوری جائز ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک اور چیز کا تذکرہ بھی فقہائے اسلام نے کیا ہے، یعنے خاکروبوں اور بھنگی کا کام ظاہر ہے کہ اگرچہ یہ بھی ایک قسم کی مزدوری ہے لیکن بھنگیوں کو چونکہ نجاست سے کام پڑتا ہے، اس لیے علماء نے اس پیشہ کو اچھا نہیں خیال کیا ہے۔ ابن عباس کا ایک اثر بھی اس باب میں نقل کیا جاتا ہے کہ حج سے فارغ ہو کر ایک آدمی ان کے پاس آیا اور بولا کہ

اُکْنُسُ فما تری فی مکسبی	میں صفائی کا کام کرتا ہوں میرے پیشہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

ابن عباس نے پوچھا

اَیَّ شَیْءٍ تَکْنُسُ (کس چیز کو صاف کرتے ہو) بولا العذّرة (یعنے غلاظت) کو صاف کرتا ہوں۔ اور آگے اس پر اس نے اضافہ بھی کیا۔

ومنہ حججت ومنہ تزوجت	اسی کی مزدوری سے میں نے حج بھی کیا اور شادی بھی کی

یہ سن کر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں سخت کراہت پیدا ہوئی غصہ میں بولے

انت خبیث وحجک خبیث و ماتزوجت خبیث	تو بھی گندہ تیرا حج بھی گندہ اور جو تو نے شادی کی وہ بھی گندی۔

لیکن باوجود ابن عباس کے اس سخت فتویٰ کے علماء نے اس "خبیث" کا مطلب "مذہبی خبث" نہیں لیا ہے، بلکہ طبعی خبث اور کراہیت مراد ہے، اسی لیے عام خیال یہی ہے کہ

الاجارة فجائزة لان الحاجة داعية اليها الاتندفع الا باجة الاجارة فوجبت اباحتها كالحجامة (المغنی ص۱۳۶)	غلاظت صاف کرنے کی مزدوری جائز ہے، کیونکہ ضرورت کا تقاضا ہے کہ جب تک اس کی مزدوری حلال نہ ہوگی یہ ضرورت پوری نہیں ہوسکتی، اس لیے اس کا حلال ہونا ضروری ہوا، جیسے سنگھی لگانے کی مزدوری حلال ہے۔

اسی قسم کی ایک "گندہ اُجرت" جس کا جاہلیت میں غالباً رواج تھا اور اسے اصطلاحاً "عُسب الفحل" کہتے تھے۔ یعنی اونٹ، بکری، گھوڑے وغیرہ کا جس کے پاس نر جانور ہوتا وہ بچہ کشی کے لیے اس نر کو کرایہ پر چلاتا تھا، فقہاء نے اس معاوضہ کو مکروہ لکھا ہے۔ اگرچہ ضرورت کی وجہ سے بعضوں نے اجازت بھی دی ہے۔ بہرحال اگر معاہدہ کے طور پر نہیں بلکہ بطور ہدیہ کے نر کے مالک کو کچھ دے دیا جائے، اس میں حرج نہیں ہے لکھا ہے

ان اطرق انسان فحله بغير اجارة ولاشرط فاهديت له هدية او اكرم بكرامة	اپنے نر کو کوئی اگر بغیر کسی اجارہ اور شرط کے چھوڑے اور اس کے بعد کوئی تحفہ دیا جائے یا کوئی عزت افزائی ہو، تو

لذاک فلا باس بہ (صـ۱۳۴) اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ بجز ایسی چیزوں کے جن سے استفادہ ہی کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ مثلاً زنا، گانا بجانا، نوحہ گری، تصویرکشی وغیرہ۔ چونکہ یہ سارے کام بھی اسلامی نقطۂ نظر سے بُرے ہیں اس لیے ان کو بھی حصولِ معاش کا ذریعہ بنانا جائز نہیں ہے۔ یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ انھوں نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے نصوص اور اسلامی مستندات کی بنیاد ہی پر کہا ہے ورنہ جہاں کہیں تھوڑی سی بھی گنجایش نظر آئی اگر سبھوں نے نہیں تو بعض آئمہ نے معاش کی اس راہ کو بھی کھولنے کی کوشش کی ہے۔ فقہائے اسلام نے اس باب میں کس حد تک وسعتِ نظر سے کام لیا ہے اس کا اندازہ اس ایک مثال سے ہوسکتا ہے کہ شراب جیسی حرام چیز کے متعلق اوروں کا تو نہیں لیکن امام ابوحنیفہ کا یہ فتوٰی کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے

من حمل لذمی خمرا فانہ یطیب له الاجر عند ابی حنیفة (کتاب الکراہتہ ہدایہ صـ۴۳۷ جلد ۴)

اگر کسی غیر مسلم ذمی کی شراب (مسلمان) ڈھوئے، تو مسلمان کے لیے اس ڈھونے کی مزدوری امام ابوحنیفہ کے نزدیک پاک ہے۔

امام صاحب کے خیال کی توجیہہ کرتے ہوئے صاحبِ ہدایہ نے لکھا ہے کہ شراب کا پینا حرام ہے اور پینے کی نیت سے اس کا ڈھونا بھی حرام ہے، لیکن اس مسلمان بیچارے کی غرض تو مزدوری ہے خواہ پانی ہو یا شراب پھر اس کی مزدوری کو کس بنیاد پر ناپاک قرار دیا جائے لیکن اور تو اور امام صاحب کے دونوں شاگرد ابویوسف و محمد بن حسن کا فتوٰی اس کے خلاف ہے کیونکہ حدیث میں چونکہ شراب کے سلسلہ میں جن جن لوگوں پر لعنت کی گئی ہے ان میں "حاملها" اس کے ڈھونے والے کا لفظ بھی ہے۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ جو خود پینے کے لیے شراب ڈھوئے اس کے ساتھ یہ حکم مخصوص ہے۔ بہرحال مجھے اس مثال سے فقہاء کی معاشی وسعتِ نظری کا ثبوت پیش کرنا تھا اور یہ اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ گر باوجود ان

وسعتوں اور اجازتوں کے دو چیزیں فقہاء کی کتابوں میں عجیب پائی جاتی ہیں، یعنے ایک تو یہ کہ مسلمان کیا کسی کافر کی ملازمت و نوکری کرسکتا ہے؟ ۔ یہ سوال اُٹھایا گیا تھا اور بدقسمت مسلمانوں کے متعلق کیا معلوم تھا کہ کبھی ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ جواب تو جواب سوال بھی دماغوں سے نکل جائے گا حتیٰ کہ بالآخر ان کی ساری قومی اور ملّی کوششوں کا آخری محور یہی مسئلہ رہ جائے گا کہ غیر اسلامی حکومتوں میں ملازمت کے حقوق کی کتنی مقدار ان کو حاصل ہوئی مغنی کے متن کا مسئلہ ہے

لا یجوز اجارۃ المسلم للذمی لخدمتہ نص علیہ احمد	مسلمان کو ذمی کافر اپنی خدمت کے لیے نوکر رکھے یہ جائز نہیں ہے امام احمد نے اس کی تصریح کی ہے۔

دلیل یہ بیان کی ہے کہ یہ

حبس المسلم عند الکافر و اذلالہ لہ	یہ مسلمان کا کافر کے پاس قید ہونا بھی ہے اور مسلمان کو ذلیل کرنا بھی ہے۔

مجھے مسئلہ کے ذکر سے اس وقت جواز وعدم جواز کی تحقیق مقصود نہیں ہے۔ آخر اسے اگر جائز نہ قرار دیا جائے گا تو مسلمانوں کے جینے کی شکل ہی کیا رہے گی، بلکہ دکھانا کسی قوم کے تاریخی انقلاب کا ہے

واذا اراد اللہ بقوم سوء فلا مرد لہ ومالہ من دونہ من ال	اور اللہ جب کسی قوم کے ساتھ بُرائی کا ارادہ فرماتا ہے تو پھر اسے کوئی پلٹا نہیں سکتا اور نہ اس کا کوئی والی و مددگار ہوتا ہے۔

اسی سلسلہ کے ایک مسئلہ کا ذکر آخر میں اس لیے کر دیا جاتا ہے کہ فقہائے امت کی بلند نظری کا لوگوں کو کچھ احساس ہو اور معلوم ہو کہ اسلامی معاشیات کی تدوین میں ان بزرگوں نے کتنی بے لوثی سے کام کیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ان بزرگوں کا کام ہی قرآن وحدیث کی

تدریس وتعلیم یا مساجد کی امامت وخطابت وغیرہ تھا۔ اور اب بھی بیچارے مولویوں کا یہی کام ہے۔ مگر باوجود اس کے حیرت ہوتی ہے کہ چند لوگوں نے نہیں بلکہ اکثر آئمہ اسلام کا فتویٰ ان تمام امور کے متعلق یہ ہے کہ ان خدمات کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے۔ مقدسی لکھتے ہیں کہ جن کاموں پر معاوضہ لینا درست نہیں ہے ان میں "الامامة والاذان والحج وتعلیم القرآن" بھی ہے۔ اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ

نص علیه احمد و به قال عطاء و	امام احمد نے اس کی تصریح کی ہے اور
الضحاک بن قیس و ابو حنیفه و	یہی فتویٰ ضحاک بن قیس، ابوحنیفہ اور
الزهری	زہری کا ہے۔

فقہ کی کتابوں میں اس پر بحث کی گئی ہے اور بالآخر زمانہ کے حالات کا اندازہ کرکے جواز کا فتویٰ اس بناء پر دے دیا گیا کہ چند آئمہ مثلاً شافعی، مالک جواز کے قائل تھے۔ آخر اگر اس کا فتویٰ نہ دیا جائے تو مفت حسبة للہ ان خدمات کو انجام دینے کے لیے کون آمادہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو کچھ گذشتہ بزرگوں ہی کی ہمت تھی کہ معاش کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کرکے دین کے ان مفت خدمات کو انجام دیتے تھے لیکن ع

زمانہ دگر گو آئین نہاد

بغداد اور اسلامی تہذیب کا مزید ارتقاء

مترجمہ

جناب ابو نصر محمد خالدی صاحب ۔ ام ۔ اے (عثمانیہ)

اسلامی دینیات، عربی صرف ونحو اور لغت کا کام کوفہ وبصرہ میں شروع ہوا۔ ان علوم کی مزید ترقی نیز سائینٹفک سرگرمی اور طرزِ تفکر پر عباسی خلفاء کے دربار کا زبردست اثر پڑا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے چھٹے دہے میں خلیفہ منصور نے دریائے فرات کے مغربی جانب نیا صدر مقام تعمیر کیا یہ شہر ایک بڑے گاؤں پر بسایا گیا، جہاں پہلے نسطوری بطریق سے متعلق ایک خانقاہ تھی۔ یہ گاؤں فارسی لفظ بغداد کے نام سے مشہور تھا اور آخرکار دارالخلافہ بن گیا۔ اس شہر کو اس کے بانی نے مدینۃ السلام (امن وسلامتی کا شہر جس سے خاص طور پر جنّت کی طرح اشارہ نکلتا تھا) کا لقب دیا تھا لیکن وہاں کے باشندوں نے اس لقب کو اختیار نہیں کیا۔ یہ نام صرف خلیفہ کے سکّوں پر ثبت ہوتا رہا۔ اس کی جگہ بغداد کا لفظ ۱۲۵۸ء میں منگولوں کے ظہور کے بعد ہی مسکوک ہونے لگا۔ مدت ہوئی کہ منصور کا بنایا ہوا شہر بالکل مٹ چکا ہے۔ یہ شہر بالکل ایک نئے ہی نقشہ پر تعمیر ہوا تھا۔ اس کو زیر بحث دور کے تمام دوسرے شہروں سے ممتاز کرنے والی چیز اس کی مُدَوّر شکل تھی۔ قطب نما کی چار سمتوں کے

جواب میں فصیل میں چار بڑے بڑے پھاٹک تھے جن میں بڑی بڑی محرابیں اور فوجوں کے لیے کشادہ جگہ رکھی گئی تھی۔ چاروں بڑے دروازے شہر کے مرکزی مقام کی طرف کھلتے تھے۔ جہاں خلیفہ کا محل مسجد جامع اور سرکاری دفاتر یا دیوان تھے! اس زمانہ میں سات قسم کے دیوان تھے۔

(۱) دیوان الانشاء والطغراء۔ یعنے وہ محکمہ جہاں سے سرکاری کاغذات خلیفہ کی منظوری حاصل کرنے کے لیے پیش ہوتے تھے۔

(۲) دیوان التوقیع

(۳) دیوان الحرث

(۴) دیوان الجُند

(۵) دیوان الخراج

(۶) دیوان الاستیفاء

(۷) دیوان الخزانہ

ان محکموں اور سرکاری عمارتوں کے علادہ بیت المال، اسلحہ خانہ اور عام مطبخ غالباً محافظ دستوں اور خلیفہ کے عہدہ داروں کے لیے ہوتا تھا۔ یہ پورا علاقہ فصیل سے گھرا ہوا ہوتا تھا۔ اس میں آنے کے لیے صرف شہر کے دروازہ ہی سے داخل ہونا پڑتا تھا کیوں کہ کوئی ایسی سڑک یا گلی نہیں تھی جو مختلف محلّوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہو۔ بازار مضافات کے ایک علاقہ میں واقع تھے۔ گو منصور کا یہ شہر وسعت میں بہ نسبت دمشق کے بڑا تھا تاہم موجودہ مملکتوں کے دارالسلطنتوں سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ دائرہ کے نصف قطر کا طول، جس پر شہر کی تعمیر کا خاکہ مبنی تھا، ڈیڑھ میل سے بھی کم تھا۔

تعمیر بغداد کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی دنیا کی ہیئت حکومت اور اس کے حکمرانوں کی زندگی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پہلے جانشین سے

کس حد تک بدل چکی تھی۔ بعد کو آنے والے خلفاء کی تحت اس صورت حال میں اور بھی اضافہ ہوا۔ نویں صدی عیسوی کے نصف اول میں ہم دفتری تنظیم کی ایسی نشو و نما کا مشاہدہ کرتے ہیں جس میں صرف محکموں کی تعداد ہی میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ تمام عہدہ داروں کے صدر یعنی وزیر کے اقتدار و اختیار میں بھی زیادتی ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں خلفاء عجمی اہل سیف افراد کو اپنے اطراف جمع کرنے لگے۔ یہ عہدہ دار ایرانی فوجی امیروں کے نمائندوں اور غلاموں سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ اور غلام عموماً وسط ایشیا کے ترک ہوتے تھے۔ علاوہ وزیر اور امیر حرس کے قاضی القضاۃ کی شخصیت بھی ایک خاص عہدہ دار کی تھی۔ منصور کے زمانہ میں اعلیٰ عہدہ دار اسی تنخواہ پر قناعت کرتے تھے جو بنی اُمیہ کے عہد میں ملا کرتی تھی یعنی ماہانہ تین سو درہم۔ مامون (۸۱۳ء تا ۸۳۳ء) کے زمانے میں مشاہروں کا جدید نظام رائج ہوا۔ اس کا معیار صرف قرونِ وسطیٰ ہی میں نہیں بل کہ آج بھی بلند خیال کیا جاسکتا ہے۔ مامون کے زمانہ میں مصر کے قاضی القضاۃ کی تنخواہ ماہانہ چار ہزار درہم (تقریباً اسی پونڈ) تھی اور ایک دوسری روایت کے مطابق اس کا مشاہرہ اس سے بھی زیادہ یعنی سات دینار یومیہ تھا جو تقریباً ساڑھے تین پونڈ کے برابر ہوتا ہے۔ بغداد میں وزیر کا مشاہرہ سات ہزار دینار (تین ہزار پانچ سو پونڈ) قاضی القضاۃ کی تنخواہ پانسو دینار تقریباً ڈھائی سو پونڈ ماہانہ تھی۔ ان بڑے بڑے مشاہروں کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر محکمہ کے صدر کو اپنے ماتحت عہدہ داروں کے مشاہرے بھی اپنے ہی پاس سے دینے پڑتے تھے لیکن ماتحت عہدہ داروں کے مشاہرے دینے کے بعد بھی وزیر کی ماہانہ آمدنی ایک ہزار دینا (تقریباً پانچ سو پونڈ) سے کم نہ تھی لیکن عمومی حیثیت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں، جب کہ خلافت کی وسعت نسبتاً گھٹ گئی تھی بغداد کے دربار اور وہاں کے عہدہ داروں پر جو رقم صرف ہوتی وہ منصور و ہارون کے دور سے بہت زیادہ تھی حال آں کہ اُس وقت عباسی خلافت

اپنے پورے عروج پر تھی۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ مشرق میں بھی حکام اپنے اہلِ ملک کی زندگی پر اتنا اثر نہیں ڈالتے تھے جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ ایشیا سے ناواقف ہیں ان کے لیے بغداد اور خلیفہ ہارون رشید اور اس کا دربار لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر نویں و دسویں صدی عیسوی کے نسبتاً کم اہل عباسی خلفاء کے زمانے کے بغداد سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہارون رشید کے زمانہ کا بغداد ایک معمولی شہر سے زیادہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابتدائی عباسی خلفاء خصوصاً منصور و مامون نے یونانی مخطوطے حاصل کرنے اور ان کے ترجمے کرنے کا حکم دیا تھا۔ گو اس موضوع پر کافی تحقیق نہیں ہوئی ہے لیکن اس میں تو شبہہ کی بہت کم گنجائش ہے کہ اسلامی عہد کی علمی سرگرمی اور ایران قبل اسلام میں یونانی علوم کی ترویج اور ترقی میں ایک دوسرے سے قریبی تعلق ہے منصور و مامون کے دربار میں چند یہودیوں کے علاوہ ہمیں ایسے عالموں کی کافی تعداد نظر آتی ہے جو ایرانی الاصل تھے۔ علمی رسالوں کے ترجموں میں صرف شامیوں ہی سے مدد نہیں لیجاتی تھی بل کہ پہلوی زبان سے بھی استفادہ کیا جاتا تھا، جو ساسانی دور میں ایران کی عام زبان تھی۔ ہیئتی جدولوں کا نام زیچ ایرانیوں سے لیا گیا تھا جس کے معنی تانے کے ہیں۔ چوں کہ عربوں نے یونانی علوم بجائے براہ راست حاصل کرنے کے دوسرے ذریعہ سے حاصل کیئے تھے، اور وہ یونانی شاعروں یا مورخوں سے ناواقف محض تھے، اس لیئے یونانی علوم کے ارتقاء اور عہد بہ عہد کی تبدیلیوں کے متعلق ان کو واضح معلومات نہ ہوسکیں۔ عربوں کے نزدیک یونانی تاریخ کی ابتداء فلپ مقدونوی کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ یونانی علماء اور فلسفیوں کے متعلق عربوں کی معلومات بہت سرسری تھیں حتیٰ کہ محققین بھی یہ سمجھتے تھے کہ سقراط ایک یونانی بادشاہ کے حکم سے قتل کیا گیا تھا۔ بعض یونانی عالموں کو تو ایرانی الاصل سمجھ لیا گیا تھا، کیوں کہ ان کے متعلق عرب پہلوی

ترجموں کے ذریعہ واقف ہوئے تھے۔

یونان کے علاوہ ساسانیوں کے زمانہ میں ہندوستانی علوم کا بھی ایران پر اثر پڑا تھا۔ اور جب ہندوستان پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو اس وقت ہندوستان کا اسلامی علوم پر بھی اثر پڑا۔ یہ بات بھی بڑی حد تک یونانیوں ہی کی وجہ سے ہوئی تھی گو بعض صورتوں میں یونانیوں کو اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ یونانی اثرات خاص کر علم ہئیت اور ہندوستانی علم حساب وجبر ومقابلہ میں نمایاں تھے۔ یورپ میں جو ہندسے عربی اعداد کے نام سے مشہور ہیں وہ ایران ومصر کے راستے یورپ میں رائج ہوئے تھے۔ یہ ہندسے دراصل اہل ہند کی ایجاد ہیں۔ جبر ومقابلہ سے یونانی بالکل ناواقف تھے۔ صرف اسکندر رومی ریاضی دان دیو فانت (چوتھی صدی عیسوی) اس سے ذرا واقف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ریاضیات کی یہ شاخ ہندوستان میں بھی بڑی ترقی کر گئی تھی! اہل یورپ کو اس کا علم عربوں ہی کے ذریعہ سے ہوا اور اس لئے اس کا نام الجبر بھی عربی ہی سے اختیار کر لیا گیا۔ دیگر علوم کے علاوہ یونانیوں پر ہندی طب کا بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوا چناں چہ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ پہلی صدی قبل مسیح کے اسکندر رومی طبیب دیوسکورُدس کی تصنیفوں میں ہم کو ہندی اصطلاحات بھی ملتی ہیں۔ ساتھ ہی اہل ہند ایک "باختری" طبیب کو بھی مُستند مانتے ہیں قیاس یہ ہے کہ طب کی مختلف شاخوں میں سے یونانیوں کا اثر خاص کر جراحی پر پڑا ہوگا۔ کیوں کہ ہندوستان میں جراحی کی ترقی زیادہ مدت تک نہیں رہی۔

گو پوری طرح نہ سہی لیکن بہت بڑی حد تک نویں اور دسویں صدی عیسوی میں علمی سرگرمی دریائے دِجلہ وفرات کی وادی میں مرکوز رہی۔ قدیم تہذیب کے مرکزوں مثلاً بصرہ نے اس ارتقاء میں حصہ لیا تھا لیکن کوفہ عباسیوں کے زمانہ میں اپنی اہمیت کھو چکا تھا۔ دار الخلافہ بغداد اور حَران کی بھی یہی حالت تھی گو حَران کو یونانی علوم سے آشنا کرنے والے اہل انطاکیہ تھے۔ جاحظ جیسے مہذب ومتمدن مصنف (متوفی ۸۶۹ء) اور الکندی (متوفیٰ

۸۷۳ء) جیسے عربوں کے پہلے آزاد خیال فلسفیوں کے تعلقات بصرہ سے تھے، دسویں صدی عیسوی میں اخوان الصفا کے نام سے بمقام بصرہ آزاد خیال اور فلسفہ کے متعلق سرسری معلومات رکھنے والوں کی ایک جماعت پیدا ہوئی اس جماعت نے مختلف علوم پر اکاون مختصر رسالے تحریر کیئے ہیں جو غیر معمولی طور پر مقبول ہوئے۔ دسویں صدی عیسوی کے آخر میں ایک اندلسی ریاضی دان یہ رسالے اپنے ساتھ اسپین لے گیا اور چار صدی بعد ایک تیموری شہزادہ کے لیئے ان رسالوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ بغداد دنیائے اسلام کے ہر حصے خصوصاً فارس اور وسط ایشیا کے علماء کے لیئے مرکز کشش رہا۔ دارالخلافہ میں الکندی کا ہم سر مشہور ہیئت دان ابو معشر البلخی تھا۔ اس شہر میں ایک اور عالم ابوزید پیدا ہوا جو الکندی کے شاگردوں میں سب سے زیادہ مشہور رہا ہے۔ اس سے قبل بغداد میں محمد بن موسیٰ الخوارزمی جیسا ریاضی دان بھی گذر چکا تھا۔ اس کا وطن خوارزم تھا اور اس کا انتقال ۸۴۷ء میں ہوا۔ یہ علاقہ اب خیوا کے خان کی عملداری شمار ہوتا ہے۔ اس نے جبر و مقابلہ اور علم حساب پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے زمانے تک بھی یہ شخص بہت بڑا عالم سمجھا جاتا تھا۔

لوکارتم اسی کے نام کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ احمد الفرغانی (متوفی ۸۶۱ء) بغداد میں اپنے وطن فرغانہ سے آیا تھا جو اسلامی دنیا کی آخری مشرقی سرحد پر واقع ہے۔ ترکستان کا ایک دوسرا باشندہ مشہور فلسفی ابو نصر الفارابی ہے۔ یہ نسلاً ترک تھا لیکن تعلیم بغداد میں پائی اور سنہ ۹۵۰ء میں بمقام دمشق انتقال کیا۔ حران کے عالموں میں بتانی کو ریاضی دان و عالم ہیئت کی حیثیت سے ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ یہ دریائے فرات کے کنارے شہر رقہ میں سکونت رکھتا تھا۔ اس نے ۹۲۹ء عیسوی میں وفات پائی۔ علم المثلث کے تفاعل کا علم یورپ کو سب سے پہلے اسی مصنف سے معلوم ہوا۔ یونان و ہندوستان دونوں جگہ علم مثلث کا مطالعہ علم ہیئت کے تعلق سے کیا جاتا تھا۔ تیرھویں

صدی عیسوی میں جا کر کہیں مشرق میں علم مثلث ایک علیحدہ علم تسلیم کیا گیا۔

یونانی فلسفہ اور تاریخ سے عربوں کی ناواقفیت ان کے فلسفہ وعلوم صحیحہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ عرب علما اصلی مستند یا جعلی کتابوں میں فرق نہیں کر سکتے تھے جو قدیم مصنفوں سے غلط طور پر منسوب کر دی گئی تھیں یا بعض وقت وہ ایسے ہم عصر فلسفیوں کو ایک دوسرے سے خلط ملط کر دیتے ہیں جن کے نام یکساں تھے یا بظاہر یکساں معلوم ہوتے تھے۔ زمانہ تو مختلف تھا لیکن ان کے نام ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے تھے جیسے افلاطون اور فلاطینوس، دونوں کو وہ افلاطون کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ افلاطون کی تعلیم اور اس کے بعد کی ترقی یافتہ شکل نو افلاطونیت اور ارسطو کی تعلیمات کے فرق کو واضح طور پر محسوس نہیں کر سکے۔ اس طرح عربوں نے (دینیات) تھیالوجی کو، جس میں فلاطینوس (تیسری صدی عیسوی) کے اصول بھی شامل ہیں، ارسطو سے منسوب کر دیا ہے۔ ارسطو کی تعلیمات کے متعلق عربوں کے اِن وہمی تخیلات کو قرون وسطی کے اہل یورپ بھی صحیح مان لیا کرتے تھے جنھوں نے یہودیوں کے کیئے ہوئے ارسطو کی کتابوں کے صرف ترجمے پڑھے تھے۔ بعد میں اصل یونانی کتابوں کے ذریعہ اہل یورپ کو معلوم ہوا کہ دینیات اور فلسفۂ تصوف کو ارسطو کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ کیتھولک فرقہ کے مدرسی عالموں کی طرح اسلامی فلسفیوں نے بھی یونانی فلسفہ اور مذہب میں تطبیق دینے کی کوشش کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مورخوں نے خود عربوں کے لیے مدرسیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اسلامی دنیا کے مختلف حصوں میں قریبی تعلقات قائم رہے ہیں۔ چناں چہ تہذیبی قدروں کے فوری تبادلہ میں ان تعلقات نے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ طبری کی یادگار زمانہ تاریخ بغداد میں دسویں صدی عیسوی کی ابتدا ہی میں شائع ہوئی۔ اسلام کے ابتدائی صدیوں کے متعلق یہ تاریخ آج بھی ہماری معلومات کا خاص مأخذ ہے۔ طبری کی تاریخ اس صدی میں اسلامی دنیا کی انتہائی مشرقی و مغربی گوشوں تک پہنچ گئی۔ تقریباً

ایک ہی وقت اور ایک ہی زمانہ میں اس کتاب کے اقتباسات قرطبہ اور بخارا میں نقل ہو کر شائع ہوئے۔ قرطبہ میں جو اقتباس شائع ہوا وہ اندلسی خلیفہ حکم ثانی (۹۶۱ء تا ۹۷۶ء) کے لیے تھا جس میں اندلس اور افریقہ کی تاریخ کا ابتدائی حصہ بطورِ ضمیمہ شریک کر دیا گیا تھا اور بخارا میں اس کے بعض حصوں کا فارسی ترجمہ امیر منصور اوّل سامانی کے حکم سے ہوا تھا جو اندلس کے خلیفہ حکم ثانی کا ہم عصر تھا۔ عربوں کے جغرافیائی ادب کی فوری نشر و اشاعت، اسلامی دنیا کے آپس کے گہرے تعلقات کی ایک دوسری مثال اور نویں و دسویں صدی عیسوی کے مسلمانوں کی تہذیب کی سب سے زیادہ قیمتی یادگار ہے۔ سب سے پہلے نقشے اور ہیئتی حسابات مامون کے عہد میں بمقام بغداد تیار ہوئے۔ دسویں صدی عیسوی میں الکندی کے ایک شاگرد ابو زید بلخی کی تحقیقوں کی وضاحت و تفصیل پہلے فارس کے اصطخری اور پھر ابن حوقل نے کی۔ ابن حوقل بغداد کا ایک تاجر تھا لیکن مستقلاً شمالی افریقہ میں رہتا تھا۔ دسویں صدی عیسوی کے مسلمانوں کی جغرافیائی کتابوں میں ہم کو اس زمانے کے، اندلس سے لے کر ترکستان اور دریائے سندھ کے دہانے تک کے حالات ملتے ہیں جن سے دنیائے اسلام مرکب تھی۔ ان کتابوں میں خاص خاص شہروں کے مختلف حالات بتائے گئے ہیں، ہر قسم کی پیداواروں کی تفصیلیں دی گئیں ہیں، آباد، غیر آباد، زرعی اور غیر زرعی زمینوں کی تقسیم کے متعلق واضح اور صحیح معلومات مہیا کی گئیں ہیں، اور مختلف درختوں اور پودوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض پودے جیسے کپاس کا پودا یورپ میں سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے پہنچایا۔ عربوں نے روئی یورپ میں پہلے اندلس و صقلیہ میں رائج کی۔ چنانچہ مغربی یورپی زبانوں میں روئی کے لیے اب بھی عربی نام ہی رائج ہے۔ عرب جغرافیہ نگاروں ہی کی بدولت موجودہ عالموں کے پاس ایسا مواد جمع ہو گیا ہے جس کی بنیاد پر وہ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ گزشتہ ہزار سال کے دوران میں مغربی اور وسطی ایشیا کے طبعی جغرافیائی حالات میں کس قدر کم تغیر ہوا ہے عربوں کے تہذیبی پیش رؤں نے

جن میں خود یونانی بھی شامل ہیں، قدیم زمانے کے متعلق ہمارے لیے اس قسم کی کوئی روداد یں نہیں چھوڑیں ہیں۔

مختلف ملکوں کے حالات کے علاوہ عرب جغرافیہ نگاروں کے یہاں ہم کو عمومی جغرافیائی نتائج نکالنے کی کوشش کا بھی پتہ لگتا ہے علوم کی دوسری شاخوں کی طرح عرب جغرافیہ نویس علماء بھی اپنی معلومات کے لیے یونانیوں کے دست نگر تھے لیکن مسلمانوں کو جس دنیا کا علم تھا وہ یونانیوں کی دنیا سے بہت زیادہ وسیع تھی کیوں کہ اہل یونان آخر تک ان ملکوں کے متعلق انتہائی دھندلہ تصور رکھتے تھے جو بحیرۂ خزر کے مغرب میں واقع تھے اور ہند چینی کے شمال میں ایشیا کے پورے مشرقی ساحل کے متعلق تو وہ کچھ جانتے ہی نہیں تھے۔ لیکن اس کے برخلاف عرب جغرافیہ نویسوں نے دریائے ارتش و دریائے اوبی کے منبعوں تک کے رستوں اور کوریہ کے اوپر کے ساحل کا حال بھی بیان کیا ہے لیکن بایں ہمہ اہل عرب یونان کے جغرافیائی تصورات دہراتے رہے ٹھیک اسی طرح جیسے ہندوستان وچین کا بحری راستہ دریافت ہونے کے پورے دو سو سال تک بھی اہل یورپ ایشیا کا نقشہ بطلیموس کے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق بتاتے رہے، غرض یونانیوں کی طرح عرب جغرافیہ نویس بھی یہی خیال کرتے تھے کہ دنیا کا صرف ایک چوتھائی حصہ آباد ہے۔ وہ ہنوز اس پرانے خیال کے پابند تھے کہ انتہائی گرم مقاموں پر انسانوں کا بود و باش رکھنا ناممکنات سے ہے۔ اگرچہ عرب ملاح افریقہ کے ایسے مقاموں تک پہنچ چکے تھے جو خط استواء کے جنوب میں واقع ہیں جیسے زنجبار اور جزیرہ مدغاسکر۔ آخری یونانی جغرافیہ دانوں کی طرح مسلمان بھی زمین کے مسکونہ حصہ کو سات اقلیموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ اقلیمیں شمال سے جنوب تک پھیلی ہوئی ہیں اور وسطی یا چوتھے اقلیم کی حدود میں اسلامی دنیا کے خاص خاص تہذیبی مراکز جیسے بغداد، اصفہان اور دوسرے شہر واقع ہیں۔ اپنے پیشروؤں کی طرح تعلیم یافتہ مسلمانوں اور بعد میں اہل یورپ کا

یہ خیال کرنا بالکل قدرتی تھا کہ ان کے زمانے کا تمدن نوع انسان کی تمدنی کوششوں کا آخری و انتہائی نتیجہ ہے اور جس سے لطف اندوز ہونے کے لیئے گویا قدرت نے اُن ہی کو منتخب کیا ہے۔ مسلمانوں کے خیال کے مطابق درمیانی یا چوتھا منطقہ چوں کہ نہایت گرم اور نہایت سرد ملکوں سے برابر فاصلے اور وسطی حصے میں واقع تھا اس۔ لیئے انسانی سعی و کوشش کے لیئے یہی حصہ سب سے زیادہ مفید مطلب تھا۔ اور اسی کے لیئے دنیا کا سب سے زیادہ مہذب خطہ ہونا مقدر ہو چکا تھا۔

علم و فن کی ان ترقیوں کا معاشرہ کے تہذیبی معیار پر اثر انداز ہونا لازمی تھا۔ اب مسلمانوں نے عالم اور ادیب میں فرق کرنا شروع کر دیا تھا۔ کسی علم کے ماہر خصوصی کو عالم کہا جاتا تھا ادیب کا لفظ ایسے تعلیم یافتہ شخص کے لیئے بولا جاتا تھا جو تمام علوم کی جدید ترین تحقیقات سے آگاہ رہے اب ایسے قابل افراد پیدا ہونے لگے تھے جن کا کام علم و فن کو عام فہم بنانا تھا۔ قدیم طرز کے قادر الکلام شاعروں کے ساتھ ساتھ تخیلی شاعر بھی پیدا ہونے لگے تھے گو مسلمانوں کا خیال یہی رہا کہ ہر زمانے میں فصاحت صرف عربوں ہی کی خصوصیت خاصہ رہی ہے اور تخیل صرف عجمیوں کی امتیازی شان ہے عمومی حیثیت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عربی شاعری کو وہ مقبولیت کبھی حاصل نہیں ہوئی جیسی کہ فارسی شاعری کو ہوئی اس لیئے اس نے دوسری قوموں کی شاعری پر وہ اثر کبھی نہیں کیا جو فارسی نے کیا۔ مسلمانوں کی تہذیبی برتری کا اظہار، رزم و بزم دونوں حالتوں میں، ان کی حکومتی تنظیم سے عیاں ہے۔

نویں صدی عیسوی ہی میں بازنطیہ میں ایک مسلمان فوجی استاد کا ذکر ملتا ہے جو موعودہ انعام نہ ملنے کی وجہ سے اہل بلغاریہ سے جا ملا تھا۔ جو اس وقت بے دین تھے اور عیسائی نہ ہوئے تھے۔ اسی ماہر استاد کی بدولت اہل بلغاریہ نے یونانیوں پر پہلی بار فتح حاصل کی (۸۱۱ء) اسی صدی میں مغربی یورپ کے زائرین یہ دعویٰ

کرنے لگے تھے کہ ان کی جان و مال اسلامی ملکوں میں خود ان کے وطن سے زیادہ محفوظ تھے۔ بایں ہمہ معیار تہذیب کی ترقی نے عادات و اطوار یا معاشری حالات کی تبدیلی یا حکومت کے نظم ونسق میں تبدیلی پیدا کرنے میں مقابلتاً کم کام انجام دیا۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان فلسفی ارسطو و افلاطون کے نظریوں سے واقف ہو چکے تھے اور فارابی کی طرح بعض حکیموں نے سیاسی رسالے بھی تحریر کیئے تھے لیکن وہ ہمیشہ ایک اچھے منظم مثالی شہر سے بحث کرتے رہے جس کو اصلی زندگی کی حقیقتوں سے بہت دور کا تعلق تھا۔ مثال کے طور پر ہم نظم ونسق کی تنظیم سے متعلق فارابی کے نظریہ کو پیش کر سکتے ہیں۔ فارابی کا خیال ہے کہ اگر وہ تمام صفات جو ایک حاکم کے لیئے ضروری ہیں ایک ہی شخص میں مل جائیں تو اس کو مقتدر حاکم بنانا چاہیئے اور اگر یہ صفات ایک ہی شخص میں نہ مل سکیں تو پھر کئی شخصوں کا ایک ماموریہ مقرر کرنا ضروری ہے جس میں بہ حیثیت مجموعی یہ سب صفات موجود ہوں۔

پہلے کی طرح متمدن شہروں کے عام مقاموں پر مجرموں کو سولی پر چڑھانے کے بھیانک نظارے اب بھی پیش آتے تھے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے انیسویں صدی کی ابتداء تک مغربی یورپ میں شوارع عام پر مجرموں کو سولی دینے کے رواج کو عوام کی تائید حاصل تھی۔ کسی بڑے شہر کے لوگوں پر وہاں کے حاکم کو زیادہ اعتماد نہیں ہوتا تھا۔ الف لیلہ کے دل آویز قصوں کے باوصف ہارون بغداد بہت کم آیا کرتا تھا۔ اس کے بیٹے معتصم (۸۳۳ء تا ۸۴۲ء) اور اس کے بعد آنے والے دوسرے خلفاء نے اپنے اور اپنے محافظ دستوں کے لیئے دریائے دجلہ کے کنارے ایک دوسرا شہر تعمیر کیا جو بغداد سے تین دن کی مسافت پر تھا۔ منصور کے شہر کی طرح یہ سامرا بھی ایک ایسے مقام پر تعمیر ہوا جہاں پہلے ایک نصرانی خانقاہ تھی۔ چناں چہ خلیفہ کے اس نئے شہر کے لیئے اسی نصرانی خانقاہ سے زمینیں خریدی گئیں تھیں۔ مختصر سی

مدت میں کسی شہر کے بڑھ جانے اور بارونق بن جانے کی بہترین مثال سامرا ہے۔ اس کی چوڑائی تو زیادہ نہیں تھی لیکن دجلہ کے کنارے کنارے شمال سے جنوب تک اس کی لمبائی ۲۵ میل سے کم نہیں تھی۔ یہاں معتصم اور اس کے بیٹے واثق نے (۸۴۲ء تا ۸۴۷ء) متعدد عمارتیں بنوائی تھیں۔ اسلامی مورخوں کے بیان کے مطابق واثق نے معتصم کے فوجی مقام کو ایک بڑا شہر بنا دیا تھا۔ ہمارے زمانے تک سامرا کی جو عمارتیں باقی رہ گئیں ہیں ان میں صرف معتصم کا محل اور متوکل (۸۴۷ء تا ۸۶۱ء) کی بنائی ہوئی جامع مسجد ہے۔ اسلامی دنیا میں سب سے پہلا مقبرہ سامرہ میں ایک خلیفہ کے لیئے تعمیر ہوا۔ اس زمانے تک خلفاء کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کے مطابق سیدھے سادے طور پر دفن کیا جاتا تھا اور عام طور پر اُسی مقام پر دفن کر دیا جاتا تھا جہاں اس نے وفات پائی ہو۔ اب خلیفہ کی آخری آرام گاہ سے بھی اہمیت وابستہ کی جانے لگی۔ معتمد (۸۷۰ء تا ۸۹۲ء) کے انتقال کے بعد اس کی لاش کو دفن کرنے کے لیئے سامرہ لایا گیا کیوں کہ وہ اپنے آخری ایام خلافت میں دوبارہ بغداد میں رہنے لگا تھا۔ لیکن نویں صدی عیسوی کے بعد سامرہ کو پھر کبھی مرکزیت حاصل نہ ہوسکی۔ معتصم اور اُس کے جانشینوں کی بنائی ہوئی عمارتوں کے کھنڈر آج بھی محفوظ ہیں لیکن منصور کا بنایا ہوا شہر پوری طرح تباہ ہوچکا ہے۔ نویں صدی عیسوی کے آخر میں جب خلفاء نے دوبارہ بغداد میں رہنے کا فیصلہ کیا تو وہ پھر ایک بہت بڑا غدار شہر بن گیا۔ چناں چہ دجلہ کے مشرقی کنارے یہ قریباً انیس میل تک اور مغربی کنارے قریباً چودہ میل تک پھیلا ہوا تھا۔ شہر کے مشرقی حصہ کے قریباً ایک تہائی حصہ پر خلیفہ کا محل، خلیفہ کے خدم وحشم اور محافظ دستے کے سکونتی مکانات تھے۔ بعد میں یہ حصہ حرم کہلانے لگا تھا۔ محل سے بالکل متصل ہی جامع مسجد بھی موجود تھی اور حسب قاعدہ تمام باشندوں کے لیئے کھلی ہوئی تھی اس زمانے میں

بغداد کے شہر میں اس جیسی اور بھی جامع مسجدیں موجود تھیں۔

بارھویں صدی عیسوی میں بغداد میں قریباً گیارہ جامع مسجدیں تھیں، جن میں سے آٹھ مغربی اور تین مشرقی حصہ میں تھیں۔ سقوط بغداد کے بعد بغداد اور سامرہ میں بنتے ہوئے خلفاء کے محلات، قرطبہ سے لے کر بخارا تک کے ہر فرماں روا خاندان کے لیئے نمونہ کا کام دیتے رہے۔

شہری زندگی کی ترقی کے بعد بھی خلافت کی مالیاتی تنظیم کی بنیاد زر لگان کی آمدنی ہی پر تھی شریعت اور رائے عامہ دونوں صنعت وحرفت یا تجارت پر محصول لگانے کے موافق نہیں تھے۔ پھر بھی ہر جگہ اس قسم کے محصول عائد کیئے جاتے تھے۔ (تعریف) کے الفاظ میں ہم کو یورپ پر مسلمانوں کے احسان کی ایک اور مثال ملتی ہے۔ شریعت کی رو سے اسلام کے زیر اقتدار تمام علاقوں میں امن وامان قائم رکھنے کے لیئے ایک ہی قسم کے قانون کا نفاذ ضروری ہے۔ لیکن حکومت نے ایک ہی قسم کے قانون کے نفاذ کی کوشش بہت زیادہ نہیں کی۔ قدیم زمانے کی طرح اسلامی دور میں بھی مصر کے ساتھ دوسرے ملکوں سے مختلف قسم کا سلوک ہوتا رہا کیوں کہ وہاں کی تمام زمینیں ملکیتی جائداد تصور کی جاتی تھیں۔ اسلامی علاقہ میں کسی جگہ بھی کسانوں کے لیئے ایسے قوانین نہیں تھے جیسے کہ یورپ میں، کیوں کہ یورپ کے زرعی قانون کی رو سے زرعی غلاموں کا مخصوص علاقے میں اور مخصوص زمین سے ہمیشہ وابستہ رہنا ضروری تھا۔ اسلامی علاقے میں اگر کوئی کسان اپنی کاشت کردہ زمین چھوڑ کر چلا جاتا تو کوئی اس میں مخل نہ ہوتا۔ زمین کے مالکوں کو بھی، اگر کوئی دوسرا کاشت کار زیادہ معاوضہ دینا چاہے تو پہلے کاشت کار کو بے دخل کرکے، دوسرے کو تفویض کرنے کا حق حاصل تھا۔ بہت سے اسلامی ملکوں میں ایک قسم کا جاگیری نظام پیدا ہوگیا تھا جس کی رو سے جاگیردار کو زمین یا زمین کی آمدنی

دبی پڑی تھی۔ لیکن یہاں انسانوں کا تبادلہ تو کبھی نہیں ہوا درآں حالیکہ قرونِ وسطیٰ کے آخر تک مغربی یورپ میں اور انیسویں صدی عیسوی تک روس میں یہی عمل درآمد تھا۔

جیسا کہ ہم آئندہ باب میں دیکھیں گے ایران اور ترکستان میں اسلام کی اشاعت کے قدم بہ قدم شہری زندگی میں ترقی ہوتی گئی، ذات بندی کا نظام تتر بتر ہوا اور بڑی بڑی غیر منقولہ جائدادیں تقسیم ہوگئیں۔ ارمینیہ میں بھی یہی صورتِ حال پیش آئی۔ بہر طور فلسطین سے لے کر اندلس تک جن جن ملکوں نے عربی زبان اختیار کی وہاں معاشری حالت میں کوئی فوری تغیر ہوا اور نہ شہروں کی تعداد و وسعت میں قابل لحاظ اضافہ۔ حکومت اور کسانوں کے تعلقات حسبِ سابق رہے صرف اب کسان زمیندار کا اتنا دست نگر نہیں رہا جتنا کہ پہلے تھا۔ ان ملکوں میں اسلام اور قبل اسلام زمانوں کی طرح زمین کی ملکیت کو وہ اہمیت حاصل نہیں تھی جو ایران میں اس سے وابستہ کی جاتی تھی۔ غالباً اس واقعہ کا نتیجہ تھا کہ عربی دنیا میں ایران کی بہ نسبت تہذیبی ترقی جلد رُک گئی۔ اور عرب قوم کے ذاتی کارنامے زیادہ نمایاں نہیں رہے حال آں کہ ان کے علاقے وحشیوں کے حملوں سے نسبتاً کم پامال ہوئے تھے۔ دسویں صدی عیسوی کے چوتھے دَہے میں خلفاء کا دنیاوی اقتدار عرصہ دراز ہوا کہ سلب کر لیا گیا تھا۔ بغداد و ایران دونوں جگہ پہلے تو ایرانی حاکموں اور بعد میں ترک خاندانوں کے زیرِ حکومت ایسا دور شروع ہوا جس کی خصوصیت سوائے انتشار اور تاریکی کے کچھ نہیں تھی۔ بحیثیت ایک بڑے شہر کے بغداد کا زوال گیارھویں صدی عیسوی سے پہلے شروع نہیں ہوا لیکن تیرھویں صدی عیسوی تک اس کی آبادی بہت گھٹ گئی بعض روایتوں کے بموجب ایک سابقہ مضافاتی محلہ اس زمانے میں شہر سے ڈیڑھ میل دُور جا پڑا تھا لیکن اس زمانے میں اُندلس میں بنی اُمیہ اور مصر میں عبیدیین ترقی کے انتہائی زینہ پر پہنچ چکے تھے۔ نویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں قاہرہ کی

شان و شوکت بغداد سے زیادہ ہونی شروع ہوگئی تھی۔ قدیم فسطاط سے کچھ فاصلہ پر شمال میں فاطمیوں نے جو شہر بنایا تھا اس کا نام قاہرہ قرار پایا۔ یہ فسطاط سے چھوٹا تھا۔ گیارھویں صدی عیسوی میں وسعت پا جانے کے بعد بھی اس کا رقبہ ایک مربع میل سے کم تھا گو عرصہ دراز تک فسطاط اور قاہرہ کے درمیان غیر آباد زمین پڑی ہوئی تھی لیکن اس کے باوصف یہ دونوں شہر ایک ہی خیال کیئے جاتے تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی کے سیاحوں نے فاطمی دربار اور تمام ممالک محروسہ کی پوری طرح بڑھی ہوئی مرفہ الحالی، امراء و وزراء کی علوم و فنون کی سرپرستی، کتاب خانوں کے علمی ذخیرے غرض ہر چیز کی شان و شوکت کا مرقع بڑی آب و تاب سے کھینچا ہے۔ لیکن ان سب ترقیوں کے باوجود دسویں صدی عیسوی کے قاہرہ کا اسلامی تہذیب پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ مصر کے ان شیعی خلفاء کا دعویٰ تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہؑ کی اولاد سے ہیں اس لحاظ سے وہ بغداد کے سُنّی خلفاء کے رقیب تھے اس لیئے اُنھوں نے اپنے مُلک کی سرحدوں سے آگے بڑھ کر اپنے عقیدوں کی تبلیغ کرنی شروع کردی۔ فاطمی خلفاء کے مبلغ شیعوں کی ایک شاخ یعنی اسماعیلیوں کے عقیدوں کی تبلیغ کرتے تھے جن کا خیال تھا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلی جانشین صرف سات امام ہوئے ہیں آخری امام اسماعیل تھے جو ابتدائی عباسیوں کے عہد میں گزرے ہیں لیکن شیعیت و اسماعیلیت کے عقائد کی ترتیب و تدوین فاطمیوں کے دربار میں نہیں بلکہ ایران میں ہوئی۔ خود مصر میں شیعوں کی تبلیغ کا کوئی دیرپا اثر نہیں رہا۔ فاطمیین کے زوال کے بعد ہی اہلِ مُلک نے پھر سُنّی عقائد اختیار کرلیئے۔ البتہ شام میں اہل سنت کو پھر صرف فاطمی حاکموں ہی سے معاملہ نہیں کرنا پڑا بلکہ عوام کی مخالفت سے بھی دوچار ہونا پڑا کیوں کہ شام پر نہ صرف فاطمیوں کا قبضہ ہوچکا تھا بلکہ ایران سے بھی وہاں شیعی تبلیغ جاری تھی۔ دینی

علوم میں مصر، شمالی افریقہ اور اُندلس میں کوئی جدید اضافہ نہیں ہوا بل کہ رفتہ رفتہ ان ملکوں کے باشندوں نے مشرقی ایشیا کے ان نظاموں کو اختیار کرلیا جن کے متعلق عرصہ دراز تک یہ خیال قایم رہا کہ اب اُن میں تبدیلی کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ شمالی افریقہ میں مالکی فقہ کا دور دورہ نمایاں طور پر رہا۔ اسلامی دنیا کے اس حصہ کے تہذیبی اور تمدنی انحطاط کا سبب بہت سے عالموں نے اسی واقعہ کو بتایا ہے۔ کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ اس فقہ میں ارتقائی منازل طے کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ قاہرہ میں فاطمی خلفاء کے حکم سے رصدگاہیں تعمیر ہوئیں، زیجیں تیار ہوئیں۔ لیکن اس دور میں علم ہیئت کے جو مشاہدے اور حسابات تکمیل کو پہنچے وہ سب کے سب درحقیقت ایران ہی میں ہوئے۔ گو تیرھویں صدی عیسوی میں مصری سلطانوں کی فتوحات کی وجہ سے مصر و شام مغلوں کے حملوں سے محفوظ رہے اور ایران تباہ و تاراج ہوا لیکن بایں ہمہ تہذیبی ترقی کے مرکز کی حیثیت سے ایران کی انفرادیت باقی رہی بل کہ اس نے خود مصر پر بھی اپنا اثر ڈالا۔ مصر کے نظم و نسق میں جو عربی اصطلاحیں رائج تھیں ان کی جگہ فارسی مترادفات اسی زمانے میں رائج ہوئے۔ تیرھویں صدی سے پندرھویں صدی تک مصر میں فن عمارت کو غیر معمولی سرگرمی رہی لیکن علمائے فن کی رائے ہے کہ اس میدان میں بھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ، مصر نے ایران پر اتنا اثر نہیں ڈالا جتنا کہ ایران نے مصر پر۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے قبل اسلام زمانوں کی طرح اسلامی زمانے میں بھی مصر دوسرے ملکوں پر فضیلت رکھتا تھا۔ مصر کی خشک آب و ہوا سے متعدد سرکاری دستاویزوں، تاریخوں اور تاریخی جغرافیوں کی تالیفوں کے مخطوطے بڑی حد تک محفوظ رہ گئے ہیں۔ اسی وجہ سے مصری تاریخ کے عالم اپنی تحقیق میں اس عظیم الشان ذخیرہ سے استفادہ کرسکتے ہیں کیوں کہ سوائے مصر کے کسی اور اسلامی ملک کے متعلق اتنا وافر مواد دستیاب نہیں ہوتا لیکن جہاں تک اثر کا تعلق ہے جس طرح

قدیم زمانے میں مصر کو بابل کی برتری ماننی پڑی تھی اسی طرح اب بھی اس کو پہلے بغداد کی اور بعد میں ایران کی فضیلت تسلیم کرنی پڑی علمی تصنیف و تالیف اور ادبی تقلید کے سلسلے میں شام کا بھی یہی رجحان رہا تھا جہاں دسویں صدی عیسوی میں آل حمدان کے دربار میں شاعری کو بہت زور حاصل ہوگیا تھا۔ اس ملک میں قریباً ایک صدی بعد صرف ابو العلاء المعری ایک بدیع الخیال شاعر و جید قنوطی فلسفی گزرا ہے۔ ابتدائی اسلامی زمانے میں اُندلس پر علوم و فنون کی انتہائی ترقی کا ایک دور گزر چکا تھا، اور اُس وقت سے لے کر قرون وسطیٰ کے نصف آخر تک شمالی افریقہ خصوصاً اُندلس میں عربی شاعری اور بعض علوم خاص کر علم تاریخ کا چرچا برابر باقی رہا لیکن ان ادیبوں اور عالموں نے کوئی جدید چیز پیش نہیں کی اور اس لیے انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کی تہذیبی زندگی پر زیادہ اثر نہیں ڈالا۔ بارھویں صدی عیسوی میں ابن رُشد نے اُندلس میں بغدادی دور کے فلسفیوں کی تحقیقوں کو جاری رکھا۔ البتہ اتنا فرق تھا کہ اس نے ارسطو کے اصولوں کو اصلی حالت میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ گو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ افلاطون کے اصولوں کو نو افلاطونیت کی آمیزش سے پاک رکھ سکا ہو۔ فلسفۂ ابن رشد کے عالم مسلمانوں کے مقابلے میں کیتھولکی یورپ میں زیادہ پیدا ہوئے اور اس کی تعلیمات پر جس کفر و الحاد کی بنیاد رکھی گئی تھی اس کے خلاف سنت طامس اکیوناس کو جنگ کرنی پڑی صقلیہ میں اسلامی تہذیب کے کارناموں کا تعلق نصرانی بادشاہوں کے دور سے ہے ۱۱۵۴ء عیسوی میں صقلیہ کے نارمن بادشاہ روجر دوم کے لیئے ایک پوری جماعت نے، جس کا صدر ادریسی تھا، چاندی کا ایک کرۂ (ارض) تیار کیا تھا۔ ادریسی نے ایک اہم جغرافیہ بھی تالیف کیا۔ جہاں تک ایشیائی ممالک کا تعلق ہے اس کتاب کی پوری معلومات دسویں صدی عیسوی کے جغرافیہ نویسوں سے لی گئی تھیں۔

بہت سے اسلامی ملکوں خصوصاً مصر میں سائنس دانوں اور عالموں کو حکومت

مادّی امداد دیتی تھی لیکن ان کے کارناموں کی قدر و منزلت، سرکاری حکام کے کارناموں کے مقابلے میں کم ہوتی تھی۔ ہم اس نتیجہ پر اس لیئے پہنچے ہیں کہ جو رقم اس قسم کے تہذیبی کاموں کے لیئے دی جاتی تھی وہ حکومت کے موازنہ کا ایک ناقابل لحاظ جزو ہوتی تھی۔ اسلامی دنیا میں اور اس سے پہلے رومی سلطنت میں "فصاحت" ہی انسان کی ذہنی قابلیت شمار ہوتی تھی۔

بارھویں صدی عیسوی کا ایک اُندلسی عالم ابن عتاب بیان کرتا ہے کہ بچوں کے لیئے ساٹھ درہم (ڈیڑھ پونڈ) ماہانہ معاوضہ پر ایسا اتالیق مہیا کرنا آسان تھا جو صرف و نحو، عروض، ریاضی، علوم قرآنی اور ادب کا ماہر ہو لیکن اگر وہ فصاحت کے جوہر سے بھی آراستہ ہو تو ایک ہزار درہم ماہانہ معاوضہ دینے پر بھی اس کا راضی ہونا مشکل ہے۔ فاطمی خلیفہ الحاکم نے (۹۹۶ء تا ۱۰۲۱ء) قاہرہ میں جو بیت الحکمت قائم کیا تھا اس کا سالانہ موازنہ صرف دوسو ستاون دینار (ایک سو اٹھائیس پونڈ دس شلنگ) تھا۔ اس میں سے نوے دینار کتابیں نقل کرنے کے کاغذ پر اور سٹھ دینار کتب خانہ دار اور دوسرے ملازموں پر خرچ ہوتے تھے۔

چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں شمالی افریقہ میں ابن خلدون جیسا مدبّر د مورّخ گزرا جس نے بعد کو مصر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس نے اپنی مصنفہ تاریخ پر مشہور مقدمہ میں دراصل مسلمانوں میں فن تاریخ پر بیانیہ طریقہ کی بجائے علمیت کے طریقہ کو رواج دینے اور تاریخی عمل کے قانون کو مقرر و مدوّن کرنے کی پہلی اور آخری کوشش ہے۔ اس کے مفہوم کے اعتبار سے تاریخ ایک "نیا علم" تھا۔ اس کے تمام نظریئے یونانیوں کی تاریخ علمیت سے بالکل جُدا اور جدید تھے۔ یونانیوں کی بہ نسبت اس عرب مورخ کو بہت زیادہ وسیع تاریخی تجربہ حاصل تھا۔ سیاسی ہیئت کی تبدیلی کی بجائے، جو یونانیوں کے پاس اصول اوّلیہ کی حیثیت رکھتی تھی اس نے اپنے نظریہ کی بنیاد معاشی زندگی کی

تبدیلی اور خانہ بدوشانہ زندگی سے متوطن زندگی نیز دیہاتی زندگی سے شہری زندگی کی
تبدیلیوں پر رکھی ۔ اب تک یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ ابن خلدون کے اصولوں پر کن استادوں
اور کن کتابوں کا اثر پڑا تھا۔ قدیم زمانے کے اکثر نظریہ سازوں بل کہ خود ہمارے زمانے
کے نظریہ سازوں کی طرح اُس کے لیئے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے نظریوں کو تاریخی حقائق پر جیسے کہ
وہ واقعتاً تھے منطبق کرسکے اِسی لیئے دیوڈرُوس کی طرح
اس کا مقدمہ گویا ایک معمولی عمارت پر ایک نہایت ہی خوب صورت سامنے کا رُخ تھا۔
مقدمہ سے قطع نظر اس نے وہی عام قسم کی ایک تاریخ لکھی ہے ۔ قرون وسطیٰ کے تمام
مورخوں کی طرح اس نے بھی بعض اوقات اپنے پیشرؤں کی عبارتیں لفظ بہ لفظ نقل
کردی ہیں ۔ یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ وہ پیدائشی عرب ہونے کے باوجود یہ
خیال رکھتا تھا کہ اسلام کے تہذیبی کارنامے بحیثیت مجموعی ہر اسلامی ملک کے اتحاد و
تعاون کا نتیجہ تھا اور یہ کہ وہ سب عربوں کے دوست نہیں تھے۔ ابن خلدون عربوں کو
وحشی اور تمدن کو غارت کرنے والا سمجھتا ہے ۔ بلاشُبہ اس نے اسلامی تہذیب کو بجا طور پر
اسلام سے پہلے کی تمام تہذیبوں کا سرتاج مانا ہے لیکن ساتھ ہی اس نے اس تہذیب کے
انحطاط کے آثار کا بھی اندازہ لگا لیا تھا اور اس کے زوال کی پیشین گوئی کردی تھی ۔ اس کا
خیال تھا کہ سوائے شاعری کے عربوں نے کسی فن میں کامیابی حاصل نہیں کی اور سیاسی
زندگی میں تو انھوں نے کچھ کیا ہی نہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب اہل عرب کوئی شہر
تعمیر کرنے کے لیئے اراضی کا انتخاب کرتے ہیں تو ان کے پیش نظر بدویانہ زندگی کی ضروریات
ہوتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے جن شہروں کی بنیاد رکھی تھی وہ بہت جلد تباہ
ہوگئے ۔ ابن خلدون کو اپنے مادر وطن کی ہم عصر زندگی میں تباہی کے ایسے آثار نظر آتے
ہیں جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ۔ حال آں کہ آغاز اسلام سے اس وقت تک سوائے
بدویوں کے اس پر کبھی دوسری وحشی قوم نے کوئی حملہ نہیں کیا تھا ترکوں اور مغلوں کے

ہاتھوں ایشیائی صوبوں کی تباہی میں اس کو اس سے زیادہ کوئی بات نظر نہیں آتی کہ مخصوص شہروں کی تباہی سے تہذیبی زندگی کو جدید مرکزوں میں منتقل ہونے کا رستہ ملا اور یہ تباہی اسلامی تہذیب کے عام زوال کا سبب نہیں بنی۔

اس کے تھوڑی مدت بعد ہی، تیرھویں صدی عیسوی میں اندلس میں اسلامی تہذیب کی آخری پناہ گاہ غرناطہ کو فاتح نصرانیوں نے مغلوب کر لیا. غرناطہ کی حیثیت ایک چھوٹی سی ریاست کی سی تھی لیکن آخر تک یہاں شاعری کا زور رہا اور یہی وہ مقام ہے جہاں قلعۃ الحمراء تعمیر ہوا جو فن تعمیر کی ایک شاندار یادگار ہے۔ یہ عمارت سنگ سامان تعمیر سے بنائی گئی تھی۔ درباری عمارت کی حیثیت سے مسلمانوں کی تعمیری یادگاروں میں جو عمارتیں ہمارے زمانے تک باقی رہ گئیں ہیں ان میں الحمراء سب سے زیادہ نادر روزگار ہے۔ مورخین فن کی رائے میں اس قصر کی بعض خصوصیتوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اندلس و افریقہ کے فن تعمیر سے اس عمارت کا زیادہ تعلق نہیں ہے بل کہ عام اسلامی روایات خاص کر فلسطینی طرز تعمیر سے اس کا تعلق زیادہ گہرا ہے۔

اس زمانے کے لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ سقوط غرناطہ سے پوری اسلامی دنیا پر ایک کاری ضرب لگی ہے لیکن اس مصیبت کو عربی حب وطن کے نقطہ نظر سے شاید ہی کسی نے دیکھا ہو۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے قرون وسطیٰ کی اسلامی تاریخ کا آخری اہم واقعہ بارھویں صدی عیسوی میں خلفاء بغداد کے دنیوی اقتدار کا دوبارہ قیام تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اسلامی اغراض اور مسلمانوں کی فوجی جدوجہد میں کامل اتحاد و اتفاق تھا۔ بغداد کے باشندوں کو اس میں نہ صرف مسلمانوں کے حاکم اعلیٰ کے اقتدار کی بحالی نظر آتی تھی بل کہ یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ عرب اجنبیوں کے محکوم ہونے سے آزاد ہو گئے ہیں لیکن خلفاء نے قومیت کا علم بلند کرنے اور اس کے نیچے ان تمام ملکوں کو جہاں عربی زبان بولی جاتی تھی جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے عرب

قومیت کے نام پر نہیں بل کہ اسلام کے نام پر سلطان سے اس بات کا مطالبہ کیا کہ وہ اسلامی اقتدار اعلیٰ کے حقوق کو تسلیم کرے۔ دارالخلافہ بغداد کو ۱۲۵۸ عیسوی میں بے دین مغلوں کے تباہ و برباد کرنے سے بہت پہلے عربوں کی عالمی حکومت کا تخیل ختم ہوتا جارہا تھا۔ اس طرح سقوط بغداد کی وجہ سے دنیا کے کسی حصہ میں بھی وہ مسرت و شادمانی نہیں پیدا ہوئی جو کسی وقت نینوا، بابل یا روما کی تباہی کے وقت ہوئی تھی۔

امن اور جنگ کی معیشت

از

امتیاز حسین خاں صاحب

معاشی اور فنی ترقی کے ساتھ ساتھ جنگوں کی نوعیت اور ان کے مسائل بھی بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ موجودہ دور کی جنگوں کے شروع ہوتے ہی بہت سے ایسے پیچیدہ اور دقت طلب مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جن کا مطالعہ کرنا اور جن کے متعلق مشورہ دینا معاشیین کا فرض ہے۔ ان جنگوں کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اثرات سے متحارب اور غیر جانب دار ملکوں کے ہر فرد کی زندگی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ پچھلے زمانہ میں میدان جنگ ہی وہ مقام ہوتا تھا جہاں حریف قوتیں اپنی اپنی قوتِ جسمانی دلیری اور فنِ سپہ گری کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں اور عام لوگوں کی زندگی ان جنگوں سے یا تو بالکل ہی متاثر نہیں ہوتی تھی یا بہت ہی کم۔ گذشتہ صدیوں میں بارہا مرتبہ ہندوستان کی زرخیز زمین "تاراج" کی جا چکی ہے لیکن مختلف اقوام کے حملوں کے وقت یہاں کی پر امن دیہی زندگی بہت کم متاثر ہوتی تھی۔ عوام کی اکثریت اپنی کھیتی باڑی اور دوسرے معمولی کاروبار میں مصروف رہتی اور جنگ کے اثرات کو بالکل محسوس نہیں کرتی تھی۔ اس کے برخلاف جنگ عظیم اور اس سے بھی کہیں زیادہ موجودہ جنگ نے دنیا کی مختلف اقوام کو

یہ تلخ سبق سکھلایا ہے کہ ملک کے تمام افراد ان کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اس وقت گرانی کی وجہ سے ہر ملک کے عوام کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کی طرف صرف اشارہ کر دینا ہی کافی ہے۔

جدید دور میں جنگیں ہر حیثیت سے ہمہ گیر Totalitarian بن چکی ہیں۔ ان میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے فوجی، معاشی اور سیاسی محاذ پر لڑنا پڑتا ہے اور ہر محاذ کی اہمیت کچھ کم نہیں ہے۔ جہاں تک معاشی محاذ کا تعلق ہے ان جنگوں کی نوعیت صنعتی مسئلہ کی سی ہو گئی ہے۔ ان کو جاری رکھنے اور ان میں فتح پانے کے لئے پوری قوم کے تمام معاشی، انسانی اور مالیاتی وسائل کو حرکت پذیر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ موجودہ زمانہ میں جنگیں میدان جنگ میں نہیں بلکہ قومی کارخانوں، کھیتوں اور کانوں وغیرہ میں لڑی جاتی ہیں۔ جنگ کے ذرائع اور وسائل توپیں، دبابے، ہوائی جہاز، جنگی جہاز، بم، تارپیڈو اور اسی قسم کی ہزاروں دوسری چیزیں ہیں۔ جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے قوم کے پاس نہ صرف ان چیزوں کو تیار کرنے کے لئے معاشی وسائل ہونے چاہئیں بلکہ ان وسائل کو جنگی تیاریوں کے سلسلہ میں بروقت اچھی طرح سے استعمال بھی کیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ اقوام کے درمیان قوتِ توازن میں بھی بہت بڑی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ گذشتہ زمانوں میں جنگ میں کامیابی کا انحصار فوجوں کی تعداد اور سپہ سالاروں کی قابلیت اور صلاحیت پر ہوتا تھا جن قوموں کے پاس اچھے لڑنے والے اور ہشیار سپہ سالار ہوتے تھے وہی جنگ میں فتح نصیب رہتی تھیں۔ اب حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کے اندر بعض خاص قسم کی صنعتیں ترقی کر چکی ہوں۔ ان صنعتوں میں دھاتی صنعتیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ دھاتی صنعتوں کی مدد سے فوجوں کے لئے بہتر سے بہتر اسلحہ اور دیگر جنگی سازوسامان کی

فراہمی کی جاسکتی ہے۔ جنگ چین و جاپان میں جاپان کو چینیوں کے خلاف اور موجودہ جنگ میں جرمن فوجوں کو مختلف یورپی اقوام کے خلاف جس تیزی اور آسانی سے کامیابیاں حاصل ہوئیں وہ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ترقی یافتہ صنعتی اقوام کو زرعی اقوام یا صنعتی حیثیت سے کم ترقی یافتہ اقوام پر فوقیت حاصل ہے۔ چینی اور یورپی افواج کسی طرح سے بھی دلیری، بہادری اور تعداد میں اپنے دشمن کے مقابلہ میں کم نہیں تھیں۔ انھیں اسلحہ اور دیگر جنگی ساز و سامان کے معاملہ میں پستی حاصل ہونے کی وجہ سے شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور اپنی قوم اور ملک کے لئے ان کی قربانیاں بالکل ضائع گئیں۔

ایک اور حیثیت سے بھی موجودہ دور کی جنگوں کی نوعیت بدل گئی ہے۔ جنگ عظیم کے وقت تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ میدان جنگ میں سپاہیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد شریک کرنا چاہیئے تاکہ جلد سے جلد دشمن کے خلاف کامیابی حاصل کی جاسکے اس لئے جنگ عظیم کے شروع میں غلطی سے اہم کاموں کے انجام دینے والے مزدور بھی فوجوں میں بھرتی کر لئے گئے تھے۔ اس کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ مختلف متحارب قوموں کو معاشی محاذ پر بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر جنگ کے آخری دور میں حکومتوں نے اپنی غلطی کو محسوس کیا اور اس بات کو مان لیا گیا کہ ایک سپاہی کی مختلف قسم کی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے مختلف کارخانوں اور کھیتوں میں تین مزدوروں کو کام پر لگانا پڑے گا اور یہ مزدور کسی طرح سے سپاہی سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ موجودہ جنگ میں حالات کی تبدیلی کی وجہ سے یہ تناسب اور بھی بڑھ گیا ہے کیونکہ فوجوں کے ساز و سامان اور فوجیوں کی ضروریات میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہوچکا ہے۔ اب بہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ میدان جنگ میں ایک آدمی کو بھیجنے کے لئے کم سے کم پانچ آدمیوں سے معاشی محاذ پر کام لینا پڑ رہا ہے۔

مزدوروں کی تقسیم جنگی اور معاشی محاذ کی اہمیت کے لحاظ سے ہونی چاہیئے۔

جنگ عظیم اپنی نوعیت کی پہلی جنگ تھی جس کے حالات نے قوموں کو معاشی محاذ کی اہمیت کو قبول کرنے پر مجبور کیا۔ جنگ شروع ہونے سے کئی سال پہلے مختلف ممالک کے فوجی ماہرین نے فوجی مہموں کے نقشے بڑی تفصیل سے تیار کئے تھے۔ لیکن ضروریات جنگ کی سربراہی کے لئے ملک کے معاشی وسائل کو کام میں لانے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی۔ فوجی منصوبے تیار تھے معاشی منصوبوں کی تیاری بالکل نظرانداز کردی گئی تھی۔ مختلف ممالک کی حکومتوں نے جنگ میں شرکت تو کرلی تھی لیکن پہلے سے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس کی وجہ سے کون کونسے معاشی مسائل پیدا ہونگے، کن معاشی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور ان کو حل کرنے کے لئے کن ذرائع کو اختیار کرنا چاہیئے۔ اس لاپروائی کی ایک وجہ شاید یہ تھی کہ اس وقت عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جنگ کے مالیاتی بار کی وجہ سے اس کو زیادہ دنوں تک جاری رکھنا ناممکن ہوگا اور چند مہینوں کے اندر فیصلہ اِدھر یا اُدھر ہو جائے گا۔ بعد کے واقعات نے اس خیال کو غلط ثابت کر دکھلایا محض مالیاتی بار کی وجہ سے قوموں کو جنگ جاری رکھنے میں بہت زیادہ دقتیں پیدا نہیں ہوتیں۔ لاپروائی کی دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ اس وقت کی نسلیں معاشیات جنگ کے نظریہ سے بالکل بے خبر تھیں۔ معاشیات جنگ اور مالیات جنگ کے مختلف مسائل کی طرف اس وقت تک معاشین نے کوئی توجہ نہیں کی تھی اس لئے انتظامی عہدہ داروں کی رہنمائی کے لئے معاشی ادب سے کسی قسم کی مدد نہیں مل سکتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشی منصوبہ بندی کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا گیا۔ جنگ کے شروع کے دور میں پیدائش دولت میں اضافہ اور عوام کے صرف میں کمی کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ غذا اور خام اشیاء کے ذخیروں کو ضائع ہونے اور بہتر طریقہ پر کام میں لانے میں لاپروائی سے کام لیا گیا۔ نگرانی قیمت اور راتب بندی کو اختیار کرنے میں بھی

دیر کی گئی۔ تجارت خارجہ پر تسلط اور نگرانی تبادلہ کی طرف بھی بہت کم توجہ کی گئی۔ ذرائع نقل وحمل پر بھی تسلط قائم کرنے کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا گیا مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ شروع شروع میں امن کی معیشت کو جنگی معیشت میں تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا اور جنگ اپنے آخری دور میں داخل ہوئی تو حکومتوں کو بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور انھوں نے مجبور ہو کر معاشی نظام کو جنگی معیشت میں تبدیل کرنے کے لئے مختلف ذرائع اختیار کیے۔ پیدائش دولت اور صرف دولت پر نگرانی قائم کی گئی۔ نگرانی قیمت اور راتب بندی کے طریقوں کو اختیار کیا گیا۔ تجارت خارجہ، مبادلات خارجہ اور ذرائع نقل وحمل پر تسلط اس غرض سے قائم کیا گیا تاکہ جنگی مقاصد زیادہ آسانی سے پورے کیے جاسکیں۔

موجودہ جنگ میں شروع ہی سے معاشی محاذ کی اہمیت کو قبول کر لیا گیا ہے۔ ہر ملک میں فوجی منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ معاشی منصوبہ بندی کو بھی اختیار کیا گیا ہے۔ گذشتہ جنگ کے تجربات سے اس جنگ کے معاشی مسائل کو حل کرنے میں بہت بڑی مدد مل رہی ہے۔ جنگ چھڑنے سے بہت پہلے بین الاقوامی سیاست میں بہت سے ایسے واقعات رونما ہو چکے تھے جنھوں نے مختلف اقوام کو جنگی تیاریاں کرنے پر مجبور کیا تھا اور بعض ممالک میں تو جنگی ساز وسامان کی تیاری اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ جنگ شروع ہونے کے بعد قومی معیشت میں کچھ زیادہ تبدیلی کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس سلسلہ میں اتحادی اور محوری دول میں بڑا فرق پایا جاتا تھا۔ جرمن، اٹلی اور جاپان جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی جنگ کے لیے پوری طرح سے تیار ہو چکے تھے۔ انگلستان اور فرانس میں جنگ سے ایک سال پہلے جنگ کے سلسلہ میں کچھ تھوڑے بہت ذرائع ضرور اختیار کیے گئے تھے لیکن پوری توجہ جنگ کے بعد کی گئی۔ اس مرتبہ ان ملکوں نے بھی پچھلی جنگ کی غلطی کو نہیں دہرایا اور شروع ہی سے

معاشی منصوبے تیار کر لیے گئے اور ان پر فوراً عمل بھی شروع کر دیا گیا۔ امریکہ نے ۱۹۴۰ء سے جنگی تیاریوں کی طرف قدم بڑھایا۔

مختلف متحارب ممالک کی جنگی تیاریوں کا مختصراً تذکرہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جرمنی نے پچھلی جنگ میں شکست کا بدلہ لینے کی غرض سے صلح کے فوراً بعد خفیہ طور پر جنگی تیاریاں شروع کر دی تھیں ان میں مزید اضافہ نازی جماعت کے برسر اقتدار آنے کے بعد ہوا۔ بے روزگاری کو دور کرنے کے لئے لاکھوں مزدوروں کی کھپت مختلف قسم کے جنگی کاموں میں کی گئی۔ ۱۹۳۶ء میں چار سالہ معاشی منصوبے کا اعلان کر کے قوم کے تمام معاشی وسائل پر گورنگ کو اقتدار دیدیا گیا کہ وہ جس طرح بھی چاہے ان کو کام میں لا کر چار سال کے مختصر عرصہ میں قوم کو جنگ کے لئے تیار کرے۔ اس منصوبے کے تحت قومی معیشت کی نئی تنظیم فوجی ماہرین کی نگرانی میں کی گئی۔ اسی لئے جنگ چھڑ جانے کے بعد معاشی نظام میں جنگی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ زیادہ تبدیلیاں نہیں کرنی پڑیں۔ یہی حال جرمنی کے دوسرے دو ساتھی اٹلی اور جاپان کا بھی تھا۔ جاپان عالمی جنگ شروع ہونے سے دو سال پہلے سے چین سے برسرپیکار تھا اور اپنے نظام کو اس کے لئے تیار کر چکا تھا۔ اٹلی نے جب سے حبشہ کے خلاف، اعلان جنگ کیا تھا اور اس کے بعد اسپین کی خانہ جنگی میں عملی طور پر حصہ لیا تو اس کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی گئی کہ وہ اپنی معیشت کی تنظیم جنگی اساس پر کرے۔ اٹلی کی معیشت میں جنگی نقطہ نظر سے جو چند خامیاں پائی جاتی تھیں ان کو موجودہ جنگ کے شروع کے چند مہینوں میں بظاہر غیر جانبدار رہ کر دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح سے محوری دول جنگ شروع ہونے سے بہت پہلے ہر طرح سے جنگی تیاریاں کر چکی تھیں اور ان کی صنعتوں کی پیداوار جنگ کے شروع کے سالوں میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے شروع کے دور میں انھیں اتحادیوں کے

خلاف کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں۔ اب ان کی صنعتوں کی پیداوار انحطاط پر ہے اور معیشت میں تھکن کے آثار نمودار ہو چکے ہیں۔

محوری اقوام کے مقابلہ میں اتحادی ممالک امن برقرار رکھنے کی امید میں جنگی تیاریوں سے غافل رہے اور سوائے چند غیر اہم کوششوں کے صحیح معنی میں ان کی طرف توجہ جنگ شروع ہونے کے بعد کی گئی۔ اس غفلت کا خمیازہ انھیں ان ہزیمتوں اور مصائب کی شکل میں بھگتنا پڑا جو انھیں جنگ کے شروع کے سالوں میں اٹھانی پڑیں۔ جمہوری ممالک میں ویسے بھی پر امن معیشت کو جنگی معیشت میں تبدیل کرنے میں بہت سی دقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ان دقتوں کے باوجود انگلستان میں بہت جلد اہم ذرائع اختیار کر لئے گئے اور تین سال کے عرصہ میں قومی معیشت کی ہیئت بدل دی گئی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی آنکھیں پرل ہاربر کے واقعہ کے بعد کھلیں اور پوری قوم میں محوریوں کے خلاف نفرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ قوم کی صلاحیتیں اور قابلیتیں جنگی تیاریوں کی طرف موڑ دی گئیں۔ انگلستان اور امریکہ کی صنعتوں کی پیداوار اپنے شباب پر ہے اسی لئے اتحادیوں کا پلہ بھاری ہو گیا ہے اور انھیں جنگ میں فتح کا یقین ہو چلا ہے۔

جنگی معیشت اور امن کی معیشت میں بہت بڑا اور بنیادی فرق پایا جاتا ہے زمانۂ امن میں تمام معاشی جد و جہد کا مقصد عام لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کرنا اور ان کی مادی خوشحالی اور آزائشوں میں اضافہ کرنا ہوتا یا کم سے کم ہونا چاہیئے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں خانگی اہتمام کے تحت عوام کی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے زیادہ سے زیادہ مقدار میں چیزیں تیار کی جاتی اور زیادہ سے زیادہ خدمات انجام پاتی ہیں۔ اس نظام کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مختلف مسائل کو حل کرنے کی غرض سے اہم معاشی فیصلے کرنا افراد پر چھوڑ دیا جاتا

کیا چیز پیدا کی جائے کس مقدار میں کس طرح سے اور کب پیدا کی جائے ان تمام باتوں کا تصفیہ آجر طبقہ کو کرنا پڑتا ہے ۔حکومت کی طرف سے معاشی معاملات میں کم سے کم مداخلت کی جاتی ہے ۔پورے نظام کو چلانے والا محرک ذاتی منافع ہوتا ہے ۔منافع کمانے کی خاطر آجر طبقہ مختلف قسم کے فیصلے کرتا اور ان پر عمل پیرا ہوتا ہے ۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سرمایہ داری کے نظام میں بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں ۔ اس میں بہت سے معاشی اور انسانی وسائل ضائع جاتے ہیں ۔ انسانی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو پوری طرح سے ترقی کرنے کا موقعہ نہیں ملتا ۔بہت سے لوگ بے روزگار رہتے اور انھیں فاقوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ان خامیوں کے باوجود اس نظام نے پچھلی دو صدیوں میں بہت زیادہ ترقی کی اور دنیا کے (صرف ایک ملک کو چھوڑکر) تمام ملکوں میں اسی کی کوئی نہ کوئی شکل رائج ہے ۔

جنگ کے شروع ہوتے ہی معاشرہ پر جہاں اور بہت سی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں ان کے ساتھ ساتھ بڑی حد تک معاشی آزادی بھی سلب کرلی جاتی ہے اور قومی معیشت میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ۔جنگی معیشت منصوبی معیشت ہوتی ہے جس میں افراد کے بجائے حکومت معاشی فیصلے کرتی ہے ۔منصوبی معیشت کے لئے ایک مرکزی مقصد کا تعین بہت ضروری ہے اور اسی مقصد کے حصول کے لئے مختلف منصوبے تیار کئے جاتے ہیں ۔سرمایہ داری میں امن کے دنوں میں کسی مرکزی مقصد کا تعین کرنا بہت مشکل ہے اسی لئے منصوبی معیشت کو اختیار نہیں کیا جاسکتا ۔البتہ جنگ کے حالات مقصد کا تعین کر دیتے ہیں ۔ قوم کا متفقہ مقصد دشمن کے خلاف کامیابی حاصل کرنا ہوتا ہے ۔اس اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے معاشی منصوبے تیار کئے جاتے ہیں ۔معاشی معاملات میں حکومت کی مداخلت بڑھ جاتی ہے ۔جمہوری ممالک میں منافع کے محرک اور قیمتوں کے نظام کو قطعی طور پر ختم نہیں کیا جاسکتا پھر بھی حکومت اکثر معاملات میں اپنے

ملک کے باشندوں اور ان کی املاک پر جبری طریقہ کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔
ملک میں جیساکہ ایک انگریز معاشی کا خیال ہے محاصری معیشت Seige Economy قائم کرنی پڑتی ہے۔ ہر ممکنہ ذریعہ کو اختیار کرکے جنگی ضروریات پوری کرنے والی اشیاء کی زیادہ سے زیادہ مقداریں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایسی تدابیر بھی اختیار کی جاتی ہیں کہ لوگ اپنے صرف میں جہاں تک ہو سکے کمی کریں تاکہ معاشی وسائل کی زیادہ سے زیادہ مقداریں دشمن کے خلاف کامیابی حاصل کرنے میں استعمال کی جا سکیں جنگی معیشت کا مقصد اپنے ملک کے لوگوں کا معیار زندگی کم کرنا ہوتا ہے تاکہ اشیاء صرف کے بجائے زیادہ سے زیادہ توپیں، بندوقیں، ہوائی جہاز، جنگی جہاز، آبدوزکشتیاں، دبابے وغیرہ تیار کیے جا سکیں جن کی مدد سے زیادہ سے زیادہ انسانی جانیں تلف کی جائیں۔ یہ ایک بہت ہی تکلیف دہ فرض ہے لیکن مجبوراً قوموں کو اسے انجام دینا پڑتا ہے۔

جنگی معیشت اور امن کی معیشت میں بین فرق صرف مقصد کی حد تک پایا جاتا ہے۔ جہاں تک معاشیات کے اٹل اور بنیادی قوانین اور اصول کا تعلق ہے ان کا اطلاق جنگ کے زمانہ میں بھی اسی طرح سے ہوتا ہے جس طرح سے کہ زمانۂ امن میں۔ بلکہ بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی صحت اور اہمیت جنگ کے دوران میں اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ معاشیات میں غیر محدود انسانی احتیاجات اور ان کو رفع کرنے کے محدود ذرائع اور وسائل سے بحث کی جاتی ہے۔ ہر شخص چاہے وہ امیر ہو یا غریب اپنی ہر ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ اور مجبوراً اسے اپنی احتیاجات میں انتخاب سے کام لینا پڑتا ہے اور انھیں اہمیت کے لحاظ سے ایک خاص ترتیب دینی پڑتی ہے۔ سب سے اہم احتیاجات پہلے رفع کی جاتی ہیں اور کم اہم احتیاجات بعد میں۔ وسائل کی کمی کی وجہ سے بہت سی ضروریات کی تکمیل کو ترک کر دینا پڑتا ہے۔ معاشیات کے

اس بنیادی اصول کی صحت جنگ کے زمانہ میں اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ جس طرح سے افراد کے پاس وسائل رفع احتیاج محدود ہیں اسی طرح سے اقوام کے پاس بھی معاشی وسائل ناکافی ہوتے ہیں اور اقوام کو بھی انتخاب سے کام لینا پڑتا ہے۔ امن کے دنوں میں چونکہ صارفوں کی ضروریات کا پورا کرنا سب سے زیادہ اہم مقصد ہوتا ہے اس لئے معاشی وسائل کا بڑا حصہ اشیاء صرف کی تیاری پر لگایا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف جنگ کے دوران میں دشمن کے خلاف کامیابی حاصل کرنا قوم کا متفقہ اہم مقصد قرار دیا جاتا ہے اس لئے زیادہ تر وسائل اسی مقصد کے حصول پر صرف کیے جاتے ہیں۔ ایسا کرنا ناممکن ہے کہ عوام کی ضروریات بھی اسی طرح پوری کی جاسکیں جس طرح سے کہ زمانۂ امن میں پوری کی جاتی تھیں اور دشمن کے خلاف کامیابی بھی حاصل کی جاسکے۔ گورنگ کے اگر الفاظ استعمال کیے جائیں تو کہا جاسکتا ہے کہ یا تو مکھن تیار کیا جاسکتا ہے یا پھر توپیں۔ وقت واحد میں توپیں اور مکھن دونوں کا تیار کرنا ناممکن ہے۔ جنگ کے دوران میں توپیں جیسی چیزیں زیادہ سے زیادہ تعداد اور مقدار میں تیار کی جاتی ہیں۔

اصول معاشیات کی کتابوں میں یہ بھی بتلایا جاتا ہے کہ جدید معاشرہ کی بنیادیں تقسیم عمل کے اصول پر قائم ہیں۔ ہر فرد اور معاشرہ کا اس میں فائدہ ہے کہ اشیاء ایسے علاقوں میں پیدا اور تیار کی جائیں جہاں ان کی تیاری میں کم سے کم عاملین پیدائش صرف ہوں اور وہ سستی سے سستی تیار کی جاسکیں۔ کاروبار کا پیمانہ بھی موزوں ترین ہونا چاہیئے جس سے مراد یہ ہے کہ کارخانے ایسے ہوں جن میں چیزوں کے مصارف پیدائش کم سے کم ہوں۔ معاشیین کے ان بتلائے ہوئے اصولوں پر مقابلہ کے حالات میں امن کے دنوں میں بڑی حد تک عمل ہوتا ہے لیکن جنگ کے زمانہ میں ان کو اختیار کرنے کی اور بھی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ قومی معیشت کی نئی تنظیم کے سلسلہ میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ جماعت کے ہر فرد اور دوسرے عاملین پیدائش سے ان کی

صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے۔ اور ایسے کاموں پر انھیں لگایا جائے جس کے لئے وہ موزوں ترین ہیں۔ پیدائش دولت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کی خاطر عقلی تنظیم Rationalisation کی پالیسی اختیار کی جاتی ہے۔ کاروبار کے چھوٹے چھوٹے پیمانوں کو ختم کرکے حکومت کی طرف سے موزوں ترین پیمانے قائم کیے جاتے ہیں۔ ان مختلف طریقوں کو اختیار کر کے قوم کی قوت پیدا آوری بڑھائی جاتی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کی جاسکے۔

معاشیات کے اٹل قوانین کا اطلاق ہر ملک، ہر زمانہ اور ہر قسم کے معاشی نظام پر ہوتا ہے۔ البتہ جنگ کے پیدا کردہ حالات میں بعض ضمنی معاشی تخیلات میں تبدیلی کی ضرورت پڑتی ہے۔ سرمایہ داری اور معاشی انفرادیت کی حمایت کرنے والے ماہرین معاشیات معاشی معاملات میں حکومت کی مداخلت کو مضر خیال کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں ذاتی منافع کا محرک اور آزاد مقابلہ کے حالات معاشرہ کے لئے بہترین نتائج پیدا کرسکتے ہیں اور اسی لئے وہ معاشی منصوبہ بندی کے سخت مخالف ہیں۔ جنگ کے دوران میں یہ لوگ بھی اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ حکومتی تسلط اور معاشی منصوبہ بندی کے بغیر جنگ میں کامیابی حاصل کرنا بالکل ناممکن ہے۔ اس وقت مختلف متحارب ممالک کے معاشیین اپنے قول اور فعل کے ذریعہ حکومتی تسلط قائم کرنے میں بہت بڑی مدد دے رہے ہیں۔ اسی طرح سے بجا طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے سرمایہ داری کے نظام میں بہت کم ایسے مواقع آتے ہیں جبکہ معاشرہ میں کامل روزگار کے حالات پیدا ہوں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ ۵ اور ۱۰ فیصد اشخاص ہمیشہ بیکار رہتے ہیں۔ اس کی تشریح اس طرح سے کی جاتی ہے کہ معاشرہ تغیر پذیر ہے، آبادی، مذاق، سرمایہ اور اسی قسم کی دوسری چیزوں میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ حکومتوں کا یہ فرض بتلایا جاتا ہے کہ وہ بیروزگاری کو دور کرنے کے لئے مختلف ذرائع اختیار کریں۔ جنگ حالات کو بدل دیتی ہے۔ فوجوں میں

بھرتی اور جنگی ضروریات کی چیزوں کی تیاری کی وجہ سے محنت کی طلب بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے اور بہت جلد ایسا وقت آتا ہے جبکہ محنت کی سب سے زیادہ قلت محسوس کی جاتی ہے۔ حکومتوں کے لئے یہ اہم مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ کس طرح سے اس قلت کو دور کیا جائے۔ صنعتوں کی نئی تنظیم کی جاتی ہے اور مزدوروں سے زیادہ بہتر طریقہ پر کام لیا جاتا ہے۔ ان کے اوقات کار میں اضافہ ہو جاتا ہے محنت کی مقدار بڑھانے کی غرض سے بوڑھے، عورتیں اور بچے بھی کام پر لگا دیے جاتے ہیں۔ متحارب ممالک میں اس وقت جرمنی ایک ایسا ملک ہے جہاں مزدوروں کی بہت زیادہ کمی محسوس کی جارہی ہے اور اس کمی کو یورپ کے دوسرے مفتوحہ اور مقبوضہ ممالک کے مزدوروں کو لاکر دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس وقت دوسرے ممالک کے ۷۰ لاکھ مزدور جرمن صنعتوں اور کھیتوں میں کام کر رہے ہیں۔

زمانۂ امن میں دوسرے ممالک سے اشیاء اور خدمات کی درآمد بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھی جاتی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ درآمد شدہ مال ملکی مال کا مقابلہ کرتا ہے جس کی وجہ سے دیسی صنعتوں کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ حکومتوں کی طرف سے مختلف ذرائع اختیار کرکے برابر یہ کوشش کی جاتی ہے کہ بیرونی مال کی کم سے کم درآمد ہو۔ جنگ کے دنوں میں یہ خیال بھی غلط ثابت ہوتا ہے۔ حکومتیں یہ چاہتی ہیں کہ جہاں تک ہوسکے انھیں دوسرے ممالک سے جنگی ساز و سامان، اسلحہ وغیرہ مل سکیں بشرطیکہ انھیں ان کے بدلے میں جنگ کے دوران اپنی اشیاء اور خدمات نہ دینی پڑیں۔ اسی لئے تمسکات فروخت کرکے یا دوسرے ممالک سے قرضے حاصل کرکے اشیاء کی درآمد کی جاتی ہے۔ ایسا کرنے سے دوسرے ممالک کے وسائل بھی جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ جنگ کے حالات برآمد کے متعلق بھی خیالات میں تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔ معمولی حالات میں ممالک کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ

مال دوسرے ممالک والوں کے ہاتھ فروخت کریں اور اس طرح سے اپنے یہاں کے مزدوروں کے لئے روزگار کے بہتر مواقع فراہم کریں۔ جنگ کے زمانہ میں برآمد کرنا اتنا زیادہ ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ برآمد کرنے کی وجہ سے بہت سے ایسے ملکی وسائل جو جنگ میں استعمال کیے جاسکتے ہیں برآمد کی شکل میں دوسرے ممالک کو منتقل کرنا پڑیں گے اس لئے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ صرف ایسی چیزیں برآمد کی جائیں جن کا مساعی جنگ پر برا اثر نہ پڑے یا پھر دوسرے ممالک سے ضروری اشیاء جنگ کی خریداری کے سلسلہ میں بعض چیزیں برآمد کرنی پڑتی ہیں جس طرح سے درآمد کو حکومت اپنے کنٹرول میں رکھتی ہے اسی طرح برآمد پر بھی تسلط قائم کیا جاتا ہے۔ معاشیات کی کتابوں میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ درآمد کی ادائی برآمد کے ذریعہ سے کی جاتی ہے۔ جب جنگ نہ ہو تو حکومتیں اور اقوام یہ چاہتی ہیں کہ درآمد کے بدلہ میں زیادہ سے زیادہ برآمد شدہ اشیاء فروخت کی جائیں۔ جنگ میں کم سے کم برآمد کے بدلے میں زیادہ سے زیادہ درآمد حاصل کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ اسی طرح سے معاشیین یہ بھی کہتے ہیں کہ معمولی حالات میں لوگوں کو اپنی آمدنی کے بڑے حصہ کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے صرف کرنا چاہیئے۔ زیادہ صرف کی وجہ سے مختلف چیزوں کی مانگ بڑھتی ہے اور مانگ کے بڑھنے کا اثر چیزوں کی قیمتوں پر پڑتا ہے۔ زیادہ قیمت کی لالچ میں آجر طبقہ پیدائش دولت میں اضافہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ عاملین پیدائش کی زیادہ مقداریں کام پر لگائی جاتی ہیں اور لوگوں کی آمدنیاں بڑھ جاتی ہیں اور وہ اپنے صرف میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ اس طرح سے معاشرہ میں خوش حالی کا دور دورہ قائم ہو جاتا ہے۔ زمانہ امن میں لوگوں کے صرف پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ جنگ کے دنوں میں یہی معاشیین صرف میں زیادہ سے زیادہ کمی اور اور بچت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کو اہمیت دیتے ہیں تاکہ وسائل جنگی ضروریات پورے کرنے کے کام میں لائے جاسکیں۔

جنگ کے لئے وسائل حاصل کرنے کی غرض سے معاشی جد وجہد پر مختلف قسم کی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں اور آزاد معیشت کے بجائے پابند معیشت قائم کی جاتی ہے۔ حکومت ہند نے بھی دوسری حکومتوں کی طرح بعض کنٹرول قائم کئے ہیں۔ لیکن حکومت کے ارادہ اور نیت میں نیک نیتی اور پختگی نہیں پائی جاتی تھی۔ بعض دوسرے اسباب بھی ہیں جن کی وجہ سے حکومت ہند کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حالات بہت زیادہ ابتر ہوتے چلے گئے اور اشیاء کی موجودہ قلت وگرانی نے ملک کے طول و عرض میں مصائب کا ایک طوفان برپا کر دیا جس کی بدترین مثال بنگال کے حالات سے ملتی ہے۔ چار سال کے جنگی حالات نے بالآخر حکومت کو مجبور کیا کہ وہ ان کو بہتر بنانے کی طرف متوجہ ہو۔ پچھلے چند مہینوں میں بہت سے ذرائع اختیار کیے گئے ہیں جن میں سے چند کا تذکرہ کرنا مفید ہوگا۔ زائد منافع پر محصول کی شرح بڑھا کر ۹۳ فیصد مقرر کی گئی ہے۔ سرمایہ کاری پر تسلط قائم کرنے کی غرض سے ہنگامی قانون جاری ہوا ہے۔ سونے، روئی اور روغنی تخم کے بیش بیوپار کو روک دیا گیا ہے۔ کپڑے اور سوت پر تسلط قائم کیا گیا ہے۔ شکر، دواؤں اور گھڑیوں کی قیمتوں کو بڑھنے سے روکنے کی کوشش کی گئی ہے اور سب سے اہم یہ کہ نفع اندوزی اور ذخیرہ بازی کے خلاف قوانین پاس کیے گئے ہیں۔

معاشی پابندیوں کو عائد کرنے اور ان کو کامیاب بنانے کے لئے ملک میں بعض خاص حالات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ ایسے ممالک میں ان پابندیوں کے قائم کرنے میں بہت زیادہ کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے جو معاشی حیثیت سے بہت کافی ترقی کر چکے ہوں، حکومت اور عوام کے درمیان اعتماد اور تعاون پایا جائے اور انتظامی معاملات میں ہم آہنگی اور انتظام کرنے والوں میں صلاحیت اور قابلیت ہو۔ ہندوستان کی جنگی معیشت کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ

ہندوستان کے موجودہ حالات کے تحت معاشی پابندیوں میں کامیابی حاصل کرنے کے بہت کم امکانات پائے جاتے ہیں۔

معاشی حیثیت سے ہمارا ملک دوسری صنعتی اقوام کے مقابلے میں بہت ہی پیچھے ہے۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ ہماری زرعی اور صنعتی پیداوار دوسرے ممالک کے مقابلے میں بہت کم ہے اور خود ہماری ضروریات کے لئے ناکافی ہوتی تھی۔ معاشی وسائل کی کسی طرح سے کمی نہیں اسی لئے ہندوستان کی زرخیزی کا چرچا چار دانگ عالم ہے لیکن اس کے باوجود یہاں کی غربت بھی دنیا بھر میں مشہور ہے۔ صنعتی اور زرعی ترقی کے لئے کلیدی صنعتوں کا وجود بہت ضروری ہے نہ تو یہاں بھاری کیمیاوی صنعتیں اور نہ انجینئرنگ صنعتیں پائی جاتی ۔ جہاز سازی، موٹر سازی اور ریل کے انجن تیار کرنے کا بھی انتظام نہیں ہے۔ بامہارت محنت کی قلت پائی جاتی ہے مشینوں اور اوزاروں کے لئے ہم دوسروں کے محتاج ہیں۔ ان تمام حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری قومی آمدنی اور فی کس آمدنی بہت کم ہے صنعتی ترقی کے لئے حکومت کی طرف سے کوئی خاص کوشش بھی نہیں کی گئی ــ اور نہ ایسے مواقع فراہم کیے گئے جن کی وجہ سے صنعتی ترقی کرنے میں مدد ملتی۔ یہاں کی معیشت میں ان تمام خامیوں کے باوجود ہندوستان پر نہ صرف اپنے دفاع کی ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں بلکہ اسے مشرقی محاذ کے لئے رسد کا اہم ترین مرکز بھی قرار دیا گیا ہے۔ حال میں جنوب مشرقی ایشیائی کمان کے قیام نے ہندوستان کی ذمہ داریوں کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ بہت زیادہ معاشی وسائل جنگی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے حاصل کیے جا رہے ہیں جس کا نتیجہ ملک میں موجودہ قلت اور گرانی کے حالات ہیں۔ ہندوستانی معیشت کو جنگی معیشت میں تبدیل کرنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس کی خامیوں کو پہلے دور کیا جائے اور جہاں تک ہوسکے یہاں کے

وسائل کو کام میں لاکر پیدائش دولت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ ملک میں جنگی حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت پیدا ہوسکے۔ افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک پیدائش دولت میں اضافہ کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی ہے اور نہ ایسے ذرائع اختیار کیے گئے ہیں جن کی مدد سے مقصد کے حصول میں آسانی ہو۔

معاشی پابندیوں کو کامیاب بنانے کی دوسری لازمی شرط یہ ہے کہ حکومت کو عوام کا اعتماد اور تعاون حاصل ہو۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں یہ بات بھی نہیں پائی جاتی۔ دوسرے ممالک خاص طور پر جمہوری ممالک میں عوام حکومت کو اپنی حکومت تصور کرتے ہیں اسی لئے کنٹرول کو کامیاب بنانے کے لئے کچھ بہت زیادہ قوانین پاس کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لوگ جانتے ہیں کہ حکومت قومی مفاد کی خاطر مختلف قسم کے ذرائع اختیار کرنے پر مجبور ہوئی ہے حکومت کی ہر قسم کی مدد کرنا اور اس کا ہر طرح سے ہاتھ بٹانا ان کا قومی فرض ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستانی عوام میں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ موجودہ مرکزی حکومت میں ان کے نمائندے شامل نہیں ہیں۔ ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کو اس کی سخت شکایت ہے کہ ان کے مشورہ کے بغیر ہندوستانی قوم کو جنگ میں شریک کر دیا گیا ہے۔ حکومت کو ملک کی دو سب سے بڑی اور اہم سیاسی جماعتوں کا تعاون حاصل نہیں ہے۔ یہ تو رہا مرکزی حکومت کا حال۔ اکثر صوبجات میں دستور معطل ہے اور گورنر اپنے مشیروں کے ذریعہ سے حکومت کے کاروبار چلا رہے ہیں۔ جن صوبوں میں وزارتیں قائم ہیں وہاں بھی گورنروں نے اپنے اقتدارات اور اختیارات کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے اور وزارت کو معاشی مسائل کے حل کرنے میں پوری پوری آزادی حاصل نہیں ہے۔ کاروباری

طبقہ کی امداد حکومت کو اس حد تک حاصل ہے جب تک وہ اپنا مالی فائدہ دیکھتا ہے۔ عوام کے تعاون اور امداد نہ ہونے کی وجہ سے حکومت ہند کو ذاتی فائدہ کا لالچ دلا کر کام لینا پڑ رہا ہے اور پابندیوں کو کامیاب بنانے کے لئے قوت استعمال کرنی پڑ رہی ہے۔ جنگ کے غیر معمولی حالات میں قوت اتنی زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتی جتنی کہ قوم کی خوشی سے امداد اور تعاون۔

ہندوستان کی جنگی معیشت کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ کنٹرول قائم کرنے کے لئے پہلے سے کوئی باقاعدہ اور جامع پروگرام تیار نہیں کیا گیا تھا۔ امن کی معیشت کو جنگی معیشت میں تبدیل کرنے کے لئے پہلے سے منصوبے تیار کر لینے کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں جیسے جیسے حالات پیدا ہوتے گئے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ذرائع اختیار کیے گئے مثلاً گیہوں کی قیمت پر کنٹرول قائم کرنے کی کوشش کی گئی اور قیمت مقرر کی گئی تھی لیکن گیہوں کے بدل کی قیمتوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری چیزوں کی قیمتیں بڑھنا شروع ہوئیں اور ایک وقت تو ایسا بھی آ گیا تھا جبکہ گیہوں کی قانونی قیمت سے موٹے اناج بازار میں مہنگے تھے۔ انتظامی اکائیوں کی علحدگی نے بھی کنٹرول کو ناکام بنانے میں بڑا حصہ لیا۔ اکثر مواقع پر مرکزی حکومت کی پالیسی سے بہت سی صوبجاتی اور ریاستی حکومتوں کو اختلاف رہا۔ اور مقامی حکومتوں نے خود غرضی سے کام لیکر مرکزی حکومت کی معاشی پالیسی کو ناکام بنانے تک کی کوشش کی۔ حکومت ہند اور حکومت پنجاب اور سندھ کے درمیان قیمتوں کے تعین اور راتب بندی کے سلسلہ میں ابھی حال میں جو اختلاف ہو چکا ہے وہ اس کی بہترین مثال ہوسکتا ہے۔ جنگی حالات نے ہندوستان کی معاشی وحدت کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ معاشی پابندیوں کو کامیاب بنانے کے لئے مختلف انتظامی اکائیوں کی پالیسی میں ہم آہنگی کی سخت ضرورت ہے۔

مرکزی حکومت کو معاشی پالیسی کا تعین کرنا چاہیئے اور مقامی حکومتوں کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ اس پالیسی کے عملی پہلو کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔

ہندوستانی معیشت کی چوتھی بڑی خامی یہ ہے کہ مختلف معاشی مسائل کے متعلق معتبر اور مفید اعداد و شمار جمع نہیں کیے جاتے کنٹرول قائم کرنے اور معاشی منصوبہ بندی کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختلف قسم کے اعداد و شمار معلوم ہوں۔ ہندوستان میں پیدائش دولت صرف دولت، ذرائع نقل وحمل قیمتوں اور قومی آمدنی کے اعداد و شمار ویسے ہی بہت کم ملتے تھے اب جب سے جنگ شروع ہوئی ہے اعداد و شمار کے شائع کرنے میں حکومت کی طرف سے دیر کی جاتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ ایسا قصداً کیا جا رہا ہے تاکہ دشمن کو یہاں کے مساعی جنگ کا علم نہ ہوسکے۔ جو کچھ اعداد و شمار شائع کیے جاتے ہیں ان کی بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ مختلف محکمہ جات کی طرف سے شائع ہوتے ہیں ان میں آپسمیں کسی قسم کا ربط نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اعداد و شمار حاصل کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی جاتی بلکہ ان کی حیثیت محکمہ جات کی ذیلی پیداوار کی سی ہے جنگ کے سلسلہ میں پیدائش دولت اور قومی آمدنی کے اعداد و شمار سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ قومی آمدنی کے اعداد و شمار حاصل کرنے کی حکومت کی طرف سے اب تک کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ صرف چند افراد نے اپنے طور پر مختلف اوقات میں قومی آمدنی کے اندازے لگائے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کے اندازوں میں (مفید ہونے کے باوجود) بہت کافی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ پیدائش دولت کی شماریی کی طرف بھی کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی ہے۔ زرعی پیداوار کے اندازے جن صوبوں میں کیے جاتے ہیں اس کا کام ایسے لوگوں کے سپرد ہے جن کے ذمہ پہلے سے دوسرے انتظامی امور ہیں اس لئے وہ صحیح اندازہ لگانے کی نہ تو کوشش کرتے ہیں اور نہ ان کے پاس اتنا وقت ہے یہی حال

قیمتوں کے نرخ نامے معلوم کرنے کا بھی ہے۔ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں ہر علاقہ کی پیداوار اور وہاں کی ضروریات کے متعلق جب تک صحیح اعداد و شمار نہ ملیں کسی قسم کی معاشی منصوبہ بندی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ اگر حکومت اس طرف بطور خاص توجہ کرے تو بہتر اعداد و شمار حاصل کیے جا سکتے ہیں اور جنگی معیشت کی گتھیاں سلجھانے میں بہت بڑی مدد ملے گی۔

معاشی کنٹرول کو کامیاب بنانے کے لئے آخری شرط یہ ہے کہ ان کا انتظام کرنے والے عہدہ داروں میں صلاحیت اور قابلیت پائی جائے! افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت ہند، صوبجات اور ریاستوں کے حکومتوں کے اکثر عہدہ داروں میں جن کے سپرد انتظامات کیے گئے ہیں ویسی قابلیت اور صلاحیت نہیں جیسی کہ ہونی چاہیئے۔ معاشی کنٹرول کے انتظامی امور ایسے انڈین سیول سروس اور مقامی سیول سروس کے سپرد کیے گئے ہیں جو معاشیات کے علم سے بے بہرہ ہیں۔ یہ عہدہ دار سب سے زیادہ قابل اور مستعد سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی انتظامی قابلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا وہ روز کا دفتری کام بہت خوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔ معاشی مسائل کو سمجھنے کی قابلیت میں یہ حضرات پورے نہیں اترتے۔ معاشی اور انسانی مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کے سلسلہ میں جس قسم کے شعور، پیش قدمی اور موقع شناسی کی ضرورت ہے یہ مستعد اشخاص ناکام رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی غلطیوں اور معاشی کنٹرول کی ناکامیوں کی وجہ سے لوگوں میں بے اعتمادی اور بے چینی بڑھ رہی ہے۔ دوسرے ممالک میں معاشی مسائل اور کنٹرول کو چلانے اور کامیاب بنانے کے لئے ماہرین فن سے اکثر مشورہ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگلستان میں مختلف جامعات کے ماہرین معاشیات حکومت کے مختلف شعبہ جات اور محکمہ جات میں طلب کر لئے گئے ہیں اور عہدہ دار ان کے مشورہ پر عمل کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بدقسمتی سے ماہرین کی پروا نہ کرنا اور

ان کا مذاق اُڑانا انتظامی عہدہ داروں کا ہمیشہ شیوا رہا ہے۔ مشورہ کی غرض سے انگلستان سے بعض ماہرین ضرور بلوائے گئے ہیں۔ دوسرے ممالک کے ماہرین سے اپنی دقتوں کے حل کرنے میں مشورہ کرنے میں کوئی ہرج نہیں لیکن ظاہر ہے کہ وہ اتنا اچھا اور مفید مشورہ نہیں دے سکتے جتنا کہ خود اس ملک کے ماہرین، وہ یہاں کے مقامی اور خصوصی حالات سے بالکل ناواقف ہیں اور اس لئے وہ یہاں کے لوگوں کا اعتماد حاصل نہیں کر سکتے۔

آخر میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی معیشت کو اب تک صحیح معنوں میں جنگی معیشت میں تبدیل نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں جنگ کے چار سال گذرنے کے باوجود اسی قسم کی خامیاں پائی جاتی ہیں جس قسم کی کہ جنگ عظیم کے شروع کے دور میں اکثر یورپی ممالک کی معیشت میں موجود تھیں۔ حکومت کو حالات بہتر بنانے کے لئے موزوں ذرائع جلد سے جلد اختیار کرنا چاہیئے تاکہ بنگال جیسے حالات ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی نمودار نہ ہوں۔

بیورج اسکیم اور ہندوستان

از
محمد عبد القادر صاحب، لکچرار معاشیات، جامعہ عثمانیہ

یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ تاریخ تمدن کے ابتدائی دور میں انسان کے لئے جو سب سے بڑا اور اہم مسئلہ تھا وہ ہنوز مفکرین کے غور و فکر کا باعث بنا ہوا ہے۔ ابتدائی زمانے میں انسان کی زندگی خوف و تشویش کی حالت میں گذرتی تھی، اسے اپنی روزی حاصل کرنے کے سلسلے میں گوناگوں مخالف قوتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور اس امر کا بالکل یقین نہیں ہوتا تھا کہ وہ دوسرے دن غذا حاصل کر سکے گا بھی یا نہیں۔ اسی روزگار کے مسئلے نے موجودہ دور میں بھی بنی نوع انسان کے ایک بڑے حصے کو نفسیاتی اضطراب اور حقیقی پریشانی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ طویل جد و جہد کے بعد حصول معاش میں کامیابی بھی ہو جائے تو ساتھ ہی ساتھ بے روزگار ہونے کا خوف ہمیشہ دامن گیر رہتا ہے۔ نیز بیماری، حادثات، خانگی ذمہ داریوں اور بوڑھاپے کے معاشی مسائل بھی کچھ کم تشویشناک نہیں ہوتے۔ مختلف زمانوں میں ان تمام مسائل کے حل کی تھوڑی بہت کوشش کی گئی لیکن اشتراکی تجاویز یا دیگر مماثل تدابیر کے قطع نظر اس سلسلے میں کسی قسم کی

منظم اور باقاعدہ کوشش نہیں ہوئی۔ اور اب بھی انسانوں کی ایک بڑی تعداد غیر یقینی مستقبل کے خیال سے لرزہ براندام ہے۔

ان دنوں یہ مسئلہ موجودہ جنگ کے مقاصد کے تعین کے سلسلے میں بہت ہی اہم بن گیا ہے۔ یوں تو جنگ کے دوران میں ہر طبقے کے ایثار کی ضرورت ہوتی ہے لیکن مزدور طبقے کو جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی اہمیت کسی طرح بھی نہیں گھٹائی جاسکتی اور اس کے جذبۂ وفاداری و ایثار کا انحصار اس یقین پر ہوتا ہے جو کہ اسے اپنے مستقبل کے متعلق حاصل ہو۔ اس کے قربانیوں کا جو کم از کم صلہ ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے معاشرتی تحفظ نصیب ہو۔

(۱)

انگلستان میں آج سے تقریباً تین سال پہلے یعنے جون ۱۹۴۱ء میں سر ولیم بیورج کا تقرر ایک بین سررشتہ داری کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے ہوا تاکہ وہ معاشرتی بیمہ کے مروجہ اسکیموں کا جائزہ لیں اور اپنی ضروری سفارشات پیش کریں۔ کمیٹی کے تقرر سے کچھ ہی عرصہ کے بعد اراکین کمیٹی کی حیثیت محض مشیروں کی رہ گئی اور سر ولیم کو اپنی ذمہ داری پر رپورٹ پیش کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس کام کے لئے صاحب موصوف کا انتخاب نہایت ہی موزوں تھا۔ آپ کا وسیع تجربۂ نظم و نسق مسلمہ حیثیت رکھتا ہے۔ پچھلی جنگ کے دوران میں آپ وزارت اغذیہ میں معتمدی کی خدمت پر فائز رہے۔ نیز بیمۂ بے روزگاری کی مختلف اسکیموں کے مرتب کرنے میں آپ کا بڑا حصہ رہا ہے۔ آپ لندن اسکول آف اکنامکس کے پروفیسر اور ڈائرکٹر کی حیثیت سے ادارۂ مذکور اور جامعہ لندن کی علمی زندگی میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ "بے روزگاری" کے عنوان سے جو کتاب آپ نے لکھی ہے وہ آپ کے نظری اور عملی معلومات کا نچوڑ ہے۔ ایک اور قابل ذکر چیز یہ ہے کہ آپ کسی ایک

جماعت سے بھی وابستہ ہوئے بغیر ایک آزاد عالم کی زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ آپ نے اپنے کام کے دوران میں اُن تمام معاشرتی تحقیقات Social Surveys سے پورا فائدہ اٹھایا جو اس سے پیشتر انگلستان میں ہو چکی تھیں۔ اور بالآخر اپنی مشہور دستاویز موسومہ Report on Social Insurance and Allied Services پیش کی جو کہ عام طور پر "معاشرتی تحفظ کے خاکے" Plan For social Securit کے نام سے مشہور ہے۔

سر ولیم کی اسکیم تین اہم اصولوں پر مبنی ہے۔ سب سے اول تو اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ اگر ایک طرف تجربات ماضی سے استفادہ کیا جائے تو دوسری طرف اپنے لائحہ عمل کے متعین کرنے میں کامل آزادی رہے یعنی طبقہ واری مفاد سے کہیں زیادہ اجتماعی مفاد کو مقدم سمجھا جائے۔ اسی اصول پر عمل کرنے کا نتیجہ ہے کہ آپ نے بیمہ کو ایک تجارتی کاروبار سے ایک خدمت عامہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ دوسرا اہم اصول جو اختیار کیا گیا وہ یہ ہے کہ معاشرتی بیمہ کو جملہ سماجی امراض کا واحد علاج نہ قرار دیا جائے بلکہ اُسے معاشرتی ترقی کے پروگرام کے ایک حصے کی حیثیت دی جائے۔ تیسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ معاشرتی تحفظ کے مہم میں حکومت اور افراد کے درمیان تعاون ہو۔

موجودہ صورت حال کی رو سے مختلف اغراض کے لئے مختلف بیمے ادا کرنے ہوتے ہیں۔ بیورج نے ان سب کو متحد کرنے کی تجویز کی ہے۔ بے روزگاری، علالت، حادثاتِ مزدوران، یتیمی، بیوگی، بوڑھاپے وغیرہ کی صورت میں ایک مکمل بیمہ اسکیم پیش کی گئی ہے جو کہ آبادی کے طبقات کے لئے لازمی ہوگی۔ ادائیوں کے حسب ذیل ہفتہ واری شرحیں تجویز کی گئی ہیں:—

اجیر	آجر
۴ شلنگ ۳ پنس (مرد کے لئے)	۳ شلنگ ۳ پنس
۳ شلنگ ۲ پنس (عورت کے لئے)	۲ شلنگ ۹ پنس

انتظامی وحدت کے خیال کے پیش نظر معاشرتی تحفظ کی ایک وزارت کی قیام کی بھی سفارش کی گئی ہے جس کے تفویض معاشرتی بیمہ کے جملہ امور ہوں۔

بیورج اسکیم کی ہمہ گیر حیثیت بھی قابل ذکر ہے۔ اس اسکیم کا اطلاق آبادی کے تمام طبقوں پر ہوگا اور سہولت کے خاطر ملک کی آبادی کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) ملازمین (۲) تاجر اور آزاد پیشہ افراد (۳) شادی شدہ عورتیں جو کام کرنے کی عمر کو پہنچ گئی ہوں (۴) کام کرنے کے قابل افراد جو کہ مادی منفعت کے لئے کوئی پیشہ اختیار نہ کرتے ہوں (۵) بچے (۶) بوڑھے — موجودہ اسکیم کی خوبی یہ ہے کہ بہت سارے ایسے طبقے جو کہ پہلے بیمہ اسکیم سے خارج تھے وہ بھی شامل کرلئے گئے ہیں مثلاً متمول افراد سرکاری ملازمین وغیرہ۔

اسکیم میں شرکت کے بعد سماج کے جملہ طبقوں کو متعدد فوائد حاصل ہوں گے۔ موجودہ حالت کے تحت ایک شادی شدہ شخص جس کے دو بچے ہوں بے روزگاری کی صورت میں ۳۸ شلنگ فی ہفتہ پاتا ہے لیکن اس اسکیم کے تحت اُسے ۵۶ شلنگ ملا کریں گے۔ مدت امداد کا کوئی تعین نہیں ہے۔ البتہ ایک مدت کے گذر جانے کے بعد بھی یہ بے روزگاری باقی رہے تو اُسے کسی تربیت گاہ جاکر کوئی کام سیکھنا پڑے گا تا کہ اس کی کھپت کسی اور پیشے میں ہو سکے۔ اسی واحد ادائی کی رو سے ہر شخص مفت طبی امداد کا بھی مستحق ہوگا جس میں حسب ضرورت ماہرین کے ذریعہ

علاج کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ مزدور کو دوران کار میں حادثہ ہونے کی صورت میں مزدور کا علاج ہوگا، جملہ مطالبات کا تصفیہ ایک مجلس کے ذریعہ ہوگا اور اس زمانہ میں اسے پہلے ۱۳ ہفتوں میں جو رقم ادا کی جائے گی وہ بیمۂ بے روزگاری کی مقررہ شرح کے مساوی ہوگی۔ اس کے بعد اس کی اجرت کا دو تہائی حصہ ملتا رہے گا۔ معاوضۂ مزدوران کے سلسلہ میں جو مصارف لاحق ہوں گے ان کا ایک تہائی حصہ مزدوروں اور آجروں کی ادائیوں کے ذریعہ ہوگا اور بقیہ حصہ کے لئے خطرناک صنعتوں پر ایک محصول عائد کیا جائے گا۔

شادی کے مصارف کے سلسلہ میں ۱۰ پونڈ تک امداد کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ زچگی کے سلسلہ میں ۴ پونڈ کا عطیہ اور ۱۳ ہفتوں تک ۳۶ شلنگ فی ہفتہ کے حساب سے امداد ملے گی۔ ۱۶ سال کی عمر تک بچوں کے لئے بھتے بھی مقرر کئے گئے ہیں۔ البتہ پہلے بچے کے لئے کوئی بھتہ نہیں ہوگا۔ بھتہ کی رقم بچوں کی عمر اور تعداد کے لحاظ سے ہوگی۔ نیز تفریق زوجین وغیرہ کی صورت میں عورت کے لئے امداد کا بھی انتظام ہے۔

بعض حلقوں میں اس اسکیم کے مالیاتی پہلو سے متعلق شکوک کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ ملک کے مختلف طبقوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ ایک مشہور معاشی نے ان اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے جو عام طور پر کئے جاتے ہیں۔ اس نے جنگ کے بعد انگلستان کی قومی آمدنی کا اندازہ ۵۲۰۰ تا ۶۵۰۰ ملین پونڈ اور معاشرتی بیمہ کے جملہ مدات پر مصارف کا اندازہ ۶۹۷ ملین پونڈ کیا ہے۔ لیکن چونکہ اس ضمن میں موجودہ مصارف بھی تقریباً ۴۳۲ ملین پونڈ ہوتے ہیں۔ اضافہ صرف ۲۶۵ ملین پونڈ کی حد تک ہوگا۔ معاشرتی بیمہ کی وجہ سے حکومت کو ۸۶ ملین پونڈ، ملازمین کو ۱۲۵ ملین پونڈ اور آجروں کو ۵۴ ملین پونڈ ادا کرنے ہوں گے اسی طرح معاشرتی بیمہ کی اسکیم کی وجہ سے ملک پر مالیاتی بار کچھ زیادہ نہیں ہوگا۔

بیورج اسکیم کی مخالفت دو طبقوں نے کی ہے۔ قدامت پسند طبقہ جو معاشی امور میں حکومت کی بڑھتی ہوئی مداخلت کو گوارا نہیں کرسکتا، اس نے ایسے اعتراضات کئے ہیں جو کچھ زیادہ وزنی نہیں ہیں۔ اشتراکیین کی مخالفت علحدہ وجوہ پر مبنی ہے ان کا خیال ہے کہ امداد کی مقرر کردہ شرحیں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ نیز انھیں خوف ہے کہ کہیں حکومت اسی اسکیم پر اکتفا نہ کرلے اور اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کے بڑھتے ہوئے امراض کا صحیح علاج ملتوی ہوتا جائے۔ یہ اعتراض قابلِ اعتنا ہے اور "بیورج اسکیم" کو اصل علاج تصور کرلینا گویا خود فریبی میں مبتلا ہونا ہے۔ پارلیمنٹ نے اس اسکیم کو اصولی طور پر مان لیا ہے اور شرحوں میں ضروری ردّ و بدل کیا ہے۔

(۲)

ایسی صورت میں جب کہ انگلستان "بیورج اسکیم" کے ذریعہ اور امریکہ معاشرتی تحفظ کے لائحہ عمل کے بدولت اپنے اپنے شہریوں کے فلاح و بہبود کے انتظامات میں مصروف ہے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان اسکیموں کی اہمیت ہندوستان کے مزدور کے لئے کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہاں بے روزگاری، بیماری، بڑھاپے وغیرہ سے متعلق مسائل کا حل کس طرح کیا جائے۔ جنگ نے لاکھوں کے لئے روزگار فراہم کیا ہے، لیکن یہ اندیشہ ہے کہ دوبارہ جنگ کے بعد کہیں ہندوستان کی حالت وہی نہ ہو جائے جو جنگ سے پہلے تھی۔ اس میں کلام نہیں کہ جنگ کے زمانہ میں ہندوستان کی صنعتی ترقی میں اضافہ ہونا رہا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جنگ کے بعد کیا ہوگا۔ ابھی سے تنظیم مابعد جنگ کے مسائل کا صحیح حل نہ دریافت کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ اس وقت ہندوستان کے لئے شدید قسم کی بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑے۔ جنگی معیشت کو امن کی معیشت میں تبدیل کرنے کے سلسلہ میں نہ صرف ہم اپنی آئندہ صنعتی ترقی کے اصول اور تفصیلات پر ابھی سے غور و فکر کرلینا چاہئیے بلکہ ان بے روزگاروں

کے متعلق بھی اپنی پالیسی متعین کرنی چاہیئے جن کی وجہ سے جنگ کے فوراً بعد اور پھر معمولی حالات کے قائم ہو جانے پر بھی وقتاً فوقتاً ہمارے لئے پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے رہیں گے۔ ان حالات کے تحت ابھی سے بیمۂ بے روزگاری کی ترویج کے متعلق ہمیں ایک اسکیم مرتب کر لینی چاہیئے۔ نیز دیگر اہم مسائل مثلاً حادثات کی صورت میں مزدوروں کے لئے معاوضہ، بوڑھوں کے لئے وظائف، زچاؤں کی مالی امداد وغیرہ کے متعلق حکومت کو اپنا طرزِ عمل متعین کر لینا چاہیئے۔ بہت ممکن ہے کہ موجودہ حالات کے تحت سارے ہندوستان کے لئے معاشرتی تحفظ کی اسکیم ناقابلِ عمل ہو لیکن فی الوقت کم از کم بڑے بڑے صنعتی شہروں میں اس کا نفاذ ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں ایسے صنعتی مرکز ہیں جہاں کہ مزدوروں کی مستقل آبادی ہے۔ پارچہ بافی، لوہا، فولاد، سن، کوئلہ جیسی صنعتوں میں کام کرنے والوں کی حیثیت نسبتاً مستقل ہے۔

معاشرتی بیمہ کے ضمن میں حکومت ہند کا سابقہ طرزِ عمل کچھ زیادہ ہمت افزا نہ رہا۔ واشنگٹن کی بین الاقوامی مزدور کانفرنس کے تجاویز پر غور کرنے کے بعد حکومت ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ بیمۂ بے روزگاری کی کوئی اسکیم بھی ہندوستان کے حالات کے تحت ممکن نہیں۔ شاہی مزدور کمیشن نے تقریباً اسی قسم کی رائے ظاہر کی۔ کانگریسی وزارتوں کے زمانہ میں مسٹر گری (جو اس وقت مدراس کے وزیرِ عمال تھے) کی یہ تجویز رہی کہ جنوبی ہند کے پارچہ بافی کے مزدوروں کے لئے جبری بیمہ کی ایک اسکیم ہو لیکن کانگریسی وزارتوں کے ختم ہونے پر یہ تجویز بھی ختم ہو گئی مگر یہ امر باعث اطمینان ہے کہ حال میں حکومتِ ہند نے ایک کمیٹی Labour Investigation Committee مقرر کی ہے جس کے صدر مسٹر ریگے (ڈی۔ ای۔ ایس) اور جس کے اراکین پروفیسر احمد مختار اور پروفیسر ادارکار ہیں۔ اس کمیٹی کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ وہ یہاں کے صنعتی مزدوروں کے مسائل کی تحقیق کرے اور یہ معلوم کرے کہ

کس حد تک "بیورج اسکیم" کا اطلاق ہندوستان پر ہو سکتا ہے۔ امریکہ اور انگلستان میں تو پہلے سے ہی معاشرتی تحفظ کی اسکیمیں موجود ہیں، اب وہاں ان میں صرف وسعت پیدا کرنے کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں اس کام کو از سرِ نو شروع کرنا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مذکورۂ بالا کمیٹی کی رپورٹ سے مزدوروں کے متعلق پالیسی متعین کرنے میں حکومت کو بڑی مدد ملے گی۔

اس ضمن میں بعض اہم امور قابلِ توجہ ہیں جو درج ذیل ہیں:-

بے روزگاری ایک معاشرتی مسئلہ ہے۔ اب یہ ایک خانگی یا انفرادی مسئلہ باقی نہیں رہا۔ دیہی معیشت کا انحطاط، صنعتی نظام کی ترویج، مزدوروں کی شہروں کی طرف منتقلی نے ہندوستان میں ایک مستقل صنعتی مزدوروں کا طبقہ پیدا کر دیا ہے۔ جن کا ایک حصہ وقتاً فوقتاً بے روزگار رہتا ہے۔ جب بے روزگاری گوناگوں معاشری اسباب کا نتیجہ ہے اور اس کی ذمہ داری فرد پر عائد نہیں ہوتی تو سماج کو اس ذمہ داری کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ایسی تدبیریں اختیار کرنی چاہیئے جن کے بدولت ملک کا افلاس دور ہو جائے اور ملک کے کام کرنے والے جملہ خطرات سے محفوظ و مامون اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ قدیم زمانہ میں جب کہ مشترک خاندان کا طریقہ رائج تھا، بے روزگار اور نادار اراکین خاندان کو مشکلات کا سامنا نہیں ہونا تھا، کیونکہ مذکورۂ بالا طریقہ کے تحت ذمہ داری اجتماعی ہوتی تھی۔ اب حالات بدل گئے ہیں یہ کام دوسری ایجنسیوں کو اپنے ہاتھوں میں لینا چاہیئے اور بھلا حکومت سے بڑھ کر کونسی اور ایجنسی ہو سکتی ہے۔

صنعتی مرکزوں کے لئے جبری بیمہ کی ترویج ہو سکتی ہے۔ البتہ ادائیوں اور معاوضوں کی رقم ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے ہونی چاہیئے۔ سوال یہ ہوتا

ہے کہ بیمۂ بے روزگاری کے سلسلہ میں مزدور کی طرف سے کیا ادائی ہوسکتی ہے۔ ڈاکٹر راؤنے قومی آمدنی کے متعلق جو اندازہ ۱۹۳۱ء ۔ ۱۹۳۲ء کے لئے پیش کیا ہے اس کی روسے فی کس سالانہ اوسط ۶۵ روپیہ پڑتا ہے۔ یہاں کے مزدور کی آمدنی کا معیار اتنا پست ہوتا ہے کہ ناگہانی مصیبتوں کے لئے پس اندازی دشوار ہوجاتی ہے صنعتی جھگڑوں کی وجہ سے آمدنی میں مزید تخفیف ہوجاتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۹ء ہڑتالوں اور دربندیوں کی تعداد ۲۲۲۳ رہی جس میں کہ ۲،۶۵۴،۴۶۵ مزدور مبتلا رہے اور ۴۲،۰۴۲،۱۰۸ ایام کار ضائع گئے۔ ان تمام حالات کے تحت مسٹر کمار اپا (جو گرایجوایٹ انسٹی ٹیوٹ آف سوشیل ورک، بمبئی کے ڈائرکٹر ہیں) کی رائے ہے کہ مزدور کی قلیل آمدنی شاید اسے بیمہ فنڈ میں کوئی رقم جمع کرنے کی اجازت نہ دے پس عارضی طور پر بیمہ فنڈ میں رقم جمع کرنے کی ذمہ داری زیادہ تر حکومت اور آجر طبقہ پر ہونی چاہیئے۔

ایک دوسرا مسئلہ مزدوروں کے بیمۂ علالت سے متعلق ہے۔ ۱۹۲۸ء میں جب یہ مسئلہ حکومت کے سامنے پیش ہوا تو اس کی ترویج سے متعلق حسب ذیل دشواریاں بتائی گئیں صنعتی مزدوروں کی غیر مستقل حیثیت ہے۔ یہ بیماری کے زمانہ میں اپنے اپنے دیہی وطن کو واپس ہوجاتے ہیں طبی امداد کے سلسلہ میں یہ اپنی اجرتوں میں سے رقمی مہنائیوں کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ملک میں ڈاکٹروں کی تعداد کافی نہیں ہے لیکن اب یہ حالات بدل گئے ہیں۔ اور آج کل مزدور نسبتاً مستقل حیثیت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ مزدور در وطن واپس ہوکر جو عطائیانہ علاج کراتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ توہمات کا شکار ہیں اور انھیں اپنے عطائیوں کی دوا پر اعتماد ہوتا ہے لیکن اہم ترین سبب ان کی غربت ہے جو شہرمیں ڈاکٹری علاج کے گراں مصارف کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ جب صنعتی شہروں میں خود ان کے لئے سستی طبی امداد کے انتظامات

ہو جائیں گے تو وہ اپنے دیہی وطن کم جائیں گے۔ نیز طبی امداد کے سلسلہ میں اگر رقمی مہیائیاں معمولی سی ہوں تو وہ شاید اسے برداشت بھی کرلیں۔ مثلاً بیماری کے بیمہ فنڈ کے لئے پروفیسر کُمارا پا کی رائے ہے کہ ماہانہ مزدور ۵ آنہ، آجر ۱۰ آنہ اور حکومت ۱ آنہ ادا کرے۔ ان اعداد میں حسب ضرورت ترمیم ہو سکتی ہے۔ اب رہا ڈاکٹروں کی کمی کا سوال۔ حالات میں بتدریج اصلاح ہو رہی ہے۔ جنگ کے بعد بہت سے ڈاکٹر ملک کو واپس آ جائیں گے۔ اس کے علاوہ ملک میں مختلف مدارج کی طبی تعلیم کے وسیع انتظامات کے ذریعے اس مشکل مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ حکومت ہند نے کچھ عرصہ قبل پروفیسر ادارکار کو صنعتی مزدوروں کے بیمۂ علالت کی اسکیم کی تیاری کے کام پر مقرر کیا ہے۔ یہ اسکیم صاحب موصوف آجروں اور مزدوروں کے نمائندوں اور حکومت ہند کے مہتمم بیمہ کے مشوروں سے تیار کریں گے۔

طبی امداد کے تحت زچاؤں کی امداد قابلِ ذکر ہے۔ مغربی ممالک میں زچگی سے کچھ پہلے اور زچگی کے بعد کچھ عرصہ تک مزدور عورتوں کو کام کرنے کی ممانعت ہے اور اسی زمانہ میں انھیں رقمی امداد ملتی ہے۔ ہندوستان میں اس کی یوں بھی ضرورت ہے کہ کم عمری میں شادیوں کا رواج ہے۔ زچاؤں کے اموات کثیر تعداد میں ہوتے ہیں۔ انتہائی افلاس اور ادنیٰ اجرتیں عام ہیں اس سلسلہ میں چند صوبوں اور دیسی ریاستوں نے اپنے لئے قوانین وضع کر لئے ہیں۔ نیز چند اداروں نے بھی اپنے طور پر زچاؤں کی امداد کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ چیز قانوناً سارے ہندوستان کے لئے لازم کر دی جائے۔ اسی قانون کے روسے زچگی کے سلسلہ میں زائد روپیہ جو درکار ہوتا ہے وہ فراہم کیا جائے اور زچگی سے کچھ پہلے اور زچگی کے بعد کچھ عرصہ تک مزدور عورتوں سے کام لئے بغیر اجرت دی جائے۔

بیمۂ علالت اور امداد زچگان کے مقابلہ میں معاوضۂ مزدوران کا مسئلہ کم اہم نہیں۔ موجودہ زمانہ میں تیز رفتار ذرائع حمل ونقل، اور اندرون کارخانہ مشینوں کی ترویج سے حادثات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ یہاں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کام کے دوران میں مزدور کو کوئی حادثہ پیش آئے اور نتیجتہً وہ مجروح ہو جائے یا مرجائے تو اس کو یا اس کے ورثا کو کیا معاوضہ دیا جائے۔ ۱۹۲۳ء میں قانون معاوضۂ مزدوران منظور ہوا اور اس کے متعدد ترمیمات ہوتے رہے۔ اور جدید ترین ترمیمی قانون بابت ۱۹۳۹ء کی رو سے حرفتی امراض کے سلسلہ میں بھی امداد کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ معاوضہ کا انحصار، مجروح یا متوفی کی آمدنی، حادثہ کی نوعیت اور وسعت، اور مزدور کی عمر وغیرہ پر ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء تا سنہ ۱۹۴۰ء کوئی ۳۶۰۰۰ حادثات کے لئے معاوضے ادا کئے گئے جن میں ۱۱۰۰۰ معاوضے اموات سے متعلق تھے۔ موجودہ صورت میں جو معاوضہ ملتا ہے وہ اس قدر کم ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے بعد پھر اس کے لئے معاشی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس کی پچھلی اجرت اور معاوضہ میں اس طرح تطبیق پیدا کی جائے کہ اس کی اور اس کے زیر پرورش خاندان کی اقل ضروریات کو پیش نظر رکھیں۔ نہ صرف معاوضہ کی شرحوں میں ترمیم کی ضرورت ہے بلکہ استحقاق امداد کے لئے جس قدر آمدنی کی شرط رکھی گئی ہے اس میں تبدیلی کی جائے تاکہ اور بھی اس قانون کے دائرہ عمل میں شریک ہوسکیں۔

بوڑھوں کے وظائف کا مسئلہ بھی حکومت کی توجہ کا مستحق ہے۔ ایسے افراد جنھوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ سماجی خدمت میں گزار دیا اور اپنی ساری توانائیوں کو قومی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے وقف کر دیا وہ ایک مقررہ عمر کو پہنچ جانے کے بعد ضرور کافی امداد کے مستحق ہیں۔ بوڑھوں کے وظائف کے سلسلہ میں جرمنی کا نام پیش پیش ہے جہاں کہ ۱۸۸۹ء میں اس کا آغاز ہوا۔ اب تقریباً سارے ترقی یافتہ

ممالک نے بوڑھوں کے وظائف کا طریقہ اختیار کرلیا ہے۔ یہاں بھی ۶۰ سال سے زائد عمر والوں کے لئے بھی سہولت ہونی چاہیئے۔ اور وظیفہ اتنا دیا جائے جو ان کی اقل ضروریات کی تکمیل کرسکے۔

امدادی ادارے کافی تعداد میں نہ ہونے اور جو موجود ہیں وہ صحیح طور پر نہ چلائے جانے کی وجہ سے ایسے بوڑھے جو کوئی آمدنی نہیں رکھتے اور وہ افراد جو معذور اور اپاہج ہیں، گداگری اختیار کرتے ہیں۔ صرف بھیک منگوں کے خلاف قوانین منظور کرنے سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوسکتا۔ ایسی تمام کوششیں کامیاب نہیں ہوسکتیں جو ان کے لئے معقول ذرائع معاش مہیا کرنے کے بجائے محض قانونی بندشوں پر زور دیتی ہیں۔

ہم نے یہاں تک ہندوستان کے لئے معاشرتی تحفظ کی اسکیم کے متعلق چند ضروری امور پیش کئے ہیں لیکن یہ مسئلہ اپنا کوئی آزاد وجود نہیں رکھتا بلکہ ملک کی معاشی ترقی کے بقیہ شعبوں سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ اسی لئے اس کے ساتھ ساتھ یہاں کی ترقی کے دیگر لوازم کی طرف بھی ہماری توجہ ہونی چاہیئے۔ حتیٰ کہ ضرورت کے لحاظ سے ہمیں معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیوں کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے۔

تنقید و تبصرہ

بزم معاشیات جامعہ عثمانیہ کے چند مطبوعات

زیر بحث مطبوعات پر کچھ لکھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود بزم معاشیات اور اس کی اس کوشش کے متعلق چند باتیں بیان کردی جائیں تاکہ ان مطبوعات کی اشاعت اور غرض و غایت کا اندازہ ہوسکے۔ شعبۂ معاشیات جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کی اس بزم کو کم و بیش سات سال سے شعبہ کے صدر جناب ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب کی سرپرستی و نگرانی حاصل ہے اور اس دوران میں اس کی تمام سرگرمیوں اور خدمات کے ڈاکٹر صاحب موصوف روح رواں رہے ہیں اور یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس کا ہر کارنامہ مثلاً انجمن امداد باہمی طلبہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ان ہی کی توجہ کا رہین منت ہے۔ بزم کی موجودہ علمی خدمت یعنے جنگ سے متعلق مختلف معاشی مسائل کی اُردو زبان میں بہ شکل مطبوعات اشاعت بھی ڈاکٹر صاحب ہی کی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو خود بھی کام کرتے ہیں اور دوسروں سے کام لینا بھی جانتے ہیں، اور جس طرح خود ان کا کام معیاری ہوتا ہے اسی طرح ان کی نگرانی میں جو کام کیا جاتا ہے وہ بھی اعلیٰ معیار کا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ موجودہ جنگ کے پیدا کردہ معاشی مسائل سے متعلق مختلف قسم کے لٹریچر انگریزی زبان میں آئے دن

شائع ہوا ہے جن سے انگریزی داں طبقہ تو مستفید ہو رہا ہے لیکن انگریزی نہ جاننے والا اُردو داں طبقہ مستفید نہیں ہو سکتا تو اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اُردو زبان میں بھی ایسے مسائل سے متعلق کتابچے شائع کئے جائیں۔ لیکن یہ کام خصوصاً کاغذ کی قلت و گرانی اور کتابت و طباعت کی مشکلات کے پیش نظر کچھ آسان نہ تھا، پھر بھی ڈاکٹر صاحب کی ہمت و دلچسپی اور اس کے ساتھ ساتھ طلبۂ معاشیات کے شوق و سرگرمی نے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا اور بزم کی جانب سے مطبوعات شائع ہونے لگے۔ اب تک بارہ مطبوعات شائع ہو چکے ہیں جن میں سے چار ترجمے اور بقیہ تالیف ہیں۔ یہ مطبوعات جو مختلف مسائل و عنوانات سے متعلق ہیں تمام تر شوقین و ذی صلاحیت طلبۂ معاشیات نے ڈاکٹر صاحب کی زیر نگرانی و ہدایت نہایت محنت سے لکھے ہیں لیکن اس سلسلے میں طلبہ اپنے ذاتی خیالات کے اظہار میں آزاد رہے ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب یا بزم اور شعبۂ معاشیات کے نقطۂ خیال کی لازماً پیروی اور پرچار نہیں کی ہے جیسا کہ اکثر دبستان کے طلبہ کیا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے طلبہ نے صحیح علمی انداز اور غیر جانبدارانہ طریقہ اختیار کیا ہے جو قابل تعریف ہے۔ بہرحال ان تمام مطبوعات کی اشاعت طلبۂ معاشیات کے علمی خدمت کے شوق و ذوق اور ڈاکٹر صاحب کی ایسے کاموں میں صحیح رہنمائی اور دلچسپی کا پتہ دیتی ہے۔ اور یہ چیز یقیناً ہماری قدردانی و ہمت افزائی کی محتاج ہے۔ یہ تمام مطبوعات انگریزی زبان کے بہتیرے اچھے مطبوعات سے کسی طرح کم نہیں اور ان کا مطالعہ اُردو داں طبقہ کے لئے اسی طرح مفید ہو سکتا ہے جس طرح اکثر انگریزی مطبوعات انگریزی داں طبقہ کے لئے۔ نیز اگر یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ ان کا مطالعہ نہ صرف جنگ کے پیدا کردہ معاشی مسائل کے سمجھنے میں عوام کو مدد دے گا بلکہ بعض ایسی اُلجھنوں کو جو عوام کی اکثر لاعلمی سے پیدا ہوتی رہتی ہیں دُور کرنے میں معاون ہو سکے گا۔ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ایسے

اور بھی مطبوعات جس قدر ممکن ہو سکے شائع کیے جائیں تاکہ عوام ان کا مطالعہ کر سکیں۔ اور اگر بزم معاشیات کو ایسے مطبوعات کی مزید اشاعت میں دقت ہو تو جامعہ کو چاہیئے کہ ایسی دقت کو دور کرے اور اگر ہو سکے تو مالی امداد سے بھی دریغ نہ کرے۔ اس لئے کہ آج کل طباعت و اشاعت کا کام بغیر کافی مالی سرمایہ کے ناممکن ہے۔

یہ تمام مطبوعات مکتبۂ امداد باہمی طلبۂ جامعہ عثمانیہ اور انڈیا بک ہاوس عابد روڈ حیدر آباد دکن سے مل سکتے ہیں۔ ذیل میں چند مطبوعات کی مختصر کیفیتیں درج کی جاتی ہیں۔

ہندوستان کے زر پر جنگ کے اثرات

از محمد احمد خاں بی۔ اے (عثمانیہ) ال ال، بی (علیگ) قیمت یکروپیہ چار آنہ

اس حقیقت سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ موجودہ جنگ کے آغاز کے بعد سے اب تک ایک طرف تو اشیاء کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوتا رہا اور دوسری طرف ہندوستانی زر کی مجموعی مقدار بھی بڑھتی گئی لیکن ان دونوں باتوں کے پیش نظر جو قابل توجہ مسئلہ پیدا ہوگیا وہ یہ کہ آیا زر کا یہ اضافہ "افراط زر" ہے یا نہیں، اور اشیاء کی قیمتوں کا اضافہ کس حد تک افراط زر کا نتیجہ ہے۔ غرض اب تک اس مسئلہ سے متعلق انگریزی زبان میں بہت کافی مضامین اور مقالے شائع ہو چکے ہیں جو مختلف خیالات کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں معاشیین کی اکثریت اسی خیال کی حامی ہے کہ افراط زر کی جو صورت پیدا ہوگئی ہے، موجودہ گرانی کا یہ ایک اہم سبب ہے۔ البتہ بعض افراد کو افراط زر سے انکار ہے اور گرانی کو دوسرے اسباب کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ حکومت بھی ایک عرصہ تک اسی خیال کی حامی رہی لیکن بعد میں اس نے افراط زر کی صورت کا اقرار کر لیا۔ محمد احمد خاں صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) ال ال۔ بی (علیگ) نے زیر بحث مطبوعہ میں اسی مسئلہ پر نہایت سیر حاصل بحث کی ہے اور مختلف حقائق اور اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ ہندوستان میں افراط زر کی صورت پیدا ہوگئی

ہے جو ہندوستان کے دفاعی اخراجات برداشت کرنے کے سلسلہ میں نہیں بلکہ حکومت ہند نے برطانیہ کے مالیات جنگ کی فراہمی کے لئے پیدا کی۔ اور یہ افراط زر گرانی کا ایک بہت ہی اہم سبب بن گئی۔ اس سلسلہ میں مخالف نقطۂ خیال کی تردید بھی کی ہے اور آخر میں افراط زر کو روکنے کی جو ناکام تدابیر حکومت نے اختیار کی ان کا بھی ذکر کرتے ہوئے دیگر موثر تدابیر پیش کی ہیں۔ کتاب پر کوئی طویل تبصرہ کرنے کے بجائے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ہندوستان میں موجودہ افراط زر سے متعلق یہ ایک ایسی کتاب ہے جو انگریزی زبان کے بعض اعلیٰ درجہ کے مطبوعات سے بھی بہتر ہے اور اس کا مطالعہ بڑی حد تک دیگر کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کرسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کتاب چونکہ علمی انداز اور مصطلحہ زبان میں لکھی گئی ہے اس لئے بہت زیادہ عام فہم نہیں ہے لیکن جو لوگ معاشی مسائل سے متعلقہ کتابوں کا کسی قدر مطالعہ کرتے رہتے ہیں وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ باقی رہے طلبۂ معاشیات تو ان کے لئے بھی یہ کتاب نہایت مفید ہے بلکہ معاشیات کے اعلیٰ امتحانات کے سلسلے میں بھی کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔

انگلستان اور بین الاقوامی زر کے منصوبے

مترجمہ محمد احمد خاں بی۔اے (عثمانیہ) ال ال، بی (علیگ)

قیمت آٹھ آنے۔

موجودہ جنگ کے بعد پیش آنے والے مختلف معاشی مسائل میں سے ایک ایک اہم مسئلہ زر کے بین الاقوامی استحکام کا بھی ہے تاکہ اس کے مختلف معیارات اور قدر کے تغیرات سے بین الاقوامی تجارت میں جو دشواریاں پیدا ہوتی رہتی ہیں وہ دُور ہوسکیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں انگلستان کی حکومت کی طرف سے جو تجاویز مرتب ہوئی ہیں ان میں ایک بین الاقوامی حساب گھر کے قیام کی سفارش کی گئی ہے جہاں مختلف ممالک کے تجارتی حسابات کا تصفیہ کیا جاسکے۔ اس غرض کے لئے ایک اونس سونے یا

۲۵ ڈالر کے مساوی ایک بین الاقوامی پیمانہ "بنکور" کے نام سے معین کیا جائے گا اور یہ (بنکور) کوئی حقیقی سکہ نہ ہوگا بلکہ مختلف ملکوں کے زر کی قدر کا ایک مشترک پیمانہ ہوگا جس کے ذریعہ لین دین کا حساب کتاب کیا جائے گا۔ حساب گھر بنکور کے ذریعہ کس طرح مختلف ممالک کے زر کی قدر اور تجارتی تعلقات وغیرہ میں استحکام پیدا کر سکے گا ان کا ذکر تجاویز میں کیا گیا ہے جو انگریزی زبان میں حکومت کی جانب سے شائع ہو چکے ہیں۔ زیر بحث مطبوعہ ان کا ترجمہ ہے جو محمد احمد خاں بی۔ اے (عثمانیہ) ال ال بی (علیگ) نے کیا ہے جس کے مطالعہ سے اُردو داں حضرات کو معلوم ہو سکے گا کہ جنگ کے بعد نظام زر کو مستحکم بنانے کے لئے حکومت انگلستان کیا تدابیر پیش کر رہی ہے۔

امریکہ اور بین الاقوامی زر کے منصوبے

مترجمہ عطاء الرحمٰن علوی بی۔ اے (عثمانیہ)
قیمت چھ آنے۔

استحکام زر کے مسئلہ سے متعلق جن مقاصد کے پیش نظر حکومت انگلستان نے ایک بین الاقوامی لائحہ عمل کا خاکہ مرتب کیا ہے، ان ہی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے وزیر مالیہ کی طرف سے بھی تجاویز کا ایک خاکہ مرتب کیا گیا ہے جس میں ایک بین الاقوامی ذخیرہ استحکام زر کی سفارش کی گئی ہے جو ایک مقررہ نصببیہ کے لحاظ سے مختلف رکن ممالک کے زر، تمسکات اور سونے پر مشتمل ہوگا۔ اس ذخیرہ کے زر کی اکائی جن کے ذریعہ تمام حساب وکتاب کا تصفیہ اور مختلف ممالک کے زر کی قدر کا تعین کیا جائے گا وہ "یونیٹا" کے نام سے موسوم ہوگا اور یہ ۱/۷-۱۳ اگرین سونا یا دس ڈالر کے مساوی ہوگا۔ امریکہ کے اس مجوزہ ذخیرہ استحکام زر کا خاکہ مختلف حکومتوں کے پاس مطالعہ اور غور کے لئے روانہ کیا گیا ہے اور دعوت دی گئی ہے کہ وہ اپنا اپنا نمائندہ واشنگٹن بھیجیں تاکہ ان کے خیالات کی روشنی میں کوئی متفقہ لائحہ عمل تیار کیا جا سکے۔ زیر بحث مطبوعہ ان ہی امریکی تجاویز کا

ترجمہ ہے جو عطاء الرحمن صاحب علوی بی۔ اے (عثمانیہ) نے کیا ہے۔ انگلستان کی پیش کردہ تجاویز کے ساتھ ساتھ امریکی تجاویز کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ مسئلہ زیر بحث سے متعلق دونوں ملکوں کے مجوزہ حل کا اندازہ ہوسکے۔

کنیڈا اور بین الاقوامی زر کے منصوبے

مترجمہ خواجہ محمد شمس الدین بی۔ اے (عثمانیہ)
قیمت آٹھ آنے۔

استحکام زر سے متعلق انگلستان اور امریکہ کی تجاویز کے پیش نظر کنیڈا کے ماہرین نے بھی تجاویز مرتب کی ہیں جو زیادہ تر امریکی تجاویز پر مبنی ہیں۔ لیکن ان میں دونوں ملکوں کی تجاویز کے نقائص کو دور کرنے اور ایک درمیانی صورت اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ لین دار اور دین دار دونوں ممالک کے مفاد کی حتی الامکان حفاظت ہوسکے۔ اس لحاظ سے کنیڈا کی تجاویز نسبتاً بہتر شمار کی جاسکتی ہیں جس کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہوسکتا ہے۔ مطبوعہ ہذا ان ہی کنیڈی تجاویز کا عام فہم سلجھا ہوا ترجمہ ہے جو خواجہ محمد شمس الدین صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) نے کیا ہے۔

ہندوستان اور بین الاقوامی زر کے منصوبے

از سعید احمد مینائی، بی۔ اے (عثمانیہ)
قیمت آٹھ آنے۔

یہ انگلستان، امریکہ یا کنیڈا کے مجوزہ منصوبوں کی طرح ہندوستان کے پیش کردہ کسی منصوبے کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ سعید احمد مینائی صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) کی تالیف ہے کیونکہ ہندوستان کی حکومت کی جانب سے ایسی کوئی تجویز مرتب نہیں کی گئی ہے۔ مولف نے مذکورۂ بالا تینوں منصوبوں اور متعلقہ ادب کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے اس مقالہ میں ان کو مختصراً پیش کیا ہے اور ان کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ان پر ایک عام تبصرہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کس طرح برطانی اور امریکی منصوبوں میں ملکی مفاد کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ نیز ان منصوبوں کی کامیابی کے لئے کن امور کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر راؤ صاحب کی

مجوزہ ترمیمات کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف اور مخصوص معاشی مسائل کی روشنی میں ان منصوبوں کے اختیار کرنے سے کس حد تک ہندوستان کا فائدہ یا نقصان ہوسکتا ہے اس سے بحث کی ہے۔ مذکورہ بالا تینوں منصوبوں کے ترجمے کے ساتھ ساتھ اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے تاکہ نہ صرف ان منصوبوں کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ ہو سکے بلکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ہندوستان کے مسائل کے پیشِ نظر یہ منصوبے کس حد تک قابل قبول ہو سکتے۔

سید فخر الحسن

حیدرآباد کی صنعتوں پر جنگ کے اثرات

از محمد نظام الدین احمد (عثمانیہ) چھوٹی تقطیع۔ ۸۹ صفحات قیمت ایک روپیہ۔

اس رسالے کے تین حصے ہیں:۔ پہلے حصے میں موجودہ جنگ کی ابتدا سے قبل حیدرآباد کی جو حالت تھی اُس کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں تفصیلی طور پر اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ اس جنگ نے حیدرآباد کی مختلف صنعتوں کو کس طرح متاثر کیا ہے۔ سابقہ صنعتوں کو کس حد تک ترقی ہوئی اور کونسی نئی صنعتیں جاری ہوئی ہیں تیسرے حصے میں صنعتی ترقی کے لئے حکومتی امداد کی صراحت کی گئی ہے۔ نیز یہ بتایا گیا ہے کہ جنگ کے ختم پر کس قسم کے صنعتی مسائل پیدا ہوں گے اور انھیں حل کرنے کے لئے کن تدبیروں کا اختیار کرنا ضروری ہے۔

حیدرآباد کے معاشی مسائل کے متعلق اب تک بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ نظام الدین صاحب نے اس بارے میں جو اقدام کیا ہے بزم کے دوسرے اراکین کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ ان کا طرزِ بیان بہت صاف اور آسان ہے۔ طلبائے معاشیات کے لئے یہ کتاب خاص طور پر مفید ہے۔

حیدرآباد اور قیمتوں کی نگرانی

از احمد عبدالماجد صاحب (عثمانیہ) چھوٹی تقطیع۔ ۴۷ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔

اس رسالے میں اس امر کی تشریح کی گئی ہے کہ جنگ کے زمانے میں قیمتیں کیوں گراں ہوتی ہیں۔ حیدرآباد میں مختلف چیزوں کی گرانی کا کیا حال ہے۔ حکومت نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے کس قسم کی تدبیریں اختیار کی ہیں اور وہ کس حد تک کامیاب ہوئیں۔

جنگ کے معاشی مسائل میں قیمتوں کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ گرانی کے غیر معمولی بار کی وجہ سے ہر شخص کسی نہ کسی حیثیت سے اس کی طرف متوجہ نظر آتا ہے۔ احمد عبدالماجد صاحب نے اس مسئلہ پر قلم اٹھا کر وقت کی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اس رسالے سے طلبائے معاشیات اور حیدرآباد میں قیمتوں کے مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے اصحاب یکساں استفادہ کرسکتے ہیں۔ بزم کی جانب سے اس قسم کے اور رسالے شایع ہوں تو بہت فائدہ ہوگا۔

از محمد احمد خاں بی۔ اے (عثمانیہ) ال ال بی (علیگ)

جنگ اور ہندوستان کا قومی قرضہ

چھوٹی تقطیع۔ ۰۰ صفحات قیمت ۱۲/ ۔

اس رسالے میں صراحت کی گئی ہے کہ حکومت کو قرض کی ضرورت کیوں ہوتی ہے۔ حکومتی قرضوں کی مختلف قسمیں کیا ہیں۔ ہندوستانی قومی قرض کی ابتدا کب سے ہوئی۔ اس کے بعد اس کے ارتقائی مدارج کیا رہے۔ موجودہ جنگ کی ابتدا سے پہلے کس طرح ہندوستان ایک دین دار ملک تھا اور دوران جنگ موافق حالات کی بنا پر کیونکر ایک لین دار ملک میں تبدیل ہوگیا ہے اور اس تبدیلی کی وجہ سے کس قسم کے نئے مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ اس رسالے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں عملی مسائل کی تشریح سے پہلے متعلقہ نظری توضیحات بھی کی گئی ہیں جن کے ذریعہ پیچیدہ حصوں کے سمجھنے میں آسانی ہوگئی ہے۔ یہ رسالہ اس معیار کا ہے کہ اس سے بی۔ اے اور ام۔ اے کے طالب علم استفادہ کرسکتے ہیں۔ امید کہ قابل مولف دور حاضرہ کے دوسرے مسائل کے متعلق ایسے رسالے لکھ کر اُردو ادب میں معاشی لٹریچر کا اضافہ کریں گے۔

از سعید احمد بینائی بی۔ اے (عثمانیہ) چھوٹی تقطیع ۷۴ صفحات قیمت ۸/۔

محصول منافع زاید جنگ کے زمانے میں حکومت کے اخراجات غیر معمولی طور پر بڑھ جاتے ہیں۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے حکومت جن مختلف ذریعوں سے مدد لیتی ہے اُن میں سے ایک محصول منافع زاید بھی ہے۔

اس رسالے میں محصول منافع زاید کے مفہوم۔ مقاصد۔ ابتدا اور ارتقاء کی جامع تشریح کی گئی ہے۔ برطانوی ہند اور ممالک محروسہ سرکار عالی میں اس کے نفاذ اور عملدرآمد کے متعلق بیانی اور تنقیدی مواد پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب کا ایک طویل اور ماہرانہ مقدمہ ہے جو رسالے کے ایک نہائی حصے پر مشتمل ہے۔ طلبائے معاشیات اور معاشی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے اصحاب کے لئے یہ رسالہ یکساں مفید ہے۔ بینائی صاحب نے محصول منافع زاید کے مختلف مسئلوں کو اتنے صاف اور سلیس پیرایے میں پیش کیا ہے کہ ان کے سمجھنے میں عام لوگوں کو بھی کسی قسم کی دقت نہ ہونی چاہیئے۔

مترجمہ سعید احمد بینائی

ہندوستان کی معاشی ترقی کے لئے ایک لایحۂ عمل بی اے (عثمانیہ)

چھوٹی تقطیع ۔ ۹ صفحات قیمت ۱۲/۔

اس رسالے میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستانی باشندوں کی فی کس سالانہ اوسط آمدنی ترقی یافتہ ممالک کے مقابل بہت کم ہے اور اسی لحاظ سے ان کا معیار زندگی بھی بہت پست ہے۔ لہذا ہندوستان کے آگے دو بنیادی مسائل ہیں: (۱) موجودہ قومی آمدنی میں اضافہ (۲) اور اس کے ذریعہ بہتر معیار زندگی کا حصول۔ ان دو مقصدوں کی تکمیل کے لئے پندرہ سالہ لایحۂ عمل پیش کیا گیا ہے جو پیدائش دولت اور صرف دولت کے تمام اہم پہلوؤں کی اصلاح اور ترقی پر حاوی ہے۔ یہ پلان پرشوتم داس ٹھاکر داس اور ان کے ساتھیوں نے مشترکہ طور پر انگریزی زبان میں پیش کیا ہے اور اس کے متعلق

اظہارِ رائے کی دعوت دی ہے۔ یمینائی صاحب نے بہت سلیس اور سادہ زبان میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ عبارت میں اس قدر روانی پائی جاتی ہے کہ کہیں ترجمے کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ قابل مترجم نے انگریزی پلان کا بر وقت ترجمہ کرکے اردو داں پبلک کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔

محمد ناصر علی

جنگ اور غذا کا مسئلہ

از جناب شفیق الرحمن صاحب (عثمانیہ)۔

آجکل ہندوستان میں غلّہ کی گرانی اور قلّت جو نازک صورت اختیار کرچکی ہے وہ محتاج بیان نہیں خصوصاً ملک کے وہ طبقے بہت زیر بار اور پریشان حال ہیں جن کی آمدنی کم و بیش معین ہے۔ جنگ کے ابتدائی دو سالوں میں غلّہ کی کوئی خاص قلّت محسوس نہیں ہوئی البتہ اُس کے بعد صورت حال روز بروز نازک ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ملک کے بعض حصوں میں فاقہ کشی کی بھی نوبت آئی اور لاکھوں جانیں تلف ہوئیں۔ مولف نے نہایت آسان اور عام فہم پیرایہ میں اُن تمام اسباب کی تشریح کی ہے جن کی وجہ سے غذا کے مسئلہ نے پیچیدگی اختیار کی۔ ہندوستان میں اہم خوردنی اجناس کی سالانہ پیداوار اُن کی درآمد برآمد اور صرف کے بارے میں اعداد پیش کئے گئے ہیں حکومت کی جانب سے غذا کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جو طریقے اختیار کئے گئے ہیں اُن پر تنقید کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں راشن بندی، نگرانی قیمت اور زیادہ غلّہ اگانے کے بارے میں حکومت کی کوششوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کیوں نتائج خاطر خواہ برآمد نہیں ہوئے۔ آخر میں مؤلف نے گریگری کمیٹی کی سفارشوں کی روشنی میں نگرانی قیمت اور راشن بندی کو موثر بنانے کی تجاویز پیش کی ہیں۔ اس کتابچہ کے مطالعہ سے ہندوستان کے موجودہ غذائی مسئلہ کو سمجھنے میں ضرور مدد ملیگی۔

ا۔ ح

ہمارے بنک از محمد احمد سبزواری ایم۔ اے۔ شائع کردہ انجمن ترقی اُردو دہلی۔
قیمت مجلد دو روپے بارہ آنے۔ غیر مجلد ایک روپیہ بارہ آنے۔

موجودہ زمانے میں کسی ملک کے معاشی نظام کی کامیابی کا بہت کچھ انحصار زر اور بنکاری کے عمدہ نظام پر ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک حقیقت ہے کہ معیشت کی ساری کل میں زر اور بنکاری کی ہی کل ایسی ہے جس کو پوری کامیابی کے ساتھ چلنے کے لئے جتنی عوام کی واقفیت ناگزیر ہے کسی دوسری کے لئے نہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ زر اور بنکاری کا نہایت عمدہ نظام جو بہترین ہاتھوں کے ذریعہ چل رہا تھا عوام کی لغزش سے جو بنکاری کے عام معلومات سے ناواقفیت کا نتیجہ تھی درہم برہم ہوگیا اور معاشی نظام کو سخت دھکا پہنچا۔ لہٰذا عوام کے لئے دیگر معاشی مسائل کے سلسلے میں زر اور بنکاری کے مسائل سے واقفیت نہایت ناگزیر ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہندوستانی زر اور بنکاری سے متعلقہ معلومات اُردو زبان میں فراہم کئے جائیں تاکہ یہاں کا ایک بہت بڑا طبقہ ان سے واقف ہو کر نہ صرف اپنے معلومات میں اضافہ کر سکے بلکہ ملک کے زر اور بنکاری کے نظام کو کامیابی سے چلنے کا ایک ذریعہ بن سکے۔ سبزواری صاحب کی یہ کتاب ایک خاص حد تک اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

کتاب تیرہ ابواب اور چھ ضمیموں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی تین ابواب میں بنک کے معنی و مفہوم، اس کے فرائض، اس کی ابتدا و ترقی اور بعض دیگر متعلقہ امور کی وضاحت کی گئی ہے۔ چوتھے اور پانچویں باب میں ہندوستانی بنکوں کی مختصر تاریخ، پریسیڈنسی بنک اور امپیریل بنک آف انڈیا سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد تین ابواب میں مرکزی بنک کا مفہوم، ہندوستان میں اس کی ضرورت، اس کی تاریخ اور ریزرو بنک جو اب مرکزی بنک کی حیثیت رکھتا ہے اس کے مفہوم اور فرائض کی تشریح کی گئی ہے۔ نویں باب میں دیگر بنک اور دسویں باب میں دوسرے مالی اداروں سے بحث

کی گئی ہے۔ گیارھواں باب دیسی بنکاری پر اور بارھواں باب بنکوں کے بعض مشکل مسائل پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد پانچ ضمیمے ہیں اور پھر تیرھواں باب بنکاری اور جنگ سے متعلق بعض سرسری مسائل پر روشنی ڈالی ہے اس کے بعد ایک ضمیمہ پر جس میں ہندوستانی بنکوں کے چند اعداد و شمار دئے گئے ہیں، کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

مندرجہ بالا ابواب میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے اس عام فہم انداز میں کہ عوام اس کے مطالعے سے بنک کے معنی و مفہوم اس کے کام ہندوستان میں بنکوں کی مختصر تاریخ و ترقی اور موجودہ بنکاری کے حالات اور متعلقہ مسائل نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ زر اور بنکاری کا نہایت گہرا تعلق ہے اس وجہ سے ریزرو بنک اور دیگر متعلقہ امور کے سلسلے میں ہندوستان کے زر کا بھی کچھ تذکرہ آگیا ہے جس سے پڑھنے والے کو یہاں کی بنکاری کے ساتھ ساتھ موجودہ نظام زر کے بھی کچھ معلومات ہو سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کتاب بحیثیت مجموعی مفید ہے لیکن جہاں تک بنکاری کے عام اصولی مباحث کا تعلق ہے اس سلسلے میں بعض امور کا تذکرہ اور ان کی تشریح نہ ہونے اور بعض کا ادھر اُدھر ہونے سے ایک حد تک تشنگی رہ جاتی ہے۔ نیز ہندوستانی بازار زر کی تشریح اور اس سلسلے میں دیگر بنکوں اور ریزرو بنک کی حیثیت کا کوئی خاص ذکر اور بنکاری کے بعض اصلاحی امور سے بھی خاطر خواہ بحث نہیں کی گئی ہے۔ تبصرہ نگار کے خیال میں اگر کتاب کی ترتیب یہ ہوتی کہ ابتدائی چند ابواب میں بنک کے معنی و مفہوم، عام فرائض، نیز بنکوں کے اقسام اور پھر ان کے فرائض کی نوعیت وغیرہ، اور بنکاری سے بعض متعلقہ امور، بازار زر، اعتبار، اقتدار اعتبار وغیرہ کی تشریح ہوتی، اس کے بعد چند ابواب میں ہندوستانی بنک کی تاریخ، ہندوستان کے موجودہ بنک اور دیگر مالی ادارے اور ان کی نوعیت و فرائض کا ذکر ہوتا، اور آخر میں بنک کاری کی اصلاح و ترقی اور متعلقہ مسائل کی تشریح کی جاتی تو نہ صرف کتاب کی افادیت بڑھ جاتی بلکہ اس کا نام "ہمارے بنک" بھی زیادہ مناسب ہو سکتا۔ تاہم

لائق مولف کی یہ کوشش قابل ستائش ہے کہ انھوں نے اُردو زبان میں ہندوستانی بنکاری پر ایک عام فہم اور مفید کتاب لکھ کر علم اور عوام کی خدمت کی ہے ۔

سید فخر الحسن

ابن خلدون کے معاشرتی، سیاسی اور معاشی خیالات ۔ نشرۂ ادارۂ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن ۔ صفحے (۳۲)، قیمت ۶ر ۔

اشتراکی روس ۔ نشرۂ ادارۂ ادب جدید حیدرآباد دکن، شاہراہ عثمانی صفحے (۳۰)۔ قیمت ۶ر

یہ دونوں رسالے جامعۂ عثمانیہ کے ممتاز اہل قلم محمد عبد القادر صاحب لکچرار معاشیات کے قلم سے نکلے ہیں ۔

ابن خلدون نامی رسالہ اصل میں معارف اعظم گڑھ میں چھپے ہوئے دو مقالوں کی مکرر و مستقل اشاعت پر مشتمل ہے ۔ ابن خلدون کی ذہانت کے دوست دشمن سب قائل ہیں۔ اس کے خیالات کا الجھاؤ اور جلد بازاستنباطات اس کی غیر اطمینان بخش سوانح زندگی سے متاثر ہیں کسی نئے فن کا آغاز مزید مشکلیں پیدا کر دیتا ہے ۔ بہر حال مقدمۂ ابن خلدون میں بکھرے ہوئے چند جواہر ریزے چن کر ہمارے مولف نے ایک جڑاؤ زیور کی صورت میں جمع کر دئے ہیں ۔ داد سُنار کی بھی دینی پڑتی ہے اور جواہرات کی چمک دمک کی بھی لیکن غالباً خود ابن خلدون کو بھی وہ امور لکھتے وقت یہ احساس نہ ہوا ہوگا کہ اس کے قلم سے کونسا علم وجود میں آرہا ہے ۔ بہر حال کتاب قابل قدر معلومات کی حامل ہے ۔

اشتراکی روس اصل میں ادارۂ ادب جدید کے مطبوعاتِ مسائلِ حاضرہ کا چوتھا نشریہ ہے ۔ ”ادب جدید“ کی اصطلاح ان دنوں ناپسندیدہ عناصر سے متاثر ہوگئی ہے ۔ اچھا ہوتا

اگر اس رسالے کے علم دوست مولف اسے مذکورہ ماحول سے الگ ہی رکھتے تاکہ مقالہ پڑھے بغیر بھی ناظر یہ سمجھ لیتا کہ وہ ایک معرکتہ الآرا موضوع پر خالص علمی اور غیر طرفدار مولف کے معلومات سے استفادہ کرنے والا ہے۔ پیشگی فیصلہ **Prejudice** بعض وقت بُرے اثرات پیدا کر دیتا ہے۔

"ادب جدید" اگر پرانے ادب کی واقعی بُری چیزوں کو کم کر سکتا مثلاً طباعت کی غلطیاں وغیرہ تو ناظر زیادہ ممنون ہوتے۔ صہ ۲۳ پر تو ایک پوری سطر کی جگہ سادہ رہ گئی ہے۔ مولف صاحب سے ہماری استدعا ہے کہ وہ اپنی کتاب چاہے کسی ادارے میں چھپوائیں، بسم اللہ کے حذف کو منظور نہ فرمائیں۔

لینن و اسٹالن کے روس سے اب دوستوں ہی نہیں دشمنوں اور ناطرفداروں کو بھی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ عوام کے لئے اس طرح کے معلومات جیسے کہ اس رسالے میں ہیں بہت مفید ہیں، لیکن اچھا ہوتا اگر عوام کے لئے اور عام فہم انداز میں لکھے ہوئے اس رسالے میں کہیں نہ کہیں صفحے آدھے صفحے میں یہ بھی سمجھا دیا جاتا کہ اشتراکیت آخر ہے کس چیز کا نام جس سے سرمایہ دار اتنا گھبراتے ہیں اور مفت خوری کے خواہاں اس کے اتنے معتقد ہیں۔

م۔ح۔ا

مقالات محمد علی حصہ اول و دوم (مجلد مع گرد روک) مرتبہ رئیس احمد جعفری ناشر ادارۂ اشاعت اُردو۔ حیدرآباد دکن۔ ہر حصہ کی قیمت تین روپیہ بارہ آنے۔

جعفری صاحب نے ابتدا میں "محمد علی۔ تاریخ ساز ۔ تاریخ نگار" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس کے آخر میں ان مقالات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :۔ "میں نے تمام غیر ضروری مکررات کو حذف کر دیا ہے"۔ "محمد علی" کے مضامین خاصے طویل ہوتے تھے جہاں تک ممکن ہو سکا ہے

ہیں نے ان کی طوالت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے" اور یہ کہ "غیر متعلق اور غیر دلچسپ حصوں کو قلم زد کر دینے میں تکلف سے کام نہیں لیا ہے۔"

محمد علی کو خود جعفری صاحب جیسا کچھ سمجھتے ہیں کم از کم اس کے اعتبار سے انھوں نے محمد علی کے ساتھ ناانصافی کی کہ ان کے مقالات میں اپنی پسند کے موافق قطع و برید کر دی۔ اور طرفہ یہ کہ ایسے حذف شدہ مقامات پر کوئی وضاحت بھی نہیں کی جس سے معلوم ہوتا کہ فلاں مقام سے فلاں مقام تک عبارت حذف کر دی گئی ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان مقالوں کے عنوان آیا وہی ہیں جو خود محمد علی نے لکھے تھے یا جعفری صاحب نے عنوانات اپنی طرف سے دیئے ہیں۔ اشاریہ سے تو ہمارے مولفوں کو بلا وجہ بغض ہے لہذا اس کی شکایت فضول ہے۔

مقالات کے حصۂ اول میں تین اجزاء ہیں۔ ۱۔ سیاسیاتِ عالم ۲۔ رزم گاہِ حق و باطل اور ۳۔ اسلامیات۔ پہلے عنوان کے تحت مندرجہ ذیل آٹھ مضامین ہیں: معاملاتِ مصر اس برس کا حج۔ حج اور اس کا فلسفہ۔ گنبدِ خضرا پر گولہ باری۔ حالاتِ حجاز۔ تمسک بسنتہ الانگلیز۔ حجاز پر حملہ کی تحریک اور عالمِ اسلام کی موتمر۔ تیسرے مقالہ میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ آج سے بیس سال پہلے یقیناً ہندوستانیوں کے لئے بالکل نیا تھا۔ لیکن اب بھی اس کی اہمیت میں کوئی خاص کمی نہیں ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں محمد علی حج سے علاوہ دینی فریضہ کے مسلمانوں کے سیاسی۔ بین الملی ادارہ کا کام بھی لینا چاہتے تھے۔ پانچواں اور آٹھواں مقالہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ ان دونوں مقالوں سے ہندوستانی مسلمانوں کی سادہ لوحی اور سیاست کاری میں ان کی ناتجربہ کاری اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے چھٹا مضمون سعودی حکومت پر، اس کے ہتھیار ضبط کرانے پر، ایک طنز ہے۔ بقیہ مقالات میں زیادہ تر وقتی مباحث ہیں جن کی کوئی تاریخی اہمیت معلوم نہیں ہوتی۔

دوسرے جزو میں لکھنؤ کا جلسہ۔ شاندار جلسہ اور شاندار تقریر اور تقاضائے وفا ہیں۔ یہ تینوں مضامین ابن سعود کی سیاست کے ہندوستانی ردعمل سے

متعلق ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی علماء اور پیرزادے سیاست سے کتنے کورے ہیں اور یہ کہ مخالفت میں وہ اپنے مزعومات سے نزول کرکے کہاں تک جا سکتے ہیں۔ یہ تینوں مقالے ملّی سے زیادہ ذاتی معرکہ آرائی کے نمونے ہیں۔

تیسرے جزو میں ایک امی کی تقریر[۱]، فقہ اسلامی کی ترتیب و تدوین اور اسلامی نظام[۳] ہیں۔ یہ حصہ محمد علی کے فکری رجحان کا مطالعہ کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ محمد علی مفکر نہیں تھے اور نہ تاریخ اسلام کا انھوں نے بے لاگ مطالعہ کیا تھا۔ وہ ایک سیاسی تھے اور اس حیثیت سے ان کے خیالات کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ لیکن بلاشبہ وہ ایسا سپاہی تھا جو بہت سے قائدوں کو حرکت پر آمادہ کر دیتا تھا۔ پہلے مقالے میں محمد علی نے علماء کو جو راہ بتائی تھی افسوس ہے کہ وہ اب بھی اس کو کعبہ کی بجائے ترکستان کی راہ سمجھتے ہیں۔ دوسرا مقالہ بہت سطحی ہے اور غالباً اس کا مقصد صرف ایک کتاب پر تبصرہ کرنا تھا۔ تیسرا اور پہلے حصہ کا آخری مقالہ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد علی کے افکار اس لئے اعمال کے نقطۂ انقلاب کا پتا دیتا ہے۔ اس مقالہ میں وہ ابتداً اس خوش فہمی کا اظہار کرتے ہیں کہ "موتمر اور اس کی مجلس تنفیذیہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں کا ایک نظام کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ اور یہ مختصر سا بیج مستقبل میں ایک ازسرنو قائم کردہ خلافت کی جڑ ہوگا جو خلافت راشدہ کے نمونے پر قائم ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انشاء اللہ بہت جلد ہم یہ دیکھیں گے کہ اس عمارت کی چوٹی تاج خلافت سے مزین ہوگی اور یہ خلیفہ متحدہ عالم (اسلام) کی آزادی رائے سے منتخب ہوگا" لیکن اس کے کوئی بیس سطر بعد تحریر فرماتے ہیں "ہم اسلام کی اس وقت تک کچھ مدد نہیں کرسکتے جب تک کہ ہم ہندوستان کو اس کی آزادی کی جنگ کے لئے اچھی طرح منظم نہ کرلیں۔" کاش ہمارے راہ نما اس ایک نقطہ پر ابتدا سے جمے رہتے۔ بعض مفکروں جیسے جمال الدین افغانی سے یہ بات پوشیدہ نہیں تھی لیکن اس کو ہماری بدقسمتی نہیں تو اور کیا کہا جائے کہ محمد علی جیسا بطل عظیم اس خیال پر اس وقت

پہنچا جب کہ اس کی ساری توانائیاں مضمحل ہو چکی تھیں۔ اور وہ اپنوں اور پرائوں دونوں میں فی الجملہ غیر ہردلعزیز ہو چکے تھے۔

دوسرے حصہ میں جعفری صاحب نے جملہ عنوانوں کے تحت بیس[20] مقالے جمع کئے ہیں۔ یہ عنوان ریاستی[1] ہند، سامراج دشمنی[2]، گاندھی جی کانگرس[3] اور مسلمان، سیاسیات[4] بین الملی، شخصیات[5] اور فکر و نظر[6] ہیں۔ پہلے عنوان کی تحت نابھ کا بدقسمت مہاراجہ، مہاراجہ نابھ پر ایک نیا ظلم، مہارانی نابھ کا انتقال اور ڈاکٹر کچلیو کا اخراج ہیں۔ ان میں سے کم از کم اب کوئی مقالہ اہم نہیں رہا کہ کسی حیثیت سے اس کا مطالعہ کیا جائے، بجز اس کے کہ وہ "رئیس الاحرار" کے قلم سے نکلا ہے۔

دوسرے عنوان کے تحت ایشیاٹک بل[1]، برطانیہ کے سامراجی تعلقات[2] اور چین اور ہندوستان[3] ہیں۔ تاریخی حیثیت سے یہ مقالے زیادہ اہم نہیں ہیں البتہ تیسرا مقالہ ملّی سیاسیوں کے کام کی چیز ہے۔ اس حصہ کی جان بقیہ دو عنوان ہیں اور ان میں جتنے مقالے ہیں وہ سب کے سب کم و بیش یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ ماضی قریب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اور مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کو سمجھنے کے لئے ان کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

پانچواں عنوان شخصیات ہے جس میں بی اماں، رشید رضا، فعل فیصل اور امان اللہ خاں ہیں۔ ویسے تو ان دونوں مجموعوں میں کوئی مقالہ ایسا نہیں ہے جس میں محمد علی نے اپنے اور دوسروں کے ذاتی حالات کسی نہ کسی طرح معرض تحریر میں نہ لائے ہوں لیکن ان مقالوں میں بالکل ذاتی اور شخصی امور بیان ہوئے ہیں اور یہ سب کے سب خوش گوار نہیں ہیں۔ دوسروں کے ذاتی حالات بیان کرتے ہوئے محمد علی کی تحریریں کافی تلخی پیدا ہوگئی ہے جو خود ان کی اندرونی نفسی تلخی کا پتہ دیتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو کانگریس سے جو نقصان اٹھانا پڑا اس کی

ذمہ داری بڑی حد تک خود محمد علی پر تھی۔ محمد علی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تاریخ کا اتنا مطالعہ نہیں کیا تھا کہ ان میں ایک مفکر یا ایک مدبر کی دُور بینی پیدا ہوتی۔ اسی وجہ سے ان کی قوم نے ان کی اجتہادی غلطی کو کبھی معاف نہیں کیا لیکن محمد علی سمجھتے تھے کہ ان پر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے ظلم کیا ہے اس لئے وہ غیروں سے زیادہ اپنوں پر خفا تھے اور جب کوئی ان کو ٹوکتا تو جھلا جاتے تھے اور اتنے از خود رفتہ ہو جاتے کہ اپنے مرتبہ کا ان کو خیال نہیں رہتا اور نفس معاملہ کا دامن بار بار ہاتھ سے چھوٹ جایا کرتا تھا۔ اس کی سب سے نمایاں مثال رشید رضا والا مقالہ ہے۔ ایسے ذاتی معاملات میں توازن کی کمی دوسرے مقالوں میں بھی نمایاں ہے۔

ان دونوں حصوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا محمد علی کے ایک مہذب و شائستہ پڑوس کے سجے سجائے گھر کو یکایک آگ لگ گئی ہے اور محمد علی اس کوشش میں ہیں کہ گھر کی ہر چیز کو نذر آتش ہونے سے بچا لیں۔ کبھی وہ دیوان خانہ کا رُخ کرتے ہیں کہ شاید اس مقام پر وہ چیز ہو جو ان کے پڑوس کی اثاث البیت میں سب سے زیادہ عزیز ہو، کبھی کتب خانہ کی طرف رُخ کرتے ہیں کہ شاید مالکِ مکان کو اپنا کتب خانہ ہی سب سے زیادہ عزیز ہو، کبھی مالکِ مکان کے بچوں کی طرف لپکتے ہیں کہ سب سے پہلے ان کو بچا لیا جائے۔ اس پوری سعی و کوشش میں فوراً وہ کسی چیز کو پوری طرح بچانے میں کامیاب نہیں ہوتے لیکن کوشش ان کی یہی ہوتی ہے کہ سب کچھ بچا لیا جائے۔ اس کوشش میں بعض لوگ ان کے ساتھ ہیں، بعض صرف کسی ایک چیز کو بچانے میں ان کا ساتھ دیتے ہیں اور محمد علی دوسری طرف رُخ کرتے ہیں تو وہ انجان بن جاتے ہیں بلکہ مخالفت پر اتر آتے ہیں۔ بعض محض تماشائی ہیں۔ لیکن محمد علی جوش و خروش کے مضمحل ہونے کے بعد بھی زخمی شیر کی طرح غراتے رہتے ہیں۔ جزا و سزا کا معیار تکمیل نہیں بلکہ تکمیل کی کوشش ہے اور اس میں وہ کامیاب رہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

جیساکہ پہلے بھی اشارۃً ذکر ہوا محمد علی سپاہی تھے اور ایسے سپاہی تھے جو بہت سے سپہ سالاروں کو نقشۂ جنگ کے مطالعہ سے ہٹا کر جنگ میں آنے کی دعوت دیتے تھے۔ اس لئے اگر تاریخ و سیاسیات اسلامی کے طالب علموں کو ان کے بعض خیالات عجیب و غریب معلوم ہوں تو تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ ایسے خیالات اس مجموعہ کے پہلے حصہ میں زیادہ آئے ہیں مثلاً ص۱۳۵، ص۳۱۲ وغیرہ۔

ناانصافی ہوگی اگر ان مثالوں کی ادبی خوبیوں کی طرف قارئین کی توجہ مبذول نہ کرائی جائے۔ ہمارے یہاں ادب و سیاسیات ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ عرب علماء تو سیاسیات کو ادب ہی کی ایک شاخ مانتے ہیں کہ دونوں کی ایک نمایاں خصوصیت لچک ہے۔ ہندی مسلمانوں کے راہ نماؤں میں ابوالکلام آزاد اور محمد علی اس کی نمایاں مثال ہیں۔ محمد علی کو تجنیس لفظی و معنوی، صنعت مراۃ النظیر، اور خصوصاً ایہام اور مخالفت کے موقع پر تنبیہ پر بڑا عبور حاصل تھا۔ فعل فیصل، پنجابی ٹولی، بنگالی ٹولہ، سر حبیب اللہ نے حیران اللہ کے سر کی خبر لی اور نہ پیر کی فکر کی، ابوالکلام کا فرمان واجب الاذعان، "ترکوں نے کمال کیا لادینی لاطینی پھیلائی" اور اسی قسم کے سیکڑوں چبھتے ہوئے جملے اس مجموعے میں بھی ملیں گے۔ محمد علی کے "انا نیم ثلاثہ" والے لطیفہ سے وہ لطیفہ بھی کچھ کم نہیں ہے جس میں ابن سعود کو رومۃ الکبریٰ کے امپراطور اور نجد کے قاضی القضاۃ کو پاپائے اعظم سے تشبیہ دی ہے (حصہ دوم ص۲۳۴)۔

آخر میں اس مسرت کا اظہار غالباً بے جا نہ ہوگا کہ حیدر آباد اس زعیم عظیم کی خدمت کرنے سے زیادہ دنوں تک پیچھے نہیں رہا۔ امید ہے کہ محمد علی کے انگریزی مقالات بھی حیدر آباد سے شایع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ کہ اس قحط القرطاس کے زمانہ میں حیدر آباد ہی اس کی ہمت کرسکتا ہے۔

ا۔ن۔خ

دوسرے رسائل

"دی انڈین جرنل آف اکنامکس" بابت جنوری ۱۹۴۴ء

مسٹر ایس، آر، بوس نے اپنے مضمون "جنگ کے دوران میں محنت" کے عنوان کے تحت یہ بحث کی ہے کہ موجودہ جنگ نے مزدوروں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو کیسے متاثر کیا ہے۔

جنگ نے لاکھوں کے لئے روزگار فراہم کیا ہے۔ حکومت اور آجر طبقے نے مزدوروں کو اپنے کام پر قائم رکھنے کے لئے متعدد ترغیبی سہولتیں دی ہیں۔ ایسے علاقوں میں جہاں کہ حملہ کے خطرات ہوں، جنگی صدموں کی صورت میں مجروح اشخاص کو معاوضہ کا قانونی حق دیا گیا ہے۔ آجروں کی طرف سے سستے غلّہ کی دوکانوں کا انتظام ہے۔ سہ جماعتی کانفرنس کے روسے حکومتوں، آجروں اور مزدوروں کے نمایندوں کو یکجا شریک ہونے کا موقع دیا گیا ہے۔ وائسرائے کی کونسل میں خود ایک وزیر عمّال مقرر ہے جو مشیر فلاح وبہبود مزدوران اور دیگر مددگاروں کے ذریعہ مزدوروں کی نگہداشت کرتا ہے۔

ایک طرف مزدوروں کے لئے مذکورۂ بالا فوائد حاصل ہیں تو دوسری طرف

ان کے لئے متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ گو ہڑتال کے قانونی حق کو چھین نہیں لیا گیا ہے لیکن اس سلسلہ میں متعدد قیود عائد کئے گئے ہیں۔ اضافۂ اجرت اور تبدیلیٔ شرائطِ ملازمت کے مطالبات پر کئی قسم کی بندشیں ہیں۔ تیز بڑھتے ہوئے مصارفِ زندگی نے مزدوروں کو پریشان کر رکھا ہے مضمون نگار نے یہ واضح کیا ہے کہ بڑھتے ہوئے مصارفِ زندگی کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے آجروں نے یا تو گرانی بھتہ کا طریقہ اختیار کیا ہے یا قیمتوں کی سطح میں تبدیلیوں کی مناسبت سے اجرتوں میں بھی ردوبدل کیا ہے اس سلسلہ میں قابل مضمون نگار نے ان دونوں طریقوں کے محاسن اور نقائص پر تبصرہ کیا ہے۔ مضمون کے آخری حصہ میں آپ نے مختصر الفاظ میں ان مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے جو جنگ کے بعد مزدوروں کے لئے درپیش ہوں گے۔

"دی انڈین جرنل آف پولٹکل سائنس" بابت جنوری۔ مارچ ۴۲ء۔

ڈاکٹر اشرو ادم نے اپنے مضمون "حکومتی اور کاروباری نظم ونسق" میں حکومت اور کاروبار کے انتظامی مسائل کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ آپ نے واضح کیا ہے کہ نظم ونسق عامہ کا مقصد خدمت ہے لیکن کاروباری نظم ونسق کی بنیاد منفعت ہے۔ حکومت جب کبھی کاروباری شعبوں کو اپنے ذمہ لیتی ہے تو یہ معمولی منافع اور بعض صورتوں میں نقصان کے باوجود انھیں جاری رکھتی ہے۔ جو کچھ منافع ملتا ہے اسے رفاہ عامہ پر یا اُسی کاروبار کی حالت بہتر بنانے کے لئے صرف کرتی ہے۔ خانگی کاروبار میں منافع ہونے کی صورت میں اسے حصہ داروں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا ہے اس کے پیش نظر فوری نتائج ہوتے ہیں۔ جیسے ہی ایک خانگی کاروبار غیر منفعت بخش ثابت ہو اسے ترک کر دیا جاتا ہے مضمون کے دوسرے حصہ میں ڈاکٹر اشرو ادم نے شرائطِ تقرر۔ میعاد ملازمت۔ کارکردگی۔ ترقی۔ کفایت مصارف وغیرہ کے لحاظ سے کاروباری اور حکومتی نظم ونسق کا مقابلہ و موازنہ کیا ہے۔

ع۔ ق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی معاشیات
کے
چند فقہی اور قانونی ابواب

(بسلسلہ گذشتہ ۴)

مزارعت و مساقات چاہیئے تو یہی تھا کہ ان دونوں معاملات کا ذکر بھی اجارہ ہی کے ذیل میں کر دیا جاتا۔ کیونکہ اس کا تعلق بھی محنت و مزدوری سے ہے۔ لیکن کچھ تو اس لئے کہ عموماً فقہاء اسلام ان دونوں کو الگ الگ کر کے لکھتے ہیں۔ اس لئے میں بھی ان کا علیحدہ ذکر کرتا ہوں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ محنت و سرمایہ میں، جو جھگڑا اس وقت دنیا میں جاری ہے اس سلسلہ میں جس طرح صنعتی مزدوروں اور سرمایہ داروں کے اختلاف کے حل کی ایک شکل اسلام نے پیش کی ہے۔ یعنی جیسا کہ گذر چکا کہ مزدور اور سرمایہ دار کی معاشی زندگی کم از کم کھانے پینے کی حد تک ایک ہو۔ یا یوں کہئے کہ مزدوری مزدوروں کو اتنی ملنی چاہیئے جس کے ذریعہ سے ان کی خوراک اور ان کا لباس سرمایہ دار کی خوراک اور لباس کے برابر ہو جائے

دوسری بات یہ ہے کہ مزدور کو منافع سے بھی کچھ حصہ ملنا چاہیے۔ تیسری بات یہ ہے کہ مزدوروں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ یعنی سرمایہ دار کے لئے یہ جائز نہ ہوگا کہ محض مصارف کے ڈر سے زیادہ مشقت کے کام کو چند ہی مزدوروں سے لے بلکہ ان کی اعانت کے لئے قوت کا اضافہ کرے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کام کا وقت اسی قدر مقرر کیا جائے جتنا کہ وہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ صحاح کی صحیح روایتوں سے یہ تینوں نتائج برآمد ہوتے ہیں، قریب قریب کچھ اسی قسم کا مسئلہ زمین کے سرمایہ داروں اور مزدوروں کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ قبل اسلام عرب خصوصاً مدینہ و اطراف مدینہ میں زمینداروں اور کاشت کاروں کے درمیان مختلف قسم کے معاملات جاری تھے مثلاً

(۱) زمین میں کچھ بھی پیدا ہو مگر زمیندار کو بہر حال بیس من فی بیگہ مثلاً کاشت کار ادا کرے گا، اسی کو مزارعت بجزءٍ معلوم کہتے ہیں۔ اس کی بھی دو صورتیں تھیں، اسی کھیت سے غلہ کی اس مقدار کو ادا کرے گا یا خود گھر سے دے گا۔

(۲) زمین کے اچھے قطعات کی پیداوار زمیندار کو ملے گی اور معمولی خراب پیداوار قطعہ کا مستحق کاشت کار ہوگا۔

(۳) جو کچھ پیدا ہو اس کا نصف یا ثلث جو بھی طے ہو جائے کاشت کار کو ملے گا۔ گویا یہ ساری شکلیں بٹائی کی عرب میں مروج تھیں۔ لیکن نقدی بندوبست یعنی فی بیگہ کاشت کار سالانہ، مثلاً دو روپے، چار روپے الغرض جو طے ہو جائے ادا کرے گا، اور کل پیداوار کا وہ مالک ہوگا۔

نقدی کی یہ شکل بھی عرب میں مروج تھی یا نہیں اس کا اب تک صاف صاف پتہ نہ چلا۔ رافع بن خدیج جن کا گھرانا مدینہ کے سب سے بڑے کاشت کاروں میں تھا ان کے ایک بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم مدینے کے لوگ اس سے واقف

نہ تھے۔ بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بٹائی کے نمبر (۱) اور نمبر (۲) دونوں طریقوں کو غیر قانونی قرار دیا کیونکہ بسا اوقات ان میں سے بے چارے کاشت کار کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ گھر سے تاوان ادا کرنا پڑے۔ تمام فقہاء اسلام بلا استثنا بٹائی کی ان دونوں شکلوں کے ناجائز ہونے کے قائل ہیں۔

البتہ تیسری شکل اس کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ جو کچھ من دو من دس من کھیت میں پیدا ہو، اس کا ثلث یا نصف بانٹا جائے اس میں کاشت کار کے نقصان کی شکل نظر نہیں آتی۔ اس لئے کہ اس کو گھر سے کچھ دینا نہیں پڑتا۔ البتہ اگر کچھ پیدا نہ ہو تو تخم اور محنت دونوں اس کی ضائع ہوسکتی ہیں۔ مگر زمیندار کی زمین بھی چونکہ اس کی کاشت کی وجہ سے بے کار رہی۔ اس لئے گو نہ معاملہ برابر برابر سا ہو جاتا ہے پھر بھی آئمہ اسلام میں اکثروں کا اسی وجہ سے یہ خیال ہے کہ ایسی صورت میں تخم بھی زمیندار ہی کو دینا چاہیے۔ مغنی میں ہے:۔

ان الزراعة انما تصح اذا كان البذر من رب الارض و العمل من العامل نص عليه احمد في رواية جماعة واختاره عامة الاصحاب وهو مذهب ابن سيرين والشافعي واسحاق

کھیتی کا معاملہ اسی وقت درست ہوسکتا ہے جب تخم مالک زمین (زمیندار) کا ہو، اور محنت کاشت کار کی امام احمد نے اسی کی تصریح فرمائی ہے جیسا کہ ایک جماعت کی ان سے روایت ہے، اور عام اصحاب احمد نے اسی کو اختیار کیا ہے ابن سیرین اور امام شافعی اور اسحاق کا مذہب ہے۔

وجہ اس کی یہ لکھی ہے کہ:۔

ان يكون راس المال كله من عند احدهما

تاکہ کل سرمایہ (زمین و تخم) دونوں میں ایک ہی کا ہو۔

اگرچہ کچھ لوگ یہ بھی جائز قرار دیتے ہیں کہ تخم بھی کاشت کار کا ہو تو کچھ حرج نہیں۔
بظاہر یہ صورت ہر دو فریق کے لئے نقصان دہ نہیں ہے مگر عملی تجربہ بتاتا ہے کہ عموماً بٹائی کی اس شکل میں کاشت کار جی لگا کر زمین میں محنت نہیں کرتا وہ بے چارہ یہ خیال کرتا ہے کہ جوتنے، بونے، پانی دینے، گھانس اکھاڑنے، کاٹنے، دانہ نکالنے وغیرہ کا سارا کام تو میں کروں گا یا کوئی قیمتی غلہ اس میں لگاؤں گا تو اس کا بھی کیا حاصل، اس لئے کہ میری محنت کا ایک بڑا حصہ زمیندار محض اس لئے لے جائے گا کہ اس کی زمین ہے۔ اولاً یوں ہی یہ حصہ جو ان کا کمایا ہوا ہے، دیتے ہوئے جبر گذرتا ہے۔ ثانیاً وہ جانتا ہے کہ میری زیادہ محنت یا زیادہ قیمتی پیداوار سے کیا نفع کہ اس محنت کا بڑا حصہ تو دوسرے کے گھر پہنچے گا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ بٹائی کی زمینوں پر ان ہی وجوہ سے کبھی کاشت کار پوری تندہی سے محنت نہیں کرتے بلکہ ایک اور طریقہ یہ اختیار کرتے ہیں کہ بہت سی زمین مختلف زمینداروں سے لے کر کاشت کر لیتے ہیں۔ پوری توجہ کسی پر نہیں کرتے سمجھتے ہیں کہ ہوا تو خیر نہیں کچھ تو مل ہی جائے گا۔ اور نہ ہوا تو ہمارا کیا بگڑے گا۔ خصوصاً جب ان فقہاء کی رائے اختیار کی جائے جو تخم بھی زمیندار کے سر ڈالتے ہیں کاشت کاری کا یہ بڑا اہم راز ہے جو براہ راست اس کا تجربہ نہیں رکھتے وہ اس کو شاید سمجھ ہی نہیں سکتے۔ البتہ کاشت کاروں کے لئے سب سے بہترین اطمینان بخش شکل نقدی بند وبست کی ہے۔ یعنے فی بیگہ کوئی معین رقم طے کر کے ان کو زمین دیدی جائے ایسے کھیتوں پر کاشت کار پورا زور لگا دیتا ہے کیونکہ رقم تو اس کو بہرحال دینی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ نفع ہم زمین سے اُٹھا سکتے ہوں اس میں کمی نہ کریں۔ بجائے ایک فصل کے دو دو تین تین فصل تک ایک ایک کھیت سے اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہ مشاہدہ ہے کہ جس کھیت سے بٹائی کی صورت میں کاشت کار تین چار من غلہ بھی سالانہ پیدا نہیں کرتا تھا نقدی کی صورت میں اسی

کھیت سے دو دو سو تین تین سو روپے پیدا کر لیتا ہے۔ اچھی سے اچھی قیمت کی چیزوں کی کاشت کرتا ہے۔

بہر حال یہ تو کاشت اور اس کی بندوبست کے مختلف طریقے ہیں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا یوں تو بٹائی کی مذکورہ بالا شکل عام علماء اسلام کے نزدیک جائز ہے مگر حدیثوں کے دیکھنے سے ایک اور بات معلوم ہوتی ہے۔

میرا مقصد یہ ہے کہ جب عموماً صحابہؓ میں بٹائی کا طریقہ مروج تھا اور بہ قول امام بخاری

ما بالمدینه اهل بیت الاو یزرعون علی الثلث والربع

مدینہ میں شاید ہی کوئی گھرانا ہوگا جس میں تہائی اور چوتھائی پر کھیتی نہ ہوتی ہو،

تو اس کو ناجائز کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی لیکن اسی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مخفی منشاء کا بھی پتہ چلتا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ وہی رافع بن خدیج جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جن کا گھرانا مدینے کے سب سے بڑے کاشتکاروں کا تھا ان سے ایک روایت عہد صحابہؓ میں مشہور ہوئی جس کے الفاظ مختلف ہیں۔ ایک طریقہ اس کا درج کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

انما یزرع ثلاثة رجل له ارض فهو یزرعها ورجل منح اخاه ارضاً فهو یزرع ورجل اکتری بذهب وفضة (الطحاوی)

کھیتی تین ہی قسم کے آدمی کر سکتے ہیں ایک تو وہ جس کی زمین ہو، اور اس میں کھیتی کرے ہو، دوسرا وہ جسے اسکے بھائی نے زمین دی ہو اور اس میں وہ کھیتی کرے، تیسرا وہ آدمی جو زمین کو سونے یا چاندی کے معاوضے میں کرایہ پر لے،

حضرت رافع نیز حضرت جابر بن عبد اللہ دونوں صحابہؓ سے اس باب میں اس

قسم کے الفاظ مروی ہیں۔ حاصل ان سب کا یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس زمین ہو تو یا اس میں خود کاشت کرے اور اگر خود نہیں کرتا تو پھر اس کے لئے کل دو صورتیں ہیں، یا تو اپنے کسی بھائی کو مفت کاشت کرنے کے لئے دیدے، اور یہ بھی پسند نہ ہو تو سونے چاندی کی شکل میں اس کا کرایہ لے۔ یعنے نقدی بندوبست کردے جس کے معنی یہی ہوئے کہ بٹائی کی مذکورہ بالا شکل کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باقی رکھنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ جس طرح پس ماندہ سرمایہ کو قرض میں دلا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیرات کی مدوں میں ایک جدید مد کا اضافہ فرمایا ہے، اسی طرح زائد زمین کے متعلق بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی کے ایک نئے باب کو کھولا ہے جس سے شاید دنیا اب تک ناواقف ہے، ٹھیک جس طرح قرض کی صورت میں مقروض سے کسی قسم کے نفع اٹھانے کی ممانعت کردی گئی ہے اسی طرح زائد زمین جو بطور حسنِ سلوک کے دی گئی ہو، اس سے نفع اٹھانے کی ممانعت ہے۔ ان ہی رافع سے کسی نے پوچھا تھا کہ اگر ہم زمین میں کچھ نہ بوئیں اور نہ کسی کے ساتھ نقدی بندوبست کریں اور کسی دوسرے نے اس میں کاشت کی پھر اگر

وهب لی من نباتها شیئاً	اس کی روئیدگی سے مجھے کچھ جز دے
آخذه قال لا (طحاوی)	کیا میں اسے لے سکتا ہوں بولے نہیں،

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث کے الفاظ یہ ہیں

قال کان لرجال من فضول	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
ارضین علی عهد	زمانے میں بعض لوگوں کے پاس
رسول اللہ صلی اللہ	زائد از ضرورت زمینیں تھیں، عموماً
علیه وسلم فکانوا	لوگ نصف یا تہائی چوتھائی پر
یواجرونها علی النصف و	اپنی زمینوں کو بندوبست کردیا کرتے
الثلث والربع فقال	تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	فرمایا جس کے پاس زمین ہو، یا اس
من کان لہ ارض فلیزرعھا او	میں وہ خود کاشت کرے ورنہ پھر اپنے
لیمنح اخاہ فان ابی فلیمسک	کسی بھائی کو دیدے اور اگر اس سے
(طحاوی)	وہ انکار کرتا ہے تو پھر رک جائے،

(فضول ارضین) یعنے زائد از کاشت زمین اگر زمیندار کے پاس ہو تو ایک صورت یہ ہے کہ آخرت کے لئے اس میں کاشت کرائے اور ثواب کی خدا سے توقع کرے، اور یہ نہ ہوسکے تو جیسا کہ حضرت رافع سے مروی ہے زمین کو نقدی بند و بست کر دے۔

اور یہ حال تو زراعت یعنے کاشت کا ہے، قریب قریب یہی نقطہ نظر اسلام میں "مساقات" یعنے باغات اور تاکستانوں کے متعلق ہے کہ گو عموماً فقہا اسے جائز قرار دیتے ہیں کہ مالک باغ کسی کو اپنا باغ اس شرط سے بند و بست کرے کہ جو کچھ پھل آئے نصف و ثلث کے حساب سے تقسیم کر لیا جائے گا۔ البتہ مالکِ باغ کے لئے یہ جائز نہ ہوگا کہ کوئی متعین حصہ پھلوں کا مثلاً یہ کہ چار سو آم یا دو ہزار جام

لہ۔ ان دونوں حدیثوں کے سوا حدیث کی کتابوں سے اور بھی مواد فراہم کیا جاسکتا ہے جن سے معلوم ہوسکتا ہے کہ زمین کو آدمی خود جوتے یا بلا کرایہ کسی کو دیدے۔ یعنے یہ بات کی نقدی بھی کچھ نہ لے۔ بعض حدیثوں میں اس پر "ربوا" کے لفظ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ زمینداروں کے اس طبقے کو جو نہ خود کاشت کرتے ہیں اور نہ مفت دوسروں کو دیتے ہیں، بلکہ زمین کا کرایہ بہ شکل نقد یا غلہ کھاتے ہیں۔ کیا اسلام اس طبقے کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ یہ ایک اہم معاشی سوال ہے اور اس پر بحث کی کافی گنجائش ہے۔ ۱۲

اس معاملہ سے مستثنیٰ رہیں گے۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے باغ میں اسی قدر پھل آئے پھر بے چارے باغ لینے والے کو اپنی محنت کا کیا صلہ ملے گا۔ وہ سال بھر اس میں پانی دے گا، درختوں کو چھانٹے گا، حفاظت کرے گا، اور مالک باغ اس ناجائز شرط کی بناء پر پوری آمدنی اس کی لے لیگا۔

لیکن باوجود اس عمومی جواز کے خصوصیت کے ساتھ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مشہور اماموں میں ایک ایسے امام گذرے ہیں جو کاشت ہو یا باغ یعنے زراعت ہو یا مساقات دونوں صورتوں میں بٹائی کے طریقے کو ناجائز قرار دینے پر مصر ہیں۔ ان کا مذہب اس باب میں نہایت تعجب سے یہ نقل کیا جاتا ہے

ان لا یجوز المساقاۃ ولا المزارعۃ الا بالدراھم والدنانیر وما اشبھا ھما (طحاوی)	باغبانی کا معاملہ اور کاشت کاری کا معاملہ ہر دو صورت کے جواز کی شکل اس کے سوا نہیں ہے کہ ان کو درم و دینار وغیرہ (نقدی) کی شکل میں بندوبست کیا جائے،

اب تک تو دنیا نے امام کے اس خیال پر حیرت کا اظہار کیا ہی حتیٰ کہ ان کے دونوں مشہور شاگرد محمد بن حسن و قاضی ابو یوسف تک کے متعلق طحاوی کو لکھنا پڑا کہ

واما ابو یوسف ومحمد بن الحسن رحمھما اللہ قد ذھبا الی جوازھما جمیعاً۔	لیکن ابو یوسف اور محمد بن حسن دونوں کے دونوں (غیر نقدی شکل) کے سوا بھی ان معاملات کے جواز کے قائل ہیں، یعنے بٹائی پر بھی معاملہ ہوسکتا ہے۔

مگر اب شاید دنیا کی آنکھیں کھل رہی ہیں بٹائی سسٹم نے کتنی زمینوں کی زرخیزیوں کو روک رکھا ہے اس اندیشے سے کہ جو کچھ بویا جائے گا اس کے ایک بڑے حصے کا مالک

زمیندار ہو جاتا ہے۔ جو لوگ زمینداری اور کاشت کاری کے معاملات سے کچھ بھی لگاؤ رکھتے ہیں، جانتے ہیں کہ کسانوں کی ہمتوں کو اس چیز نے کتنا پست کر رکھا ہے کہ مذکورہ بالا خوف سے نہ کھیتوں پر پوری محنت کرتے ہیں نہ قیمتی پیداواروں کے لگانے کی ان میں جرات[1] ہوتی ہے۔

---

[1] ۔ موجودہ زمانے میں اس صورت حال کو دیکھ کر زمیندار جب چاہتا تھا کسان کو بے دخل بھی کر سکتا تھا اور اس پر لگان بھی بڑھا سکتا تھا۔ ایک تجویز سوچی گئی اور کچھ دن سے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس پر عمل ہو رہا ہے کہ کم از کم کسان کو بے دخل کرنے کا اختیار زمیندار کو نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اب کسان جو یہ کرنے لگے ہیں کہ کچھ خود جوتتے ہیں اور کچھ دوسروں کو نفع کی شرکت کی شرط پر بند وبست کر دیتے ہیں، یا بعض تو باوجود کاشت کار ہونے کے کچھ زمین دوسرے کسانوں سے آباد کراتے ہیں۔ جو خوف بے دخلی کا زمیندار سے کسان کو رہتا تھا وہی دغدغہ اب کسان کے کسان کو اصلی کسان سے رہتا ہے۔ پس اگر یہ حل زمینداروں کے تباہ کرنے کے لئے سوچا گیا تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر کسانوں کی ہمدردی میں ایسا کیا گیا ہے تو آخر اس ہمدردی کا مستحق کسان کا کسان کیوں نہیں ہے۔ بالفرض وہی حق کسان کے کسان کو بھی دیدیا جائے جو آج زمیندار کے مقابلے میں کسان کو بعض صوبوں میں حاصل ہے تو اگر یہی حرکت کسان کے کسان بھی کرنے لگیں یعنے دوسروں سے کھیت آباد کرائیں، اس وقت کیا ہوگا؟ آخر دور تسلسل کے قصے کو کہاں ختم کیا جائے گا۔ نیز مختلف افراد میں زمینوں کی مختلف مقدار کے آباد کرنے کی صلاحیت مختلف وجوہ سے مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً سرمایہ کی زیادتی یا گھرانے کا بڑا ہونا، اس لئے ہر کسان کے لئے کھیت کی مقدار کا معین کرنا بھی ملک پر ظلم ہوگا۔ میرے خیال میں تسلسل کے اس قصے کو چھیڑنا ہی غلط تھا۔

خدا کی زمین اپنی سرسبزی و شادابی اور اپنے نفع بخشی میں بہت آگے بڑھی ہوئی اگر امام کے اصول کو مان لیا جاتا۔ تاہم جیسے جیسے صنعتی کارخانوں سے مزدور و سرمایہ کا سوال آگے بڑھ کر اب زراعتی مزدور و سرمایہ داروں کے درمیان اہمیت حاصل کر رہا ہے۔ اسلام کے معاشی اصول بھی اپنے مقاصد سے نقاب الٹ رہے ہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ چل کر دنیا کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشورے پر چلنا پڑے

من کانت له ارض فلیزرعها او لیمنح اخاه فان ابی فلیمسک — جس کے پاس زمین ہو وہ اس میں خود کھیتی کرے یا اپنے بھائی کو جوتنے کے لئے دیدے اور اگر وہ اس سے بھی انکار کرے تو پھر چاہیے کہ روک رکھے

یہ بھی غور کرنا پڑے گا کہ بے ضرورت جو لوگ زمینوں پر قبضہ کئے بیٹھے ہیں نہ خود اسے آباد کرتے ہیں نہ ملک کے دوسرے ضرورت مند افراد کو ان سے استفادہ کا موقعہ دیتے ہیں۔ آخر یہ سوال کب تک معمّا بنا رہے گا۔

اس مسئلے کے متعلق ابھی اور بھی کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن میں بالفعل اسی پر بس کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ اس کے متعلق بعض اجزاء کا ذکر حکومت کی آمدنی کے ذیل میں بھی آئے۔

صرفِ دولت

حدیث "من این اکتسبه" کی تفصیل کے بعد "فیما انفقه" کے ٹکڑے کی

اب توضیح باقی رہ جاتی ہے اور اب آئندہ صفحات میں ہم اسی کے متعلق مختصر الفاظ میں اسلام کے نقطۂ نظر کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ گو عام مذاہب و ادیان میں مال و دولت کی بہت کچھ مذمت کی گئی ہے حتیٰ کہ اسی بنیاد پر مذہب اور دنیا کی نفرت دونوں قریب قریب ایک دوسرے کے مرادف ہو گئے ہیں، اور اسلامی مستندات میں بھی اس قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں لیکن مولانا روم کے مشہور شعر چیست دنیا والے نے تقریباً ہر پڑھے لکھے مسلمان تک اس دنیا کا صحیح مطلب پہنچا دیا ہے جس کی اسلام نے مذمت کی ہے، ورنہ سچ یہ ہے کہ اگر دولت کمانے میں آدمی خدا سے غافل نہ ہو اور اکتساب دولت کے جن قوانین کا تذکرہ گزشتہ اوراق میں کیا گیا ہے اگر ان قانونی جائز ذرائع سے مال حاصل کیا جائے اور خدا کے قائم کئے ہوئے حدود سے لاپروائی نہ برتی جائے تو صرف حدیثوں میں نہیں بلکہ قرآن میں بھی

ا موالکم التی جعل اللہ لکم قیاما۔	تمہارا مال جسے خدا نے تمہارے ٹھہراؤ اور قیام کا ذریعہ بنایا ہے،

کے عجیب و غریب جامع مانع الفاظ میں "مالی قوت" کی حقیقت بیان کی گئی ہے گویا حق تعالیٰ کی ذات جس طرح سموات و ارض کی کی قیوم ہے اسی "قیومیت" اور ٹھہراؤ کا ایک حصہ اس عالم مجاز میں "اموال" کو دیا گیا ہے یعنے بنی آدم کے ٹھہراؤ اور قیام کا ذریعہ مال ہے، یہ قرآن کا نظریہ ہے۔

انسانیت کی ہر آرزو اور اس کی تمنائیں زیادہ تر مالی قوت ہی کے ساتھ وابستہ ہیں اس لئے بعض روایتوں میں آیا ہے کہ

الدراھم والدنانیر خواتم اللہ فی ارضہ من جاء بخاتم	درہم و دنانیر (روپیہ اشرفی) اللہ کی مہریں ہیں، جو اپنے مالک کی

مولاہ قفصیت حاجتہ | پھر لے کر آئے گا اس کی حاجت
(طبرانی فی الاوسط) | پوری ہوگی،

قدرت کی ایک ایسی نعمت جس کے ساتھ ہمارا قیام وابستہ ہے ضرورت ہے کہ ہم اس کے صرف کرنے میں پوری احتیاط اور بیداری سے کام لیں اگرچہ یوں بھی قدرت نے انسانی فطرت میں مال کی حفاظت و صیانت کا جذبہ محفوظ کر دیا ہے قرآن ہی میں ہے

واحضرت الانفس الشح | نفوس انسانی لالچ کے سامنے حاضر کی گئی ہیں،

انسان کا یہی فطری شح (اور دولت کی لو) ہے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ صرف دولت میں لوگ اتنی لاپروائی نہیں برتتے جتنی حصولِ دولت میں عموماً برتی جاتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ صرف دولت پر اسلام نے اتنی پابندیاں نہیں عائد کی ہیں جتنی حصول دولت میں عائد کی گئی ہیں۔ مگر پھر بھی صرف دولت کے سلسلے میں اسلام کا جو "ہدایت نامہ" ہے گو وہ مختصر ہی سہی تاہم جو کچھ بھی اس باب میں ہدایتیں دی گئی ہیں، دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ عقل کی راہ سے آدمی اس وقت تک ان نکات تک نہیں پہنچا ہے۔

"صرفِ دولت" کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے سامنے چند سوالات کو رکھ لینا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کے پاس جب جائز اور قانونی ذریعے سے دولت جمع ہوگئی تو قدرتاً اس کے سامنے دو سوالات آتے ہیں یا ان کو آنا چاہیے۔

کن کن چیزوں پر اس دولت کو نہ صرف ہونا چاہیے۔ جب اس سوال کا جواب معلوم ہو جائے تب اس کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوگا کہ پھر کن چیزوں پر صرف کرنا چاہیے، اور یہی دوسرا سوال ہے، گویا پہلے سلب پھر ایجاب کی

تحقیق ہونی چاہیے۔

پہلے ہم سوال اول کو لیتے ہیں، یعنے اسلام کن چیزوں پر صرفِ دولت سے آدمی کو منع کرتا ہے۔

تبذیر ظاہر ہے کہ جب ہر جائز و ناجائز ذرائع سے اسلام دولت کمانے کی اجازت نہیں دیتا تو پھر ہر جائز و ناجائز خواہش کی تکمیل میں بھی صرفِ دولت کی وہ کیسے اجازت دے سکتا ہے۔ الغرض قانوناً جن افعال و اعمال سے اسلام نے روکا ہے، ان راہوں پر صرفِ دولت کا نام قرآن کی اصطلاح میں تبذیر ہے۔ قرآنی آیت:-

ولا تبذر تبذیرا — اور غلط مصارف پر ہرگز خرچ نہ کرو،

میں صرفِ دولت کے اس امتناعی قانون کا اعلان کیا گیا ہے، اگرچہ عام طور پر "تبذیر" اور "اسراف" کو لوگ ہم معنی خیال کرکے دونوں کا ترجمہ فضول خرچی کر دیتے ہیں، لیکن جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ صرفِ دولت کے یہ دو مستقل دفعات ہیں فضول خرچی کے معنی تو یہ ہیں کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے۔ مثلاً اگر کسی کا پیٹ جو کی روٹی سے بھر سکتا ہے، گیہوں کی روٹی کھانا اس کے لئے بایں معنی فضول خرچی ہوئی۔ پھر کیا اسلام میں یہ جرم ہے؟ گذر چکا کہ اسلام جب زیب و زینت اور آرایش تک کی ممانعت نہیں کرتا تو بھلا بجائے جو کے جو گیہوں کی روٹی کھاتا ہے اس کو "مبذر" کیسے اسلام میں قرار دیا جا سکتا ہے خصوصاً جب ہم اسی آیت کے بعد دیکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے تبذیر کرنے والوں کو

ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین وکان الشیطان لربہ کفورا — تبذیر کرنیوالے شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان تو اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

قرار دیا ہے "شیطان کا بھائی ہونا" اور اس کی صفت "کفوریت" میں مبذرین کو شریک کرنا یہ سزا کیا اس شخص کی قرآن مقرر کرسکتا ہے جو بجائے جو کے باوجود قدرت کے گیہوں کی روٹی کھاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ "تبذیر" کا مادہ "بذر" ہے، بذر کے معنی تخم کے ہیں، تبذیر تخم چھڑکنے کو کہتے ہیں، پھر جیسے کسان اپنے کھیت میں دانے ڈالتا ہے اور بغیر اس خیال کے چھڑکتا چلا جاتا ہے کہ دانے کہاں گریں گے کہاں نہ گریں گے، یہی حال اس شخص کا ہے جو اپنی دولت خرچ کرتا چلا جاتا ہے لیکن اس صرف میں اس کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ جائز خواہشوں پر خرچ کر رہا ہے یا ان خواہشوں پر جن کی تکمیل قانوناً جرم ہے۔ یہاں تک تو مبذر کسان کے مشابہ ہے لیکن آگے کسان کے دانے تو ایک سے سو پیدا کرتے ہیں، اس معاملے میں مبذر اس سے جدا ہو جاتا ہے بلکہ ٹھیک جو حال شیطان کا ہے وہی حالت اس کی ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ شیطان جیسا کہ اس قوت کا نام ہے جو بجائے خیر کے ہمیشہ شر اور برائی پر صرف ہوتی ہے۔ یہی حال مبذر کا ہے کہ خدا کی دی ہوئی مالی طاقت کو وہ بھی برائی اور شر کے حصول میں صرف کرتا ہے اسی لئے اس کا بھائی ہے اور جس طرح شیطان اپنی قوت کے غلط استعمال سے خدا کا ناشکرا قرار پایا یہی حال اس کی ناشکری کا ہے۔ الحاصل "تبذیر" کے صحیح معنی جو خود قرآن سے پیدا ہوتے ہیں وہ یہی ہیں کہ مال جو جائز خواہشوں کی تکمیل کے لئے انسان کو دیا گیا ہے اسے ناجائز خواہشوں اور غیر قانونی اعمال و افعال پر خرچ کرنا، مثلاً شاہد بازی، حرام کاری، شراب خواری وغیرہ قانونی جرائم پر جو دولت کو صرف کرتا ہے وہ "مبذر" ہے۔ پس "تبذیر" کے حقیقی معنی یہی ہیں۔ رہا اسراف، وہ اس سے بالکل جداگانہ چیز ہے، اپنے محل پر اس کا ذکر آئے گا تعجب ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں تبذیر کی یہ آیت ہے اسی کے بعد اسراف کے قانون کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، اگر دونوں

ایک ہی چیزیں ہوتیں تو پھر اس کو دہرانے کی کیا ضرورت ہوتی۔ جب "تبذیر" کی حقیقت واضح ہوگئی تو اب اس کا پتہ چلانا کہ مصارف کا کون سا سلسلہ تبذیر کے تحت میں داخل ہے اس کے لئے اسلامی جرائم کی فہرست اپنے سامنے رکھ لینا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ ان ہی جرائم میں سے ہر چیز پر دولت کا صرف کرنا تبذیر ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے تبذیر کی یہی تفسیر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ

ولو دانقا[1] اگرچہ ایک پیسہ ہی کیوں نہ ہو،

ظاہر ہے کہ جرائم پر ایک پیسہ بھی خرچ کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ایک روپیہ خرچ کرے اور اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ تبذیر کے معنی فضول خرچی کے نہیں ہیں ورنہ لازم آئے گا کہ ضرورت سے زیادہ ایک حبہ بھی خرچ کرنا شیطان کا بھائی بننا اور خدا کے کفور بندوں میں شریک ہونا ہے۔ حالانکہ ایسا دنیا میں کون ہے اور اسلامی تعلیمات کے یہ مطابق کب ہوسکتا ہے۔

"تبذیر" کے بعد صرفِ دولت کے متعلق اسلام میں اور بھی دو امتناعی قانون ہیں، جن میں ایک کی تعبیر اسراف سے اور دوسری کی تعبیر ریاء الناس سے کی جاتی ہے۔ طبعی ترتیب کا اقتضاء تو یہی ہے کہ ان دونوں قانون کی تشریح بھی اسی وقت کردی جائے۔ لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ان دونوں قانونوں کی صحیح حقیقت جیسی کہ وہ ہے اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب ہم پہلے صرفِ دولت کے ایجابی سوال کے جواب کو سمجھ لیں۔ اس لئے خلاف ترتیب میں اس وقت ان دونوں سے الگ ہوکر دوسرے سوال کو چھیڑ دیتا ہوں جیسا کہ میں نے کہا تھا سلبی سوال کے بعد دوسرا مرتبہ ایجابی سوال کا ہے۔

---

[1] تنویر المقیاس صفحہ (۱۲۵) جلد ۳ بر حاشیہ درمنثور ۱۲

کن چیزوں پر دولت کو صرف کرنا چاہیے۔

اسلام کے لئے یہ بڑا دلچسپ سوال ہے یعنے اس باب میں دنیا کے دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام نے اپنے خاص نقاط نظر پیش کئے ہیں۔ پہلی خصوصیت تو اسلام کی اس باب میں وہی ہے جس کا ذکر مختلف طریقوں سے پہلے بھی ہو چکا ہے یعنے اس نے صرف ضرورت کی حد تک مصارف کو محدود کرنے کا حکم نہیں دیا ہے جیسا کہ عموماً دنیا کے تمام مذاہب کے عام رجحانات ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو ضرورت میں بھی کمی کی جائے، حتیٰ کہ کھانا جتنے دن آدمی چھوڑ سکتا ہو چھوڑ دے۔ پانی ترک کر دے، سانس تک نہ لے، کپڑے بھی جہاں تک بدن سے اُتار سکتا ہو اُتار دے۔ گویا ان ہی چیزوں کو مذہبی جذبہ کے افراط کا ثبوت قرار دیا گیا ہے لیکن جیسا کہ میں بار بار دہراتا چلا آرہا ہوں کہ ضرورت تو بہرحال ضرورت ہے اسلام زینت و آرائش کے حدود تک بھی جانے والوں کو مذہبی دائرہ میں بلند سے بلند مقام عطا کرنے کے لئے تیار رہے، سلیمانی تخت پر بھی مذہبی مدارج کا سب سے بلند ترین درجہ یعنے نبوت تک مل سکتی ہے۔ رسول علیہ السلام کے خلیفہ برحق بھی ”الغنی“ کے لقب کو اپنے لئے باعث فخر قرار دے سکتے ہیں اور یہ بات اسلام کی ایسی خصوصیت ہے جس پر بحث کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔ جو کچھ اب تک اس سلسلے میں کہا جا چکا ہے وہی کافی ہے۔

دوسری خصوصیت اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ عموماً مذاہب نے دولت کے جائز مصارف کے بھی دو حصے کر دیے ہیں، ایک دینی مصارف دوسرے دنیوی مصارف، لیکن اسلام نے اس تقسیم ہی کو حذف کر دیا۔ اسلامی نقطہ نظر سے دولت کے سارے ایسے مصارف جنھیں عام طور پر دنیوی مصارف میں شمار کیا جاتا ہے وہ دینی مصارف بن سکتے ہیں، اسی طرح ایسے تمام مصارف جنھیں عام طور پر دینی مصارف خیال کیا جاتا ہے دنیوی بن سکتے ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ صرفِ دولت یا خرچ کے متعلق قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے دو دفعہ ماذا ینفقون (کیا خرچ کریں) کے الفاظ میں استفسار کیا۔ اس سوال کے جواب میں جو پہلا جواب قرآن نے دیا ہے وہ یہ ہے

قل ما انفقتم من خیر — کہہ "خیر" سے جو کچھ تم خرچ کرو

یعنے "خیر" اور "نیکی" کی راہ جسے عموماً دینی معارف بھی کہتے ہیں، اگر اس کے متعلق تمہارا سوال ہے تو اب تک جو یہ سمجھا جاتا تھا کہ صرف غریبوں اور مسکینوں کو دینا یہ "خیر" اور "خیرات" ہے۔ قرآن کہتا ہے یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ یتیموں اور مسکینوں کو دینا یہ بھی دینی خرچ ہے اور اپنے خاندان والوں مثلاً والدین یا اقربا اعزا پر خرچ کرنا یہ بھی "خیر" ہے۔ "خیر" کے معنی عربی میں "مال" کے بھی آتے ہیں، اور عموماً لوگوں کا ذہن اس آیت میں بھی اسی معنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے حالانکہ آیت کو ختم کرتے ہوئے

و ما تنفقوا من خیر فان اللہ بہ علیم — اور نیکی کی راہ سے جو کچھ تم خرچ کروگے تو خدا اس سے باخبر ہے۔

میں "خیر" کے جو معنی یہاں مراد ہیں اس کو متعین کر دیا گیا ہے کہ "خیریت" اور "نیکی" کا مدار اس پر ہے کہ حق تعالیٰ تمہارے اس خرچ کے متعلق کیا جانتے ہیں، یعنے اگر تم نے اپنے اقربا اور خاندان والوں پر اس لئے خرچ کیا ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ حکم ہے تو تمہارا یہ خرچ جو بہ ظاہر دنیوی خرچ سمجھا جاتا ہے دینی خرچ ہے اور یتامیٰ و مساکین پر جو تم صرف کر رہے ہو اگر اس سے خدا کی مرضی کا اتباع مقصود نہیں ہے تو گو بہ ظاہر وہ کتنا ہی بڑا دینی صرف سمجھا جائے لیکن پھر بھی وہ دنیوی خرچ ہی ہے۔ قرآن میں تو اس کی طرف کلیاتی رنگ میں اشارہ کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر جو تفصیلات اس باب میں ارشاد فرمائے ہیں حدیث کی کتابوں میں ان کا ایک ذخیرہ پایا جاتا ہے۔

اس اصول کی تشریح میں کہ عام طور پر جسے دنیوی خرچ سمجھا جاتا ہے صرف

نیت اور نقطہ نظر کی تصحیح سے وہ بھی دینی خرچ بن جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں

ان المسلم اذا انفق علی اھلہ نفقۃ وھو یحتسبھا کانت لہ صدقۃ (بخاری مسلم)	اپنی بیوی پر آدمی جو خدا کو سامنے رکھ کر خرچ کرتا ہے یہ اس کی طرف سے صدقہ ہے،

صرف یہی نہیں کہ وہ دینی خرچ بن جاتا ہے بلکہ تمام دینی مصارف میں اس دنیوی خرچ کو برتری حاصل ہے، فرمایا جاتا ہے

دینارا نفقتہ فی سبیل اللہ دینارا نفقتہ فی رقبۃ دینارا تصدقت بہ علی مسکین دینارا نفقتہ علی اھلک اعظمھا اجرا للذی انفقت علی اھلک (مسلم)	وہ اشرفی جسے اللہ کی راہ میں تم نے خرچ کی اور وہ اشرفی جو غلام آزاد کرانے میں صرف کی اور وہ اشرفی جو کسی مسکین پر تم نے صدقہ کیا اور وہ اشرفی جو تم نے اپنی بیوی پر خرچ کیا، ان تمام اشرفیوں میں ثواب اور اجر کے حساب سے سب سے بڑی وہ ہے جسے تم نے اپنی بیوی پر خرچ کیا،

اور بیوی بچوں کو تو خیر ایک حد تک غیر بھی قرار دیا جا سکتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی آگے بڑھ کر ارشاد فرمایا کہ آدمی خود اپنی ذات پر جو دولت صرف کرتا ہے یہ بھی صدقہ ہے۔ مسند احمد کی حدیث ہے

ما اطعمت نفسک فھو لک صدقۃ ما اطعمت ولدک فھو لک صدقہ ما اطعمت	تم نے خود اپنے کو جو کھلایا یہ بھی تمہاری طرف سے صدقہ ہے جو اپنی اولاد کو کھلایا یہ بھی تمہاری طرف سے

زوجک فھولک صدقة	صدقہ ہے اور اپنی بیوی کو جو کھلایا
ما اطعمت خادمک فھولک	وہ بھی تمھاری طرف سے صدقہ ہے
صدقة	اور اپنے نوکر کو جو کھلایا وہ بھی تمھاری طرف سے صدقہ ہے،

خلاصہ یہ ہے کہ "احتساب" (یعنے حق تعالیٰ کی مرضی مبارک کو اپنے دھیان میں سامنے رکھ کر) تبذیر کے سوا دولت کے تمام مصارف "صدقہ" اور دینی خرچ ہیں، گویا مشہور حدیث "انما الاعمال بالنیات" کا ایک مصداق یہ بھی ہے، لیکن "صدقہ" کے باب میں "احتساب" کا مفہوم کتنا وسیع ہے! اس کے سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے سامنے مسند احمد کی اس حدیث کو رکھ لینا چاہیے جس میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ارشاد فرمایا کہ

مباضعتک اھلک صدقة	تیرا اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستر ہونا یہ بھی صدقہ ہے،

حضرت ابوذرؓ نے اس پر سوال کیا کہ

انصیب شھوتنا ونوجر	ہم اپنی خواہش بھی پوری کرتے ہیں اور ثواب بھی دیا جائے گا؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا

لو وضعته فی غیر حقه کان علیه وزر	تم سمجھتے ہو کہ اگر اس خواہش کو بے موقعہ تم پوری کرتے تو کیا اس کا گناہ تم کو نہ ہوتا،

ابوذرؓ نے فرمایا بلیٰ (کیوں نہیں) اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "احتساب" کے اس معنیٰ کو بیان فرمایا جس کے بعد تقریباً ہر مسلمان کا جائز فعل صدقہ بن جاتا ہے، ارشاد ہوا کہ

افتحتسبون بالسیئۃ ولا تحتسبون بالخیر	تم لوگ برائی کا احتساب کرتے ہو اور خیر و نیکی کا احتساب نہیں کرتے،

"الغرض" اپنے مال کو جرائم میں نہ استعمال کر کے جو خود اپنے اوپر اپنے عیال پر، خاندان پر خرچ کرے گا یہ سارے مصارف "صدقہ" اور دینی مصارف میں شمار ہوں گے۔

ریاء الناس

لیکن ٹھیک جس طرح دنیوی مصارف "احتساب" کے قانون کی بنا پر دینی مصارف بن جاتے ہیں بعینہٖ ہمارے نام دینی مصارف دنیوی بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ یعنے "تبذیر" کے تحت داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟ قرآن ہی نے اس کو ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے

الذین ینفقون اموالھم	جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال کو لوگوں کو
رئاء الناس ولا یومنون باللہ	دکھا کر اور اللہ اور قیامت کے
ولا بالیوم الآخر ومن یکن	دن پر ایمان نہیں لاتے اور جس کا
الشیطان لہ قرینا فساء	ساتھی شیطان ہو، اس کا بہت برا
قرینا	ساتھی ہے،

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی نیکی کے بہترین کام ہی میں کیوں نہ خرچ کرے لیکن اگر اس نے یہ سارا خرچ "الناس" (لوگوں) کو دکھانے کے لئے کیا ہے اور اس کے سامنے نہ خدا ہے اور نہ روز جزا ہے بلکہ صرف چند لوگوں پر اپنی دولت کی دھونس جمانا، محلہ، ٹولے، بستی یا شہر ملک یا دنیا میں نام آوری حاصل کرنا، اپنی بڑائی اور کبریائی کا اعلان مقصود ہے تو جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا اس شخص کے ساتھ وہی برخود غلط طاقت یعنے شیطانی قوت ساتھ لگ گئی ہے، اپنی مالی طاقت کو غلط محل پر اسی طریقے سے خرچ کر رہا ہے جیسے شیطان نے اپنا استعمال غلط کر دیا۔ دوسری جگہ اسی "ریاء الناس" والے خرچ

کے متعلق ارشاد ہے کہ

مثله کمثل صفوان علیه تراب	اس شخص کی مثال ایسی ہے کہ چٹان پر
فاصابه وابل فترکه صلدا لا	گرد ہو، اور اس پر بارش برسے پھر
یقدرون علی شئ مما کسبوا	اسے سپاٹ بنا چھوڑے ایسے لوگ
واللہ لایھدی القوم الکافرین	جو کچھ کماتے ہیں اس کے کسی حصہ پر
	قابو نہیں رکھتے اور ناشکروں کی
(آل عمران)	خدا رہنمائی نہیں کرتا،

ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ اور اس کے انعام کے دن کو چھوڑ کر جو محض لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے وہ یہی کرتا ہے کہ اپنی امیری اور دولت مندی کے نشانات لوگوں کے حافظوں اور دلوں پر قائم کرنا چاہتا ہے، اپنے بچوں کی شادیوں میں دھوم مچانے والے تقریبات پر روپے لٹانے والوں کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے، لیکن تجربہ شاہد ہے کہ ان لوگوں کی یہ ساری مالی زور آزمائیوں کا اثر عوام کے قلوب پر چند دنوں سے زائد قائم نہیں رہتا۔ ٹھیک اس کی مثال وہی ہے جو قرآن نے بیان کی ہے کہ چٹان پر گرد بیٹھی، پانی کا ایک چھینٹا آیا اور سب صاف۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ چاندی اور سونے کے گزوں اور لاٹھیوں سے یہ لوگ عوام کے دل و دماغ میں جو اپنے لڑکے کے ختنوں یا شادیوں کی یاد کو ٹھونسنا چاہتے ہیں، خواہ مخواہ کسی کے پاس اتنا وقت کہاں ہے جو اپنے حافظوں کو ان بوالفضولوں کے مصارف کی یاد کے لئے ہمیشہ بیدار رکھے۔ تماشا ہوا، دیکھ لیا گیا اور لوگ بھول گئے۔

الحاصل "الناس" کو پیش نظر رکھ کر جو دکھاوے کا خرچ کرتے ہیں یہ اپنے تمام مصارف خواہ بہ ظاہر وہ کتنے ہی دینی نظر آتے ہوں، مثلاً کسی مدرسہ کو دیں، مسجد بنائیں، پبلک ورکس میں دیں، ہسپتالوں پر خرچ کریں، کچھ بھی کریں، قرآن کے رو سے یہ سب دنیوی، بلکہ شیطانی خرچ بن جاتا ہے۔

اور یہی میرا دعویٰ تھا کہ اسلام نے دینی اور دنیوی مصارف کی ان دو قسموں کو

ختم کر کے صرف دینی یا صرف دنیوی خرچ میں دولت کے مصارف کو منحصر کر دیا ہے۔

یہاں ایک نکتہ کا ذکر ضروری ہے، اسلام نے یہاں اس قسم کے عجیب قوانین پیش کئے ہیں ان ہی میں اس کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انسانی فطرت کے طبعی رجحانات اور جبلی عواطف و میلانات کی بھی ساتھ ساتھ رعایت کرتا جاتا ہے اور کوئی ایسی تدبیر نکال لیتا ہے جس کے ذریعہ سے اصل مقصد جو اس کا ہے وہ بھی فوت نہ ہو اور عام انسانی کمزوریوں کا بھی نباہ ہو جائے۔

یہی "رِیا الناس" والا قانون ہے۔ عقلاً اس کے بے نتیجہ ہونے اور غلط مصرف ہونے میں کیا شبہ ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا مگر کیا کیجئے کہ انسان میں دولت کی نمائش کا جذبہ بھی تقریباً فطری ہے۔ دولت کمانے والے بہر حال کچھ اس کی نمائش بھی چاہتے ہیں اسی جذبہ کی یہ رعایت ہے جس کا سُراغ ان حدیثوں سے ملتا ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دولت مندوں کو پھٹے اور بُرے حال میں دیکھ کر دریافت فرمایا کہ

الک مال (کیا تمھارے پاس مال ہے) جواب میں کہا گیا نعم (ہاں) آپ نے فرمایا من ای المال (کس قسم کے اموال تمھارے پاس) جواب ملا من کل المال (ہر قسم کا مال، مثلاً اونٹ، گھوڑے، بکریاں، غلام سب ہی کچھ ہیں، یہ اس شخص نے کہا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تب اس سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا

فاذا اتاک اللہ مالا فلیرا ثر	جب خدا نے تمھیں مال دیا ہے تو چاہیے کہ
نعمۃ اللہ علیک وکرامتہ	اللہ تعالیٰ کی نعمت اور جو تمھیں سرفراز
(نسائی)	کیا ہے وہ دکھایا جائے،

ظاہر ہے کہ دکھایا جائے گا تو الناس ہی کو دکھایا جائے گا جس کے معنی یہی ہوئے کہ لوگوں کو اپنی مالی حیثیت دکھانی چاہیئے اس کا حکم ہے، لیکن اس بُرائی کی تفیخ کے لئے احتساب کا ایک پہلو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکال لیا وہ یہ ہے کہ اپنی دولت و نعمت کو خدا کا

عطیہ قرار دے کر اور اس نیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر دولت کی نمایش کی جائے گی تو یہ دکھانا اور "ریاء الناس" بھی حق تعالیٰ ہی کے لئے ہوا۔ اس لئے جس بربادی یا دولت کے غلط استعمال کا جو خطرہ تھا وہ جاتا رہا۔ اسی نقطہ نظر کو ایک اور حدیث میں اور زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے کہ

ان اللہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہ (ترمذی)

اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتے ہیں کہ اپنی نعمت کے نشانات کو اپنے بندے پر دیکھیں،

گویا "الناس" کو یہ دکھانا، الناس کو دکھانا نہیں ہے بلکہ اپنے مالک ہی کو دکھانا ہے کہ وہی اس کو پسند فرماتا ہے کہ جن پر اپنی نعمتیں نازل کروں وہ دوسروں کو یہ دکھائیں کہ ہمارے خدا کی یہ نعمتیں ہم پر ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہی "انما الاعمال بالنیات" کے قانون سے "ریاء الناس" جیسا لغو بلکہ شیطانی فعل بھی ملکوتی صفت بن جاتا ہے اور ان سارے معاملات کا تعلق باطن اور "اندر" سے ہے۔ کون کس لئے کیا کر رہا ہے اس کا فیصلہ "یوم تبلی السرائر"[1] ہی کے دن ہوگا کہ اب تک سائنس کسی ایسے آلہ کی ایجاد میں کامیاب نہیں ہوئی ہے جس کے ذریعہ سے لوگوں کی نیتوں کا حال معلوم ہو سکے۔

خیرات اور صدقات بہر حال دولت کے مصارف میں اسلام کی دوسری خصوصیت یہی ہے کہ اس نے دینی و دنیوی دو قسم کے مصارف کا باب حذف کر دیا، اور اب باب صرف دنیوی مصرف دولت کا رہ گیا ہے، یا صرف دینی کا اور "صدقہ" کی وسعت دامانی کا حال جب یہ ہے کہ ناجائز مصارف سے بچا کر جائز مصارف میں خرچ کرنا بھی اسلام میں خیرات اور صدقہ ہے تو ظاہر ہے کہ مسلمان کا شائد کوئی جائز خرچ ایسا نہیں نکل سکتا جو خیرات اور صدقہ کی مد میں داخل ہو کر دینی خرچ نہ بن جاتا ہو، البتہ ان دینی مصارف میں پھر اسلام نے ایک ترتیب

---

[1] جس دن دلوں کے بھید نمایاں کئے جائیں گے۔

قائم کی ہے۔

سب سے پہلا حق تو آدمی کا خود اپنا ہے اور اس لئے اسلام نے یہ ناجائز قرار دیا ہے کہ کوئی اپنے کو قتل کر دے یا اپنے کسی عضو کو ضائع کرے یا بگاڑ دے حتیٰ کہ اسلامی قانون کے رو سے کسی کو اس کا بھی حق نہیں ہے کہ کھانا یا پینا اس حد تک چھوڑ دے کہ اس کی جان جاتی رہے اس کا کوئی عضو خراب ہو جائے۔

زیلعی میں ہے

ھلاک النفس او العضو بالامتناع عن المباح حرام (شامی صفحہ ۹۲ ج ۵)	جائز اور حلال چیز کو چھوڑ کر اپنی جان ضائع کرنی یا کسی عضو کو نقصان پہنچانا حرام ہے،

بہر حال دولت کا سب سے پہلا مصرف خود کمانے والے کی ذات ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث مروی ہے

اذا کان احدکم فقیرا فلیبدء بنفسہ (مغنی صـ ۲۵۸)	تم میں جو کوئی نادار مفلس ہو تو چاہیے کہ خرچ کی ابتداء خود اپنی ذات سے کرے،

دوسری حدیث ہے

ابدء بنفسک ثم من تعول (المغنی صفحہ)	پہلے اپنی ذات سے شروع کرو، پھر ان پر جو تمھارے زیر پرورش ہیں،

ابو داؤد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے آکر پوچھا کہ میرے پاس ایک اشرفی ہے کیا کروں۔ پہلا جواب اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی دیا کہ

تصدق بہ علی نفسک	اپنی ذات پر اسے خیرات کرو، یعنے خرچ کرو،

اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے اوپر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ پہلا مصرف اسلام نے خود کمانے والے کی ذات کو قرار دیا ہے اس کے بعد ان لوگوں کے مصارف کا درجہ ہے جن کی پرورش کا وہ قانوناً ذمہ دار ہے۔ مشہور حدیث ہے

وابدء بمن تعول	شروع کرو خرچ کرنا ان لوگوں سے
(صحاح ستہ)	جو تمھارے زیر پرورش ہیں،

فقہاء نے اس سلسلہ میں بیوی بچے اور ان کے مختلف قانونی حالات کو تفصیل کے ساتھ طویل دفعات کے تحت بیان کیا ہے جن کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔

ان لوگوں کے بعد پھر ایسے ماں باپ کے مصارف واجب ہیں جو فقیر ہوں۔ ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ

اجمع اہل العلم علی ان نفقة	علم والوں کا اس پر اتفاق ہے کہ
الوالدین الفقیرین اللذین	ایسے نادار والدین جن کی نہ کمائی ہو،
لاکسب لهما ولامال واجبة	اور نہ ان کے پاس مال ہو، ان کا
فی مال الولد	خرچہ اولاد کے مال پر واجب ہے،

"والدین" کے مصارف قانونی طور پر تو اسی وقت واجب ہوتے ہیں جب وہ واقعی محتاج ہوں یعنے حکومت مجبور کر کے لڑکے کے مال سے والدین کے مصارف کی پابجائی کرے گی۔

لیکن غیر قانونی طور پر یعنے حکومت جبر تو نہیں کر سکتی لیکن اخلاقاً والدین کی خدمت اپنے مال کا سب سے بڑا مصرف ہے۔ خصوصاً اس سلسلہ میں "ماں" کے حق کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ کس کے ساتھ حسن سلوک کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

امک امک	ماں کے ساتھ ماں کے ساتھ ماں کے ساتھ

ثم الاقرب فالاقرب	پھر جو قریب تر رشتہ دار ہو،
(ابو داؤد)	اور جو اس کے بعد،

پھر آپ نے خود ہی تشریح بھی فرمائی

امک واباک اختک واخاک	ماں کو دو، باپ کو، بہن کو، بھائی کو
ادناک فادناک (صحاح)	قریبی رشتہ دار کو پھر جو ان کے بعد قریب ہوں،

رشتہ داروں کو غیروں پر اسلام نے کیوں ترجیح دی، اس کی وجہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر یہ بیان فرمائی کہ ایسی صورت میں

له اجران اجر القرابة	دینے والے کو دو ثواب حاصل
واجر الصدقة	ہوتا ہے رشتہ داری کا ثواب
(بخاری ومسلم)	اور صدقہ کا ثواب،

الغرض یوں ہی درجہ بدرجہ مصارف کا استحقاق آگے بڑھتا چلا گیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس میں بھی اسلام نے انسان کی فطرت کے ایک خاص میلان کا لحاظ رکھا ہے۔ یوں تو لوگ دوسروں پر بھی خرچ کرتے ہیں، لیکن مختلف تعلقات اور موثرات کے تحت آدمی کا میلان زیادہ تر اپنے رشتہ داروں ہی کی طرف ہوتا ہے مگر خدا جانے دنیا والوں نے یہ کیسے سمجھ رکھا تھا کہ اپنوں پر خرچ کرنا تو خود غرضی ہوئی اور خود غرضی کے بعد نیکی کہاں؟

اسلام نے صلہ رحمی کو نیکی کا ایک باب قرار دے کر اس فعل کو جسے فطرتاً آدمی کا جی چاہتا تھا، نقطۂ نظر کی تھوڑی سی تبدیلی سے خیرات و صدقات میں شریک کر دیا، اور یہ ایک ایسا نظم ہے کہ ہر شخص بآسانی اس کو انجام دے سکتا ہے۔ لوگ اپنے رشتہ داروں کے ان اسلامی ذمہ داریوں کا احساس اگر کرنے لگیں تو بے روزگاری، محتاجی کے نالوں کی آواز کچھ دھیمی پڑ سکتی ہے۔

بہرکیف یہ تو صرف دولت کی ایک تنظیمی ترتیب ہے۔ اس سلسلہ میں بعض مصارف تو فرض ہیں جیسے اپنے بیوی بچوں اور والدین کے مصارف جب وہ فقیر ہوں ازیں قبیل بھائی بہن وغیرہ بلکہ دُور کے رشتہ داروں کے مصارف بھی بعض حالات میں آدمی پر فرض ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر نصاب کا آدمی مالک ہو تو پھر اسلام نے ہر شخص کے مال میں فقراء، غرباء، غارمین، مقروضین وغیرہ کا جو حق قائم کیا ہے جس کی تفصیل حکومت کی آمدنی میں گزر چکی ہے ان مصارف کا شمار بھی فرائض میں ہے، فرائض کے ادا کرنے کے بعد اسلام نے آدمی کو اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو اپنے مال سے اور بھی خرچ کر سکتا ہے، یہی مقام ہے جہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہاں تک خرچ کر سکتا ہے اس کے تو دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام نے آدمی کو اس معاملہ میں بہت دُور تک آزادی دے رکھی ہے بلکہ قرآن مجید نے یہ اصول مقرر کر کے

لینفق ذو سعة من سعته	وسعت وگنجائش والوں کو چاہیے کہ
ومن قدر علیه رزقه فلینفق	اپنی گنجائش کے لحاظ خرچ کریں،
مما اتاه الله	اور جس کی روزی نپی تلی کر دی گئی
	ہے چاہیے کہ جو کچھ اسے خدا نے
	دے رکھا ہے اس سے خرچ کرے،

گویا اس اصول کی طرف راہنمائی کی ہے کہ اپنے مصارف کے مدارج آمدنی کی حیثیت سے رکھنی چاہیے، یہی بات ہے جس کی طرف ان حدیثوں میں اشارہ کیا گیا ہے کہ جب خدا کی نعمت کسی پر ہو تو چاہیے کہ نعمت کے اثر کو اپنے اوپر دکھائے (جیسا کہ گذر چکا) لیکن کیا اس سلسلہ میں اسلام نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے کہ کیا ایک مسلمان کے لئے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے سارے مال و منال زمین و جائداد کو کھا پی کر برابر کر دے۔ گذشتہ ابواب میں اس حدیث کے ایک ٹکڑے کا ذکر

آچکا ہے جس میں آیا ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سونے کا ٹکڑا یہ کہتے ہوئے پیش کیا کہ میری طرف سے صدقہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی جانب سے منھ پھیر لیا، اس نے پھر توجہ دلائی، بار بار وہ توجہ دلاتا تھا اور آپ بے رُخی برتتے تھے تا آنکہ جب اس کا اصرار حد سے گزر گیا تب مجبوراً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ٹکڑے کو ہاتھ میں لے لیا اور اس کے بعد اس زور سے اس شخص کی طرف پھینکا کہ راوی کا بیان ہے

لو اصابتہ لاوجعتہ اولعقرتہ　　　　اگر اس پر پڑ جاتا، تو اسے دکھ پہنچتا یا زخمی ہو جاتا،

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ تم میں ایک شخص اپنا سارا مال اُٹھا کر لے آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صدقہ ہے، اس کے بعد خالی ہاتھ ہو کر گھر میں بیٹھ جاتا ہے پھر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا پھرتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے وہ مشہور فقرہ استعمال فرمایا

خیر صدقۃ ما کان عن ظھر غنی　　　　سب سے اچھا صدقہ وہ ہے جو تونگری کی پشت پناہی میں ہو،

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنا سارا مال خرچ کر ڈالیں اور دراصل یہی وہ مسئلہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات میں کیا گیا ہے۔

میں اپنی اس بحث کو اسی مسئلہ پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا

ماذا ینفقون　　　　کتنا خرچ کریں مسلمان

کا سوال پوچھا گیا۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا

قل العفو　　　　کہہ کہ "العفو"

یعنی "عفو" خرچ کریں۔ یہ "عفو" کیا چیز ہے؟ اس کا جواب بعد کو دیا جائے گا۔ پہلے دوسری آیتوں کو بھی نقل کرلوں۔

سورۂ اسرائیل میں ارشاد ہے

ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطھا کل البسط فتقعد ملوماً محسورا

اور تم اپنے ہاتھ کو اپنی گردن میں نہ ڈالو، اور نہ اس کو اتنا کھولو کہ بالکل کھل جائے (کیونکہ اگر ایسا کروگے) تو بیٹھ جاؤ گے اس حال میں کہ لوگوں کی ملامت کے نشانہ بنے ہوئے ہو، اور درماندہ ہو۔

پھر سورہ "الفرقان" میں ہے

الذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلک قواما

جو لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ حد سے گذرتے ہیں، اور نہ تنگی پیدا کرتے ہیں، بلکہ ہوتا ہے خرچ ان کا درمیان ان دونوں راہوں کے اندازہ کے ساتھ،

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ تینوں آیتوں میں قریب قریب ایک ہی مضمون بیان کیا گیا ہے "العفو" کا عام طور پر مطلب یہ لیا گیا ہے کہ جو بآسانی ہو سکے اور پچھلی دو آیتوں میں تو ظاہر ہی ہے کہ خرچ کے باب میں "اعتدال" کی فہمائش کی گئی ہے۔ امام رازی اور ان کے سوا بھی عموماً "العفو" کا مطلب یہی کہتے ہیں کہ اس کا تعلق

فما یفضل عن حاجتہ الانسان فی نفسہ وعیالہ

آدمی کی ذات اور اہل وعیال کی ضرورت سے جو بچ جائے۔

یعنے اپنے اور اپنے اہل وعیال و زیر پرورش لوگوں کے مصارف سے جو بچ جائے قرآن حکم دیتا ہے کہ ان سب کو خرچ کر دو۔

مگر ابھی حدیث گذر چکی جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت کے ساتھ سونے کے ڈلے والے آدمی کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ

خیر الصدقة ما کان عن ظهر غنی (البخاری)	بہترین صدقہ وہ ہے جو تونگری کی پشت پناہی میں ہو،

مشہور شارح حدیث امام خطابی "ظهر غنی" کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں

ای عن غنی یعتمد علیه ویستظهر به علی النوائب اللتی تنوبه	یعنے ایسی تونگری جس پر بھروسہ کر سکتا ہو، اور جس کی پشت پناہی حاصل کر سکتا ہو اس وقت جب مصائب اور حوادث کا وہ شکار ہو،

خطابی نے اس مطلب کو بیان کرتے ہوئے اپنی تائید میں دوسری حدیث پیش کی ہے جس میں ہے کہ

خیر الصدقة ما ابقت غنی	بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی کی تونگری کو باقی رکھے،

جس کا صاف مطلب یہی ہوا کہ "صدقہ" یا "انفاق" یا "خرچ" کرتے ہوئے اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اتنا سرمایہ آدمی کے پاس رہ جائے جس سے وہ آئندہ آمدنی حاصل کرنے یا مصارف پیش آنے میں مدد لے۔ خطابی کے الفاظ "یستظهر بہ" (یعنے جس سے پشت پناہی حاصل کر سکے) کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

ماسوا اس کے سمجھ میں نہیں آتا کہ خود قرآن نے جب یہ ممانعت کی ہے کہ آدمی کل البسط کے طور پر یوں خرچ نہ کرے کہ گھر میں جا کر ذلیل و رسوا، تھکا ماندہ بن کر اسے بیٹھنا پڑے۔ حدیث میں بھی حضور نے یہی فرمایا کہ "لوگوں کے

سامنے اس کے بعد ہاتھ پھیلانا پھرے"۔

سعد بن ابی وقاص کی حدیث بھی گذر چکی جس میں آپ نے کل مال کے صدقہ سے منع فرمایا اور فرمایا کہ کیا تم اس کو پسند کرتے ہو کہ تمہاری اولاد تمہارے بعد ہاتھ پھیلاتی پھرے۔

علی الخصوص جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعضوں کا ذریعۂ معاش کوئی سرمایہ مثلاً تجارت کی پونجی یا زمین یا باغ یا مکان وغیرہ ہوتا ہے اور بعض لوگ محنت ومزدوری نوکری کرکے زندگی گزارتے ہیں ثانی الذکر طبقہ اگر روز جو کچھ کمائے خرچ کردے تو چونکہ دوسرے دن یا دوسرے مہینہ اس کو پھر آمدنی کی توقع ہے اس لئے اس کو تو شائد دست نگرکسی کا نہ ہونا پڑے، لیکن اول الذکر طبقہ اگر "العفو" کا وہی مطلب سمجھ کر جو عام طور پر سمجھا یا گیا ہے اپنی پونجی یا زمین ومکان، باغ کو بھی ختم کردے، کیونکہ بال بچوں کے کھلانے پلانے کے بعد یہ اس کا سرمایہ تو باقی ہی رہ جاتا ہے۔ تو کیا اس کو دوسرے دن ملوم ومحسور ہوکر بیٹھنا نہ پڑے گا۔

میرے خیال میں اسی لئے "العفو" کا مطلب وہی ہے جو واحدی سے امام رازی نے نقل کیا ہے

اصل العفو فی اللغۃ الزیادۃ قال اللہ تعالیٰ خذ العفو ای الزیادۃ قال انٰی حتی عفوا ای کثروا	"العفو" کے معنی لغت میں زیادتی کے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لوگوں سے "العفو" یعنے زیادتی نیز ارشاد باری ہے حتی عفوا یعنے اس قوم کے لوگ جب بڑھ گئے اور بہت ہو گئے،

مطلب یہ ہے کہ گزشتہ بالا طبقوں میں سے وہ طبقہ جس کی گزربسر کسی "سرمایہ" یا "جائداد" "زمین" "مکان" وغیرہ کی آمدنی پر ہے یا معاشی اصطلاح میں یوں کہئے جو شغل اصل کے

منافع سے اپنی معاشی ضرورتیں پوری کرتا ہے ان کے متعلق تو اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ "العفو" یا ("الزیادہ") کی حد سے آگے نہ بڑھیں یعنے اصل کو محفوظ رکھتے ہوئے جو زائد آمدنی ہو اس کو خرچ کرتے رہیں کہ ان کا یہی خرچ عن ظھر غنی ہوسکتا ہے۔

مشہور امام لغت الفراء سے منقول ہے

قوله تعالیٰ قل العفو وهو فضل المال	اللہ تعالیٰ کا ارشاد جو "قل العفو" ہے اس سے مراد المال (سرمایہ) فضل یا بڑھوتری ہے،
(لسان العرب)	

جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "العفو" مال کی زیادتی اور آمدنی کو کہتے ہیں۔ پھر صاحب لسان العرب ہی نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لا اعفی قتل بعد اخذ الدیۃ	دیت (خون بہا) لینے کے بعد لینے والوں نے عفو نہ کیا،

پھر "اعفی" کے لفظ کا ترجمہ کرتے ہیں

ای لاکثر ماله ولا استغنی	یعنے اس کا مال نہ بڑھے اور نہ وہ خوش حال ہو،

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ "سرمایہ" کی آمدنی یا "اصل" کے "منافع" کو "العفو" کہتے ہیں۔ پس اس قسم کے لوگوں کے لئے میرے خیال میں ادائی فرائض کے بعد عام مصارف و انفاق میں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ حتی الوسع "اصل" کو ضائع نہ کریں۔

یہ حدیث جو مسند احمد ابن ماجہ وغیرہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لایبارک فی ثمن ارض ولا دار	نہ برکت دے اللہ اس زمین اور
لایجعل فی ارض ولا دار	اس گھر کی قیمت میں جو پھر زمین ہی
(مسند احمد)	یا گھر ہی میں جگا دی جائے،

ابن ماجہ کے الفاظ یہ ہیں

من باع دارا وعقارا فلم یجعل ثمنه فی مثله کان قمناً ان لایبارک فیه	جو شخص کوئی گھر یا جائداد جب فروخت کرے اور پھر اسے اسی جیسی چیز یعنے گھر یا جائداد کے خریدنے میں نہ لگا دے تو وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کے مال میں برکت نہ دی جائے،

یحیٰی بن آدم القرشی نے اپنی مشہور مستند کتاب "الخراج" میں بھی اس حدیث کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے

لایبارک فی ثمن ارض او دار الا ان یجعل فی ارض او دار	نہیں برکت دی جاتی زمین اور گھر کی قیمت میں مگر یہ کہ پھر اس قیمت کو زمین یا گھر ہی میں لگا دی جائے،

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسی چیزیں جو "اصل" کی حیثیت سے کام کرتی ہیں اولاً ان کو الگ ہی نہ کرنا چاہیے اور اگر کسی ضرورت (مثلاً تبدیل مقام یا اور کوئی وجہ سے) آدمی ان کو الگ کرے بھی تو چاہیے کہ ان کے روپے کو پھر کسی ایسی چیز میں لگا دے جو "اصل" کا کام دے سکیں۔

یہ حکم تو ان لوگوں کے لئے ہوا جن کے مال میں "الاصل" اور "العفو" کی صورت بھی پیدا ہو سکے۔ باقی جن کی گزر اوقات کسی "اصل" کی آمدنی پر نہیں ہے مثلاً ملازم پیشہ یا مزدوری وغیرہ کرتے ہیں ان کو اپنے مصارف میں کس قانون کی پابندی کرنی چاہیے۔ اس کا جواب سورۂ بنی اسرائیل کی آیت

لا تجعل یدک الی عنقک ولا تبسطها کل البسط	نہ ڈالو اپنے ہاتھ کو اپنی گردن اور نہ کھولو اس کو پورے طور پر کھول دینا،

اور سورۂ "الفرقان" کی آیت

الذین اذا انفقوا لم	جو لوگ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ

یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالک قواما	اسراف کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں، اور ہوتی ہے راہ ان کی ان کے درمیان "قوام"،

"قواما" کی تفسیر کرتے ہوئے بیضاوی نے قوام یعنے قاف کے زیر کی صورت میں اس کا ترجمہ "وسطاً[1] عدلاً" کیا ہے۔ وجہ یہ لکھی ہے کہ

لاستقامة الطرفين	چونکہ دونوں پہلو اس میں سیدھے ہوتے ہیں،

اور "قوام" قاف کے زبر سے اس کا ترجمہ

ما یقام به الحاجة لا یفضل عنها	جس سے ضرورت پوری ہو جائے اور قدر حاجت سے آگے نہ بڑھے

خلاصہ یہی ہے کہ درمیانی حالت اختیار کرنی چاہیے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ کوئی معین بات نہ ہوئی جس کا مطلب یہی ہوا کہ یہ ہر شخص کے اختیار تمیزی کے سپرد ہے کہ اپنے مصارف کو حد اعتدال سے متجاوز نہ ہونے دے نہ روکنے میں نہ خرچ کرنے میں اور واقعہ یہی ہے کہ جن لوگوں کی آمدنی کا ذریعہ کوئی "اصل" نہیں ہے بجز ان کے اختیار تمیزی کے اور اس کے سوا چارہ کار ہی کیا ہے کہ خود ان ہی کے سپرد ان کا معاملہ کیا جائے اور یہی کیا گیا ہے۔

---

[1] - بیچ اور معتدل۔

عہد نبوی میں بین الاقوامی عصبیتوں کو دُور کرنے کی بعض تدبیریں

از

ڈاکٹر محمد حمید اللہ، شعبۂ قانون جامعہ عثمانیہ

پس منظر اب سے ہزار ڈیڑھ ہزار سال پہلے جب نہ تعلیم اتنی عام تھی، نہ اجنبیوں کے میل ملاپ کے اتنے ذرائع یا مواقع تھے، نہ مختلف اقطاع عالم ایک دوسرے کے اتنے محتاج تھے جتنے آج ہیں تو یہ ناگزیر تھا کہ مذہب کے فرق، وطن کے فرق، قوم ونسل کے فرق، قبیلے کے فرق، فرقے کے فرق بلکہ ہر لایعنی اور بے حقیقت فرق انسانوں میں خونریزی کا جائز سبب پیدا کر دیا کریں۔ الہامی یقین دہانی یعنی مذہب اور عقلی استقراء و استنباط یعنی سائنس اب اس پر متفق ہو چکے ہیں کہ کرۂ زمین کی موجودہ انسانی آبادی ایک ہی باپ کی اولاد ہے۔ اولادِ آدمؑ میں ذاتی حفاظت مرکز کشی پر مجبور کرتی رہی تو معاشی ضرورتیں مرکز گریزی پر آمادہ کرتی رہیں اور اس مرکز گریزی نے برادرکشی تک کو جائز بنا دیا۔ یونانی اور لاطینی جیسی قدیم متمدن زبانوں میں (اور غالباً سنسکرت میں بھی) "دشمن" کے لئے جو لفظ پایا جاتا ہے، اس کے اصلی معنے محض "اجنبی" کے ہیں۔ اور یہ ان زبانوں کی بولنے والی قوموں کے تصورات کا آئینہ دار ہے۔ کم متمدن قوموں کا کیا طرزِ عمل ہوگا اور وحشی قبائل کا کیا حال ہوگا، اس پر کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں۔

جہاں تک عرب کے صحرائی براعظم کا تعلق ہے، ہمیں وہاں بھی یہی صورت حال اپنی پوری شدتوں کے ساتھ ــــ بلکہ شاید سب سے زیادہ انتہائی صورت میں ــــ نظر آتی ہے۔ عرب اور عجم کا بنیادی اور ابتدائی فرق چھوڑ بھی دیا جائے تو عدنانی اور قحطانی قبائل کا باہمی تعصب کچھ اتنا شدید تھا کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں بھی اس کے اثرات پڑے بغیر نہ رہے۔ پھر عدنانیوں میں بھی مُضَر اور ربیعہ کی کشمکش کچھ کم شدید نہ تھی۔ اسی طرح نیچے اترتے ہوئے قریش و غیر قریش ایک مستقل مسئلہ تھا۔ اور خود قریش کے اندر بنی ہاشم و بنی امیہ کی رقابتوں سے قبل اسلام کی تاریخ میں کون واقف نہیں۔ ان سب کے علاوہ شہری اور خانہ بدوش یعنی حضری اور بدوی کا جھگڑا بھی الگ تھا۔ اور باہم ایک دوسرے کو حقیر سمجھتے تھے۔ آج بھی کوئی بدوی شتربان بڑی متانت اور استخفاف و حقارت کے ساتھ کہیگا "مرغیاں اور کوئی بدوی پالے؟ وہ تو حضریوں کے پاس ہوتی ہیں" ــــ جیسا کہ خود میرے ایک سوال پر حجاز میں جواب ملا تھا۔

ان کی جہالت اور اجڈپن کے باعث یہ کہنا ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ آج حالت امن میں کسی جرمن اور فرانسیسی میں، یا کسی پولستانی اور روسی میں باہم جو طبیعی نفرت ہوتی ہے، وہ اس تنفّر کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو قبل اسلام کے ہم جَد عربی قبائل میں آپس میں پائی جاتی تھی۔ اس چیز نے ان میں انفرادیت پسندی اتنی بڑھادی تھی کہ نکاح بیاہ عموماً قبیلے کے اندر ہی ہوتا تھا۔ قبائلی عصبیت ایک قبیلے کے لئے دوسرے کو اپنا کفو یا ہمسر سمجھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ پھر رات دن کی بات بات پر خانہ جنگیاں الگ تھیں۔ آبادی کی روز افزوں کثرت اور وسائل معاش کی عرب میں قلّت الگ مسائل پیدا کر رہی تھی۔

آغاز اسلام ان حالات میں اسلام کا آغاز ہوتا ہے اور وہ ان تمام تنگ نظریوں اور عصبیتوں کے خلاف ایک دوسری انتہا پر

پہنچا ہوا تھا۔ اسلام کے نزدیک عرب کا خدا بھی ایک ہی تھا اور عجم کا بھی۔ جو عدنانیوں کا خدا تھا، وہی قحطانیوں کا۔ تمام انسان ایک ہی باپ آدمؑ کی اولاد ہیں اور گورے کالے ہونے یا زبانوں اور وطنوں کا فرق رکھنے سے ان کی فطری مساوات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اگر کوئی برتری و فروتری ان میں آپس میں ہے تو وہ صرف ہر ایک کے ذاتی اعمال و اخلاق کے باعث ہے۔

بظاہر خدا کی وحدانیت کا مسئلہ عقائد و دینیات سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کی عمرانی اہمیت بھی اسلامی سماج میں کچھ کم نہیں۔ جب تک سارے جہاں کے انسانوں کا خدا ایک نہ ہو، اس وقت تک نہ تو مساواتِ انسانی کی کوئی حقیقی اساس قائم ہوسکتی ہے اور نہ انسانوں کو طاقت کے باوجود برائیوں سے بچنے اور نیکیوں کے کرنے کی کوئی ترغیب میسر آسکتی ہے۔

اسلامی تعلیم عام عربوں کے رواجات اور تصورات کے عین برعکس اور مخالف تھی۔ جس طرح منصفانہ سے منصفانہ فیصلہ بیکار ہے جب عدالت اس کا نفاذ نہ کراسکے، اسی طرح اچھی سے اچھی تعلیم اور اصول و عقائد فضول ہیں جب ان پر عمل نہ ہو۔

عہد نبوی کی یہیں بڑی خصوصیت اور امتیاز یہی نظر آتا ہے کہ وہاں تعلیم اور تعمیل ساتھ ساتھ چلتے ہیں، نظریات اور نظائر میں فرق نہیں ہوتا، اور انسان کی فطرت کے اقتضاء اور عقل کے مطمح نظر میں اعتدال اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اسلام راتوں رات نہیں پھیل گیا۔ عربوں کی پلک جھپکاتے کایا پلٹ نہیں ہوگئی۔ ان حالات میں اس امر کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں کہ اسلام نے انسانی سماج کو قدیم عصبیتوں سے نجات دلانے میں جو کامیابی حاصل کی، اس کے وسائل اور مدارج اس عالمِ اسباب میں کیا رہے؟

آنحضرتؐ کا طریق کار | یوں تو اسلام کے بنیادی مقاصد اور وسائل،

"آفتاب آمد دلیل آفتاب" کے مصداق ہیں یعنی جو مقصد ہے وہی آپ اپنا وسیلہ ہے۔ اسی بنا پر اولین وسیلہ بین الاقوامی عصبیتوں کو دور کرنے کے لئے توحید خداوندی ہی رہا۔ جب سب کا خدا ایک ہو اور وہ عادل اور سب پر یکساں مہربان بھی ہو تو خود بخود انسان کے خود ساختہ مراتب اور درجات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سب انسانوں میں صحیح عبدیت اور اطاعتِ خداوندی پیدا کرنے کے لئے یہ حدیث ارشاد ہوئی کہ "سب انسان آدمؑ سے پیدا ہوئے اور خود آدمؑ مٹی (جیسی حقیر چیز) سے بنے تھے" قرآن میں یہ اصول بتایا گیا کہ انسانوں کا "قوموں اور قبیلوں میں بٹنا صرف پہچانت کے لئے ہے ورنہ امتیاز و اعزاز صرف تقوے اور برائیوں سے بچنے کے مدارج کے لحاظ سے ہے" ایک اور جگہ بتایا گیا کہ انسانوں کی "بولیوں اور رنگوں کا اختلاف محض ان کے خلاق کی قدرت کی نشانی ہے" اور یہ بجائے خود مراتب کی درجہ بندی نہیں کرتا۔

عہد نبوی میں چونکہ نظریات اور نظائر میں فرق نہیں ہوتا تھا اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ آقا و غلام، قریشی و غیر قریشی، عربی و عجمی، حبشی و رومی و ایرانی ایک ہی صف میں شانہ بہ شانہ رہتے اور ان میں ان قدیم جاہلی اختلافات کا ذرا بھی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ پیغمبر اسلام کی اس سیاست کو آپ کے جانشینوں نے بھی پوری وفاداری سے جاری رکھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مسلمانوں کی ذہنیت میں تواتر و توارث کے باعث اتنی رچ گئی کہ پھر اسلام اور مساوات لازم و ملزوم سمجھے جانے لگ گئے۔ مثال کے طور پر انسانوں کی مساوات کے بارے میں ہندستان سب سے پس ماندہ ملک ہے۔ اور جات پات کی کٹر قدامت پسندی کے لحاظ سے شاید ملیبار سب سے گیا گذرا علاقہ ہے۔ یہاں "اچھوت" کثیر تعداد میں بستے اور انسانیت سوز ذلتوں کو برداشت کرتے ہیں۔ اس علاقے میں مسلمان کے ساتھ نسبتہً بہت بہتر سلوک ہوتا ہے۔ اور آج بھی کوئی اجنبی ناظر حیرت زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ صبح کو کوئی اچھوت محض اپنی پیدائش کے باعث ذلت و خواری کا مستوجب ہے تو شام کو

اسلام لانے کے بعد اسی گاؤں اور اسی مقام پر اس کے ساتھ وہ سلوک اعلیٰ جات کے ہندو خوشی سے کرنے لگتے ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ کشمیر میں اب اچھوت باقی ہی نہیں ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی بیان کی جاتی ہے کہ وہاں عالم باعمل مسلمان پہنچے اور اعلیٰ جاتیوں کی تنگ نظری نے ان اچھوتوں کو اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔

رسول کریمؐ نے سب مسلمانوں کا قبلہ بھی ایک قرار دیا، قانون بھی ایک، اور قیادت بھی ایک۔ یہ نہیں کہ اعلیٰ خاندانوں کے مندر الگ ہوں، نشست گاہیں (Pews) الگ ہوں، اور ثواب الگ ہوں۔ انھیں پست طبقات کے مقابلے میں سزائیں ملیں ہی نہیں اور ملیں بھی تو برائے نام۔

قبلے کی یکسانی نے کرۂ ارض کے ہر حصے کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ایک خاص مرکز کا تابع ہے اور اس کی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہیں بن سکتی۔ قانون کی یکسانی نے وہ حیرت زا صورت نہیں پیدا ہونے دی کہ کشمیر کا برہمن، مدراس یا بنگال کے برہمن کے ساتھ رشتہ ناتہ تو کیا، ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی نہیں کھا سکتا۔ قانون کی یکسانی سے زیادہ غالباً بنی نوع انسان کو پرانی وحدت کی طرف لانے والی کوئی اور چیز نہیں ہوگی اور قانون کے تفاوت سے زیادہ اپنوں کو بیگانہ بنانا والا امر کوئی اور نہ ہوگا۔ یہ سب بھی بیکار ثابت ہوتے اگر قیادت ایک نہ ہوتی۔ اگر دین اور دنیا کو ایک مرکز پر نہ لا جمع کیا جاتا، اگر تعلیم کی جبری تعمیل کا انتظام نہ ہوتا، اور اگر روحانی اور مادّی مسائل کی اعتدال کے ساتھ باہم آمیزش نہ کر دی جاتی تو اسلام میں اور کسی فلسفی کی خیال آرائی یا مجذوب کی بڑھ میں کوئی فرق نہ رہتا۔ اپنی تعلیم کی اولین تعمیل کے سلسلے میں پیغمبرِ اسلامؐ نے دولت مندوں کو سب سے پہلے دبوچا اور انھیں اس کا پابند کیا کہ اپنی زائد از ضرورت دولت کا ایک معینہ و معقول حصہ لازمی طور پر مرکز کو بطور ٹیکس ادا کیا کریں۔ اس کی ادائی میں اُونٹ باندھنے کی ایک رسی کی کمی بھی بغاوت سمجھی گئی اور ایسوں کے خلاف پیغمبرِ اسلامؐ کے سب سے پہلے جانشین صدیق اکبرؓ نے اعلانِ جنگ کر دیا اور جنگ کی ہولناکیوں نے وہ بات سمجھا دی جو

ترغیب وتفہیم کے باوجود سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

مانع زکات دولتمندوں کے خلاف ان جنگوں کی جیسی چاہیئے اہمیت ابھی تک مورخوں نے نہیں سمجھی ہے ورنہ تاریخ معاشرۂ انسانی میں وہ ایک نقطۂ انقلاب ہیں۔ جہاں اس نے تقسیم وگردشِ دولت کی ضرورت کو محسوس کرایا وہیں رعایا کو اپنے رعایا ہونے کا احساس کرایا ورنہ سابق میں، کم از کم عرب کی حد تک، شیخ قبیلہ اور بزرگ خاندان کے سوا کسی اورانسان کی اطاعت نہ ضروری تھی اور نہ روا رکھی جاتی تھی۔

پورے عالم کے ہمہ گیر انسانی معاشرے کے ان اساسی انتظامات کے ساتھ پیغمبرؐ اسلام نے مقامی انتظامات کو بھی نظر انداز نہ فرمایا۔

عربوں کے متعلق

عرب میں چونکہ قبیلہ داری نظام ہی عام طور پر رائج تھا اس لئے رشتہ داری سے زیادہ موثر کوئی اور وجہ دوستی وحلیفی کی نہیں ہوسکتی تھی۔ چاہے خود یہ بھی کتنی ہی کمزور چیز کیوں نہ ہو لیکن اور اسباب کے مقابلے میں یہ بہر حال زیادہ مستحکم ومستقل امر تھا۔

ہجرت مدینہ کے بعد ایک اسلامی حکومت قائم ہوگئی جو ایک شہری مملکت سے آغاز پاکر دس ہی سال میں پورے جزیرہ نمائے عرب اور جنوبی عراق وفلسطین تک کے دس بارہ لاکھ مربع میل رقبے پر محیط ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں پیغمبرؐ اسلام نے جو عقد فرمائے وہ جغرافی نقطۂ نظر سے دلچسپی رکھتے ہیں:۔

تعداد ازواج ہر صورت میں برا نہیں ہوتا، خاص کر جب ان کا مقصد بوالہوسی وعیاشی

بالکل نہ ہو۔ بہر حال نقشۂ ہمراہی سے ازواج مطہراتؓ کی جغرافی تقسیم اور ملک گیر وسعت نظر آجائے گی۔ قریب قریب ہر بڑے قبیلے کی اس میں نمائندگی ہے اور چونکہ یہ عموماً نہایت ہی شریف خاندان اور بڑے رتبے کی ہوتی تھیں اس لئے اس کے اثرات بھی دور رس ہوتے تھے۔

اہل مکہ سے باہر بی بی زینبؓ بنت خزیمہ اور بی بی میمونہؓ بنت الحارث دونوں کا تعلق یمن کے زبردست قبیلہ عامر بن صعصعہ سے تھا۔ خاص کر بی بی میمونہؓ کی آٹھ نو بہنیں تھیں اور سب نہایت اچھے گھرانوں میں بیاہی گئی تھیں اور کتاب المحبّرؒ کے مستند مولف محمد بن حبیب (فوت ۲۴۵ھ) کو اپنی کلاسیکل کتاب میں تسلیم کرنا پڑا کہ:-

لا یُعلَمُ امرأۃٌ فی العرب	پورے عرب میں کوئی اور ایسی عورت معلوم
کانت أشرف أصهارا	نہیں جس کے داماد اس سے زیادہ شریف
من هند بنت عوف	ہوں جتنے ہند بنت عوف کے جو بی بی میمونہؓ
امِّ میمونة وأخواتها	اور اُن کی بہنوں کی ماں تھی۔

(المحبّر ص۱۰۹)

بی بی جویریہؓ بنی المصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں۔ یہ ایک نہایت ہی طاقتور اور وسیع قبیلہ تھا اور مکے اور مدینے کے مابین رہتا تھا۔ اس عقد کے ساتھ اسلامی مملکت کی سرحد مکے کی سمت کئی سو میل آگے بڑھ گئی۔

کندہ جنوبی عرب میں ایک شاہی خاندان تھا۔ اسلام سے پہلے ان کی سلطنت جنوبی عرب سے لے کر جنوبی عراق تک عرب کے مشرقی حصے میں پھیل گئی تھی۔ اس کے اثرات عہد اسلام میں بھی کافی تھے۔ اس قبیلے سے بھی آنحضرتؐ نے ازدواجی تعلقات قائم فرمائے تھے۔ یہی حال قبائل کلاب وکلاب و بنی سُلیم وغیرہ کا تھا جن کی تفصیلوں کی یہاں ضرورت نہیں۔ کتاب المحبّر اور طبقات ابن سعد (جلد ۸) میں اس کے جیتے جاگتے تذکرے ہیں۔

خود مکے میں بی بی خدیجہؓ کا تعلق قبیلۂ بنی اسد بن عبدالعزیٰ سے تھا۔ بی بی سودہؓ کا

بنی عامر بن لوی سے، بی بی عائشہؓ کا بنی تیم سے، بی بی حفصہؓ کا بنی عدی سے، بی بی ام سلمہؓ کا بنی مخزوم سے، بی بی ام حبیبہؓ کا بنی امیہ سے، بی بی زینبؓ بنت جحش کا قبیلۂ بنی اسد بن خزیمہ سے۔ مکے میں ان سے زیادہ با اثر اور کوئی خاندان نہ تھے۔

بی بی ماریہؓ قبطیہ مصر کی تھیں اور پہلے عیسائی رہ چکی تھیں۔ بی بی صفیہؓ کا تعلق خیبر کے یہودیوں سے تھا۔

اس مختصر مساحت کے بعد یہ نتیجہ اخذ کئے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ نکاحوں کے ذریعے سے مسلمانوں میں پرانی عصبیتوں کو دور کرنے کی آنحضرتؐ نے کتنی وسیع کوشش فرمائی۔ اور نتائج بھی بتاتے ہیں کہ یہ کوششیں بیکار نہ رہیں۔

غیر عربوں کے متعلق

آنحضرتؐ نے اس نفسیاتی حقیقت کا اپنے طرز عمل میں ہمیشہ بڑا لحاظ رکھا کہ کسی کو برا کہنے سے اس میں ضد پیدا ہو جاتی ہے اس لئے اس کے آغاز کی تعریف کر کے بعد میں غلطی سے اس کے طرز عمل میں برائیاں گھس آنے کا ذکر کرنا اس کو سنجیدگی سے غور کا موقع دے سکتا ہے۔ یہودیوں، نصرانیوں اور خود مشرکین عرب کے متعلق اسلامی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ خدا کے سچے اور عالی رتبہ نبی تھے مگر ان کے بعد کی نسلوں نے ان کی سچی تعلیم میں من گھڑت حذف اضافہ کر لیا ہے۔ یہ تعلیم کہ:-

"اے الہامی کتابوں والو! ایک بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں برابر کی ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کا کچھ شریک ٹھیرائیں اور نہ ہم اپنے ہی میں سے بعض کو بعض، خدا کو چھوڑ کر آقا بنالیں۔" (قرآن)

یہ زیادہ تر یہود و نصاریٰ کو تعاون و یکجہتی کی دعوت تھی۔ پھر یہ کہا گیا:-

"ہر قوم کا ایک ہادی ہوا ہے ــــ ہر امت کے لئے ایک خدائی پیغام رساں ہوا ہے ــــ اے محمد ہم نے اپنے بعض پیغمبروں کا تجھ سے ذکر کیا ہے اور بعض کا نہیں" ــــ وغیرہ۔ (قرآن)

یہ تمام ہی دنیا کے مقدس لوگوں کا احترام کرنے اور ان کو تسلیم کرنے کا صریح فیصلہ تھا۔
اور آخر میں:۔

"وہ لوگ جو ایمان لائے، وہ لوگ جو یہودی بنے اور نصرانی اور
صابی، ان میں سے جو بھی خدا اور روز قیامت پر ایمان لائے اور
نیک کام کرے تو ایسے لوگوں کو ان کے رب کے پاس ان کا اجر ملیگا اور
انھیں خوف اور رنج کی کوئی وجہ نہیں"۔ (قرآن)

اسلام کا دعویٰ تھا کہ وہ "بنیادی مذہب" ہے۔ آدمؑ سے عیسیٰؑ تک سب اسی کے پرچار اور تبلیغ کے لئے آئے تھے۔ وہ ازلی صداقتوں پر مشتمل ہے جن کے مانے بغیر کسی معقولیت پسند کو چارہ نہیں اور بنیادی واجبات کے سوا باقی ہر چیز میں انسانوں کو کافی وسیع اباحت وصوابدید حاصل ہے کہ جو چاہے کرے۔

مذاہب کے مابہ الاشتراک امور اور بنیادی صداقتیں جو انسانی حقوق و واجبات کے متعلق تھیں، بیان کرکے اسلام نے ساتھ ہی مذہب کو ایک نہایت سہل و آسان چیز (الدین یسر) بھی بنادیا۔ اور انسان اور خدا کے مابین راست رشتہ جوڑ دیا۔

دوسرے الفاظ میں تمام مذاہب کے پیروؤں میں باہمی احترام ورواداری کا جذبہ پیدا کرنا اور فروع کو چھوڑ کر معقول اصول پر سب کو ایک ہو جانے کی دعوت دینا ہی اسلامی پیغام تھا۔ اور اسی "بنیادی مذہب" کے ذریعے سے دین و دنیا کی خوبیوں سے بیک وقت استفادہ ممکن تھا اور خیر و شر کے آمیزے (یعنی انسان) کو اعتدال پر رکھنے اور شیطان اور فرشتہ ہر دو سے الگ بلکہ دونوں سے بہتر، خدائی تخلیق کا ایک کامل ترین نمونہ، بنانے کا طریقہ بتا دیا گیا۔

اس ہادیٔ اعظمؐ کی یہ تعلیم شاید آج بھی عصبیتوں سے بھری دنیا کے لئے سنجیدہ غور و فکر اور انسانیت سوز برادر کشیوں کے انسداد کا سامان مہیا کرتی ہے۔

برطانوی دستور میں ہاؤس آف کامنز کی اہمیت

از

ڈاکٹر یوسف حسین خاں شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ

ہاؤس آف کامنز انگریزی قوم کی سیاسی روایات کا قدیم سے حامل رہا ہے۔ دنیا کی کسی قانون بنانے والی جماعت نے اجتماعی زندگی کی تشکیل پر اس قدر اثر نہیں ڈالا جتنا کہ ہاؤس آف کامنز نے انگریزی قوم پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ وہ ملکی نظم و نسق اور ملکی مالیات کے انتظام کے لئے صدیوں سے ذمہ دار رہا ہے۔ دراصل انگلستان کی تاریخ بڑی حد تک ہاؤس آف کامنز کی تاریخ سے عبارت ہے جس میں استبداد سے آزادی حاصل کرنے اور حکومت کے قوت و اقتدار کو خود اپنے اختیار میں لینے کے بیسیوں حالات و واقعات موجود ہیں جن پر انگریزی قوم بجا طور پر فخر کرتی ہے۔ بہ قول گلیڈاسٹن "ہاؤس آف کامنز مثل اس شمسی دائرہ کے ہے جس کے گرد اجرام فلکی گردش کرتے ہیں"۔ یہی محور ہے جس کے چاروں طرف ملک کی سیاست چکر لگاتی ہے۔

جس زمانے میں بادشاہوں کا زور تھا تو ہاؤس آف کامنز نے امیروں سے مل کران کے زور کو توڑا اور ان کے اثر و عمل کو محدود کر دیا۔ پھر جب امیروں نے سر اٹھایا تو ہاؤس آف کامنز نے ان کے مقابلے میں انگریزی قوم کی آزادی کی حفاظت کے

فرض کو اپنے ذمہ لیا۔ صنعتی انقلاب کے بعد انگلستان میں متوسط طبقہ نے ملک کی سیاسی رہنمائی اپنے ہاتھ میں لی اور ہاؤس آف کامنز کو اپنے مقاصد کے لئے جو امیروں کے مقاصد سے مختلف تھے بڑی ہوشمندی سے استعمال کیا اور اس طرح ملکی سیاست میں اپنا اثر ورسوخ بڑھایا۔ ۱۸۳۲ء، ۱۸۶۷ء اور ۱۸۸۴ء کے قوانین اصلاحات کی رو سے ہاؤس آف کامنز کے سیاسی اثر میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ انیسویں صدی کے شروع تک عوام کو رائے دینے کا حق حاصل نہیں تھا۔ مختلف قوانین اصلاحات کی بدولت رائے دینے کے حق کو بہت وسعت حاصل ہوئی اور انتخاب کے حلقوں کی ازسرنو تقسیم عمل میں آئی۔ اس سے قبل صرف وہی لوگ ہاؤس آف کامنز کے ارکان کو منتخب کرنے کا حق رکھتے تھے جو بڑے زمیندار یا کارخانہ دار تھے اور انتخاب کے حلقوں کی تقسیم اس طور پر کی گئی تھی کہ صنعتی مرکزوں سے نمائندوں کی تعداد بہ نسبت غیر آباد علاقوں کے کم ہوا کرتی تھی لیکن نئے انتظام کے مطابق آبادی کے تناسب سے انتخاب کرنے والوں کے حلقے مقرر کئے گئے۔ ان اصلاحات سے انگلستان کی سیاسی زندگی میں زبردست تبدیلی پیدا ہوگئی۔

انیسویں صدی عیسوی کے آخری زمانے میں ہاؤس آف کامنز کا قوت واقتدار اپنے انتہائی عروج پر پہنچ چکا تھا۔ دراصل جب کوئی شخص پارلیمنٹ کا لفظ استعمال کرتا تھا تو اس کی مراد ہاؤس آف کامنز ہوتی تھی اس لئے کہ پارلیمنٹ کے دوسرے اجزا یعنی تاج اور ہاؤس آف لارڈز دونوں پر ہاؤس آف کامنز کا اثر چھا گیا تھا۔ ہاؤس آف کامنز کا کام صرف وضع قانون ہی نہیں تھا بلکہ ملکی انتظام کے متعلق بھی اس کو مقتدر جماعت خیال کیا جاتا تھا اس واسطے کہ وہ رائے عامہ کا ترجمان تھا۔ حکومت کی حکمت عملی کی تشکیل اور وزارتوں کو بنانا بگاڑنا اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ سچ ہے کہ وزیروں کو صلح وجنگ اور دوسرے عاملانہ اختیارات حاصل تھے لیکن وہ ہاؤس آف کامنز کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد سے ہاؤس آف کامنز کا وہ پہلا سا اثر حکومت پر باقی نہیں رہا۔ جنگ کے زمانے میں لازمی طور پر عاملہ کا اختیار بڑھ جاتا ہے اس لئے کہ اسی کو ہر لمحہ نہایت اہم فیصلے کرنے پڑتے ہیں اور قوم کی قسمت کی باگ اسی کے ہاتھ میں آجاتی ہے اور ہر قسم کے اختیارات اس کے ہاتھ میں مرکوز ہو جاتے ہیں۔ ہاؤس آف کامنز کے جو اختیارات اس موقع پر اس کے ہاتھ سے نکل گئے پھر واپس نہ آئے۔ انیسویں صدی عیسوی میں ہاؤس آف کامنز جن فرائض کو ادا کیا کرتا تھا انھیں اب دوسرے ادارے ادا کر رہے ہیں۔ بظاہر ہاؤس آف کامنز کے اختیارات میں کوئی کمی نہیں معلوم ہوتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ کچھ عرصے قبل جو لوگ اس کے خادم تھے وہ اب اس کے آقا بن گئے ہیں۔ آج کابینہ وہ تمام کام انجام دے رہی ہے جو کچھ عرصہ قبل پارلیمنٹ کے فرائض میں شمار کئے جاتے تھے۔ اب ہاؤس آف کامنز کے ارکان کا بس یہ کام رہ گیا ہے کہ وہ ان کارروائیوں کی توثیق کر دیں جنھیں کابینہ نے پیش کیا ہے۔ ہاؤس آف کامنز کے لئے اب ناممکن ہے کہ وہ عاملہ کی نگرانی یا اس کے کاموں پر تنقید کرے۔ برخلاف اس کے کابینہ کی حیثیت آمرانہ ہو گئی ہے۔ جس طرح تاج کے اختیارات ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ پارلیمنٹ کی طرف منتقل ہوئے اسی طرح اب کچھ عرصے سے پارلیمنٹ کے اختیارات کابینہ کو منتقل ہو گئے ہیں۔

ہاؤس آف کامنز ۶۱۵ ارکان پر مشتمل ہے جو ۵۹۵ مختلف انتخابی حلقوں سے پانچ سال کے لئے چنے جاتے ہیں۔ ۲۱ سال کی عمر کے ہر عورت اور مرد کو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ عورتوں کو پہلی مرتبہ ۱۹۱۸ء میں پارلیمنٹ کے انتخاب میں رائے دینے اور خود رکنیت کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنے کا حق حاصل ہوا۔ ہاؤس آف لارڈز کے رکن ہاؤس آف کامنز کے رکن نہیں ہو سکتے۔ پرانے زمانے میں ہاؤس آف کامنز کے ارکان کو ان علاقوں سے باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی جن سے وہ منتخب ہوتے تھے۔ بالخصوص ان ارکان کے لئے جن کی مالی حالت قابل اطمینان نہیں تھی اس قسم کا

اس کی وجہ سے بالعموم ہاؤس آف کامنز میں بحث کم ہونے لگی ہے۔ اصلی بحث کابینہ میں ہوتی ہے اور اس کے بعد آسانی کے ساتھ مسودات قانون پارلیمنٹ میں منظور ہو جاتے ہیں اس لئے کہ جو پارٹی ایوان میں برسر اقتدار ہوتی ہے اسی کی جانب سے اکثر مسودات پیش کئے جاتے ہیں۔

ہاؤس آف کامنز کا سب سے اہم فرض منصبی وضع قانون ہے۔ پارلیمنٹ (ہاؤس آف کامنز اور ہاؤس آف لارڈز) تاج کی مرضی سے قانوناً انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر مسئلہ کے متعلق وضع قانون کی مجاز ہے کسی اور جماعت کو جب تک کہ اس نے ہاؤس آف کامنز کی اجازت نہ حاصل کرلی ہو قانون بنانے کا اختیار حاصل نہیں ہے تنظیم و نسق کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کے باعث پارلیمنٹ سرکاری محکموں کو قواعد و ضوابط بنانے کا اختیار تفویض کر دیتی ہے اور ان محکموں کے بنے ہوئے قانون بھی اسی طرح عملی طور پر موثر ہوتے ہیں جیسے پارلیمنٹ کے منظور کئے ہوئے قانون۔ بعض اوقات یہ قواعد و ضوابط پارلیمنٹ کی منظوری کے لئے پیش کئے جاتے ہیں اور اگر پارلیمنٹ چاہے تو ان قواعد کو بعد میں منسوخ کر سکتی ہے۔

عام طور پر سب مسودات قانون پہلے ہاؤس آف کامنز میں پیش ہوتے ہیں۔ جب اس ایوان میں ان کی تین خواندگیاں ہو جاتی ہیں تو وہ ہاؤس آف لارڈز کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ وہاں بھی اسی طرح جب تین خواندگیاں ہو جاتی ہیں تو بادشاہ کی منظوری کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ لیکن عملی طور پر اب ہاؤس آف لارڈز کی خواندگیاں اور شاہی منظوری محض رسمی رہ گئی ہیں۔ مالی مسودات پہلے ہاؤس آف کامنز اور خالص قانونی نوعیت کے مسودات پہلے ہاؤس آف لارڈز میں پیش کئے جاتے ہیں۔ مسودات قانون دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک کو پبلک بل اور دوسرے کو پرائیویٹ بل کہتے ہیں۔ پبلک بل سے وہ مسودہ قانون مراد ہے جس کا اثر پوری قوم یا مفاد عامہ پر مترتب ہوتا ہے۔ مثلاً اگر محصولات کے متعلق کسی قسم کی تجویز ہاؤس آف کامنز میں کی جائے تو

ظاہر ہے اس کا اثر پوری قوم پر پڑے گا۔ یا اگر حق رائے دہندگی کے قوانین میں کوئی تبدیلی یا ترمیم ہو تو اس سے بھی سب لوگ متاثر ہوں گے۔ پرائیویٹ بل سے وہ مسودۂ قانون مراد ہے جس کا تعلق کسی فرد، محکمہ، کارپوریشن یا میونسپلٹی سے ہو۔ مثلاً کسی مقام پر ریل نکالنے یا کسی میونسپلٹی کو کسی خاص انتظام کا مجاز کرنے کا تعلق پوری قوم سے نہیں ہے بلکہ اس سے صرف قوم کا ایک مخصوص حصہ متاثر ہوگا۔ بعض مسودات قانون ایسے ہوتے ہیں جو ان مذکورہ بالا دونوں قسموں کے تحت نہیں آتے۔ ان کے متعلق ہاؤس آف کامنز کا اسپیکر فیصلہ کرتا ہے کہ انھیں پبلک بل کہا جائے یا پرائیویٹ بل شمار کیا جائے۔ اسپیکر کے سامنے ہاؤس آف کامنز کی سیکڑوں نظیریں موجود ہوتی ہیں جن پر پچھلی صدیوں میں عمل کیا گیا ہے۔ ان نظیروں کی ہدایت سے وہ اپنی رائے قایم کرتا ہے۔

پارلیمنٹ کے سامنے جو بیشتر مسودات قانون پیش ہوتے ہیں وہ حکومت کے مسودات ہوتے ہیں۔ ہر مسودہ کا کوئی نہ کوئی وزیر ذمہ دار ہوتا ہے جو اس کے اصول و متعلقات کی نسبت ہاؤس آف کامنز کے سامنے تفصیل پیش کرتا ہے۔ ہر مسودہ کی دو مرتبہ خواندگی عمل میں آتی ہے۔ پہلی مرتبہ مسودہ پیش کرتے وقت کوئی مباحثہ نہیں ہوتا۔ لیکن دوسری خواندگی کے وقت مباحثہ اور تنقید ہوتی ہے۔ مخالف جماعت چاہے تو دوسری خواندگی کے وقت کسی مسودہ کی جو حکومت کی طرف سے پیش کیا گیا ہے مخالفت کرے یا اس میں ایسی ترمیم پیش کرے جس کی بدولت اصل مسودہ اپنے نتائج کے اعتبار سے بالکل بے اثر ہو جائے۔ جب اچھی طرح بحث و مباحثہ ہو چکتا ہے تو مسودہ کے متعلق ہاؤس کی رائے طلب کی جاتی ہے۔ اگر حکومت وقت کے پیش کیے ہوئے کسی مسودۂ قانون کو ہاؤس آف کامنز نامنظور کر دے تو اس سے یہ مراد لی جائے گی کہ ہاؤس کو حکومت پر اعتماد نہیں رہا۔ معمولاً ایسی صورت میں وزارت مستعفی ہو جائے گی۔ لیکن اس کی نوبت

آجکل نہیں آتی۔ حکومت کے مسودات قانون دوسری خواندگی کے وقت بالعموم ہاؤس آف کامنز میں منظور کر لئے جاتے ہیں اس لئے کہ ہاؤس میں اکثریت اسی جماعت کی ہوتی ہے جو برسر اقتدار ہوتی ہے۔ دوسری خواندگی کے بعد مسودۂ قانون ہاؤس آف کامنز کی چھ مستقل کمیٹیوں میں سے کسی کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ ان کمیٹیوں کا حکومت کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے اور وہ اس کی حکمت عملی سے بخوبی واقف رہتی ہیں جو کسی مسودۂ قانون کو پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی محرک ہوئی ہے۔ ہر کمیٹی میں حکومت کے حامیوں کو اکثریت حاصل ہوتی ہے۔ مستقل کمیٹیاں[1] اور منتخب کمیٹیاں[2] اس طور پر بنائی جاتی ہیں کہ ہاؤس آف کامنز میں مختلف پارٹیوں کے ارکان کی تعداد کا جو تناسب ہے وہی ان کے ارکان کی تعداد میں بھی برقرار رہے۔ مستقل کمیٹیوں میں خاص طور پر مذکورہ اصول کا اور زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ ان میں حکومت کے پیش کئے ہوئے مسودات قانون رائے کے لئے جاتے ہیں اور متعلقہ وزیر بھی ان میں شرکت کرتا ہے جب اس کے محکمے کے مسودات پر بحث و گفتگو ہوتی ہے۔ بالعموم ان کمیٹیوں میں جو رائے دی جاتی ہے وہ ہاؤس آف کامنز کی طرح پارٹی بندی کے اصول کے مطابق ہوتی ہے۔ بعض دفعہ ہاؤس آف کامنز ایسی مخصوص کمیٹیاں مقرر کرتا ہے جو حکومت کے اخراجات میں کفایت کے متعلق تجاویز پیش کرتی ہیں۔ یہ کمیٹیاں دراصل پچھلی حکومتوں پر ایک طرح کی تنقید ہوتی ہے اور ان میں آئندہ کے لئے بعض اصول مقرر کئے جاتے ہیں تاکہ قومی مالیات میں بیجا صرف سے احتراز کیا جائے لیکن ان کمیٹیوں کی سفارشات سے کابینہ یا حکومت کی آزادئ عمل پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں عاید ہوتی سوائے اس اخلاقی پابندی کے جسے حکومت خود اپنے اوپر عاید کرنا پسند کرے۔

مالیاتی مسودات قانون پر غور کرنے کے لئے پورا ہاؤس کمیٹی بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ہاؤس آف کامنز کی ظاہری ہیئت ترکیبی میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوتی

---

[1] Standing Committees

[2] Select Committees

سوائے اس کے کہ بجائے اسپیکر کے دوسرا شخص صدارت کے فرائض انجام دیتا ہے مختلف کمیٹیوں میں غور کے بعد جب مسودۂ قانون دوبارہ ہاؤس کو واپس بھیجا جاتا ہے تو بالعموم اس پر رپورٹ پیش ہوتی ہے اور اس کے بعد تیسری خواندگی کی نوبت آتی ہے۔ اگر کسی کمیٹی میں مجوزہ مسودہ کے متعلق کوئی ترمیمات پیش کی گئی ہیں تو رپورٹ کے وقت وہ معرض بحث میں آتی ہیں۔ مختلف فیہ مسائل کے متعلق دوسری خواندگی کے وقت جو اعتراضات پیش کئے گئے تھے وہ اس وقت پھر ہاؤس کے سامنے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ تیسری خواندگی کے وقت کوئی ترمیم نہیں پیش کی جاسکتی۔ اب ہاؤس کا فرض ہوتا ہے کہ مسودہ کو جس حالت میں وہ ہے اسی حالت میں یا تو منظور کرے یا اس کو مسترد کردے۔ بالعموم تیسری خواندگی کے وقت کوئی مسودہ مسترد نہیں کیا جاتا۔ ہاؤس آف کامنز میں منظور ہونے کے بعد وہ مسودہ ہاؤس آف لارڈز میں پیش کیا جاتا ہے اور وہاں کی منظوری کے بعد رسمی طور پر شاہی منظوری کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ ان تمام منزلوں سے گذر کر کوئی مسودہ قانون بن سکتا ہے۔[1]

پرائیوٹ بل سے وہ مسودۂ قانون مراد ہے جس کا مقصد کسی مروجہ قانون میں تبدیلی کرنا ہے تاکہ کسی مقامی ضرورت کو پورا کیا جاسکے یا کسی شخص یا اشخاص کی جماعت کو خاص مراعات عطا کرنا ہے یا انھیں کسی ذمہ داری یا جوابدہی سے سبکدوش کرنا ہے۔ مثلاً کسی میونسپلٹی یا کارپوریشن کو پرائیویٹ بل کے ذریعہ یہ اختیار مل سکتا ہے کہ وہ اپنے حدود کے اندر کوئی ریل بنائے یا کسی ریل کو وسیع کرے یا ٹرامو ے لائن قایم کرے یا نہر نکالے یا کسی ایسے کام کا آغاز کرے جس کی وجہ سے دوسرے شہریوں کے پرائیویٹ حقوق متاثر ہوتے ہوں۔ پرائیویٹ بل پیش کرتے وقت یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ اس کی منظوری سے مفاد عامہ کے مقاصد کی تکمیل ہوگی اور کسی کو کوئی خاص نقصان نہیں ہوگا اور اگر ہوگا تو بہت خفیف جس کو عام فایدہ کے مقابلہ میں وقیع نہیں خیال کیا جاسکتا۔ پارلیمنٹ کے قوانین کے ذریعہ کسی میونسپلٹی یا کارپوریشن کو مخصوص اختیارات

حاصل ہو جاتے ہیں جو اس کو پہلے حاصل نہ تھے۔ پرائیویٹ بل بالعموم ہاؤس آف کامنز میں پارٹی بندی کے اصول پر نہیں جانچے جاتے بلکہ خاص حالات کے تحت مسودات کی نوعیت کے لحاظ سے ہاؤس ان کی نسبت فیصلہ کرتا ہے۔ پرائیویٹ بلز پر غور کرنے کے لئے ہاؤس آف کامنز کی چار چار ارکان کی کمیٹیاں بنا دی جاتی ہیں۔ یہ کمیٹیاں چھوٹی اسواسطے رکھی جاتی ہیں تاکہ ہاؤس کی دوسری مستقل کمیٹیوں کے ارکان کی تعداد پر اثر نہ پڑے۔ جب کسی پرائیویٹ بل پر کوئی کمیٹی غور کرتی ہے تو ان سب اشخاص اور اداروں کی شہادتیں قلمبند کی جاتی ہیں جو کسی طرح متعلقہ مسودۂ قانون سے متاثر یا مستفید ہوتے ہوں۔ مثلاً اگر کسی شہر میں ٹراموے نکالنے کے متعلق ہاؤس آف کامنز میں پرائیویٹ بل پیش کیا جائے گا تو اس شہر کے متعلقہ اداروں کی رائے ضرور طلب کی جائے گی اور مخالف مفاد رکھنے والی جماعت کو بھی اس کا پورا موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنا نقطۂ نظر پیش کر سکے۔ جب کمیٹی کے سامنے مختلف نقطہ ہائے نظر پیش ہو چکتے ہیں تو وہ کثرت رائے سے اپنی رپورٹ منظور کر کے ہاؤس کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اگر کمیٹی نے مسودہ کی تائید کی ہے تو وہ ہاؤس آف کامنز میں بلا کسی مخالفت کے پاس ہو جائے گا لیکن اگر کمیٹی مسودہ کے کسی اصول سے اپنا اختلاف ظاہر کرے تو ایسی صورت میں وہ مسودہ وہیں ختم ہو جائے گا۔ اگر کمیٹی نے مسودہ کے اصول کو قبول کر لیا تو پھر ہاؤس آف کامنز میں وہ بہت جلد منظور ہو جائے گا اور اس کے بعد ہاؤس آف لارڈز کے سامنے پیش کیا جائیگا۔ بالعموم کابینہ پرائیویٹ بلز کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتی سوائے اس صورت کے کہ وہ حکومت کے کسی محکمہ کو خاص طور پر متاثر کریں۔

جب ہاؤس آف کامنز میں کوئی پرائیویٹ بل پیش ہوتا ہے تو جو اشخاص یا ادارے اس سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ ملک کے دور دراز گوشوں سے اپنی تائید میں شہادتیں بہم پہنچانے کے لئے لوگوں کو لاتے ہیں جس میں بہت کافی خرچ ہوتا ہے۔

ہاؤس آف کامنز کی متعلقہ کمیٹی کے روبرو اپنے معاملہ کی کیفیت اچھی طرح پیش کرنے کی غرض سے وکیل مقرر کئے جاتے ہیں جن کو کثیر رقم کے معاوضے دئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہاؤس آف کامنز بھی پرائیویٹ بلز کے ضمن میں فیس لیتا ہے۔ پرائیویٹ بلز کی بدولت ہاؤس کو سالانہ تقریباً پچاس ہزار پونڈ کی آمدنی ہوتی ہے۔ ان کمیٹیوں کا طریق کار جن کے سامنے پرائیویٹ بلز پیش ہوتے ہیں بالکل عدالتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ وکلاء گواہوں پر جرح کرتے ہیں اور اپنی حجت اور دلائل اسی طرح پیش کرتے ہیں جیسے کسی سرکاری عدالت میں۔ اگر کسی فریق نے دیدہ و دانستہ اپنے مخالف فریق کو اخراجات سے زیر بار کیا تو ایسی صورت میں جیسے معمولی عدالتوں میں ہوتا ہے کمیٹی جیتنے والے فریق کو ہرجانہ دلاتی ہے۔

انگلستان میں پبلک بل اور پرائیویٹ بل میں جو فرق رکھا جاتا ہے وہ امریکہ میں نہیں رکھا جاتا۔ وہاں پبلک اور پرائیویٹ مسودات قانون دونوں ایک ہی نوعیت رکھتے ہیں۔ انگلستان میں اس باب میں جو طریق کار رائج ہے اس کی بدولت یہ ممکن ہوا کہ قوم کی نمائندہ جماعت اپنا زیادہ وقت اہم قومی مسائل کی جانب منعطف کرسکتی ہے۔ پرائیویٹ بلز کے لئے جو چھوٹی کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں ان میں ایسے اشخاص کو نہیں رکھا جاتا جن کی موجودگی دوسری مستقل یا منتخب کمیٹیوں میں اہم قومی معاملات کے متعلق غور وخوض کرنے کے لئے ضروری ہو لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پرائیویٹ بلز پر غور کرنے کے لئے جو کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں وہ نکمے اشخاص پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس کے برخلاف ان کمیٹیوں میں ایسے لوگ رکھے جاتے ہیں جو صنعت و تجارت کے معاملات کا تجربہ رکھتے ہیں اور جن کی رائے کی غیر جانبداری پر ہاؤس آف کامنز کو اعتماد ہوتا ہے۔ پرائیویٹ بلز اور پبلک بلز کی کمیٹیوں کا یہ تقسیم عمل اجتماعی مقاصد کے لئے از حد مفید ثابت ہوا ہے [1]

پرائیویٹ ممبر جس کا تعلق حکومت وقت سے نہیں جب کوئی پبلک بل ہاؤس آف کامنز کے غور کے لئے پیش کرنا چاہتا ہے تو اس کو اختیار ہے کہ چاہے

وہ اس کا مسودہ خود تیار کرے یا اپنے مشیر یا وکیل سے اسے تیار کرائے بعض اوقات ان مسودوں کی عبارت بہت ناقص ہوتی ہے۔ ہاؤس آف کامنز کو اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث اتنا موقع نہیں ملتا کہ وہ ان مسودوں کی عبارت پر نظر ثانی کرے۔ برخلاف اس کے سرکاری مسودات کو پارلیمانی ماہرین تیار کرتے ہیں۔ یہ ماہر متعلقہ محکموں سے پوری طرح مشورہ کر لیتے ہیں تاکہ محکمہ کے نقطۂ نظر کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اس کی حکمت عملی سے واقفیت بہم پہونچا لیں۔ بغیر ایسا کئے کوئی مسودہ تیار تیار کرنا بہت دشوار ہوگا۔ اہم مسودات قانون پر جو محض رسمی نوعیت کے نہیں ہوتے ان ماہروں کو بڑی دیدہ ریزی صرف کرنا پڑتی ہے تب کہیں جاکر وہ ان اصول کو الفاظ کا جامہ پہنا پاتے ہیں جو محکمہ جات متعلقہ کے پیش نظر ہیں۔ یہ مسودات قانون کئی کئی دفعہ لکھے جاتے ہیں اور محکمۂ متعلقہ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں جو اگر انھیں قابل قبول خیال کرے تو ہاؤس آف کامنز کے سامنے انھیں لانے کی نوبت آئیگی ـــ جب کوئی مسودۂ قانون ہاؤس آف کامنز میں پیش ہوتا ہے تو اس پر مختلف پارٹیاں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے تنقید کرتی ہیں۔ پھر اس کے بعد مستقل یا منتخب کمیٹیوں میں مسودہ میں بہت کچھ رد و قدح کے بعد ترمیم یا تبدیلی عمل میں آتی ہے بعض اوقات اس قدر تبدیلیاں اور ترمیمات کی جاتی ہیں کہ اصلی مسودہ کی شکل بالکل مسخ ہوکر رہ جاتی ہے اور اس کے متن میں مختلف مفادوں اور نقطہ ہائے نظر کو جو سمونے کی کوشش کی جاتی ہے اس سے متن کی صحت لفظی و معنوی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات پارلیمنٹ کے منظور کئے ہوئے قانون کے مضمرات و متعلقات کو خود انگریز سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ غیر انگریز اقوام کا تو ذکر ہی نہیں جو انگریزی دستوری زندگی سے بوجہ ناواقفیت اس قسم کے قوانین کو جن میں ہر قسم کی مفاہمتیں ملحوظ رکھی گئی ہوں چیستاں تصور کرتی ہیں ـــ یہ دعویٰ صحیح ہے کہ کسی انگریزی قانون کو اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھا سکتا جب تک کہ ان حالات کا بخوبی علم

نہ ہو جن میں وہ پارلیمنٹ میں منظور ہوا نیز ان متعلقہ قوانین کا علم نہ ہو جو اس سے قبل مماثل اغراض کی تکمیل کے لئے پارلیمنٹ میں منظور ہو چکے ہیں۔ بقول سر کورٹنی البرٹ جو مشہور ماہر قانون تھے اور جو پارلیمانی کونسل کے عہدہ پر سرفراز رہ چکے تھے" اگر کسی قانون کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ وہ بالکل ایک علٰحدہ حیثیت رکھتا ہے تو وہ ناقابل فہم رہے گا۔ درحقیقت ہر قانون مجموعۂ قوانین کے ایک باب یا کسی باب کی فصل کے مماثل ہوتا ہے۔" دراصل نہ صرف انگریزی قانون بلکہ دنیا کی دوسری قوموں کے قوانین بھی اچھی طرح اسی وقت سمجھ میں آسکتے ہیں جبکہ متذکرہ صدر اصول کو پیش نظر رکھا جائے۔

[انگریزی قوم طبعاً قدامت پسند ہے۔ چنانچہ وضع قانون کے متعلق بھی انگریزوں کے مزاج کی یہ خصوصیت ہمیں صاف طور پر نظر آتی ہے۔ جب تک شدید ضرورت نہ ہو پارلیمنٹ مروجہ قوانین کو منسوخ نہیں کرتی۔ یہ بات انگریزی روایات کے خلاف ہے کہ کسی عمارت کو بنیاد سے گرا کر از سر نو دوسری عمارت اس کی جگہ تعمیر کی جائے۔ اس کے علاوہ چونکہ انگلستان کے قوانین میں اس قسم کا کوئی فرق نہیں کیا جاتا جیسا کہ فرانس یا امریکہ میں جہاں معمولی اور دستوری قوانین ایک دوسرے سے بالکل علٰحدہ ہوتے ہیں اور ان کے وضع کرنے کا طریق کار بھی مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے وضع کئے ہوئے قوانین کے ساتھ چاہے ان کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، خاص تقدس و احترام وابستہ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون کو بدلنے میں انگریزی قوم ہمیشہ ہچکچاتی ہے اور وضع قانون صرف اس وقت جائز خیال کیا جاتا ہے جبکہ ایسا کئے بغیر عملی دشواریاں پیدا ہو رہی ہوں اور کسی طرح کام ہی نہ چلے۔ چونکہ زیادہ تر قوانین پیش کرنے کی ذمہ داری وزارت وقت پر عاید ہوتی ہے اس لئے وہ اس کا پورا لحاظ رکھتی

انتظام کیا جاتا تھا کہ وہ یکسوئی کے ساتھ اپنے انتخاب کرنے والوں کے حقوق کی نگرانی کرسکیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں جب انگلستان میں مزدوروں کی تحریک کو زور ہوا اور اس جماعت کی طرف سے بعض ایسے ارکان منتخب کئے گئے جو مالدار نہیں تھے تو متعلقہ ٹریڈ یونین کے فنڈ سے ان کے خرچ کے لئے تنخواہ مقرر کردی جاتی تھی اسواسطے کہ یہ لوگ اپنے پیشہ کا کام چھوڑکر پارلیمنٹ کے اجلاسوں میں شرکت کی غرض سے لندن میں رہنے پر مجبور ہوتے تھے۔ اسی طرح آئرلینڈ کے ممبر جب پارلیمنٹ میں شریک تھے تو ان لوگوں کو بھی اپنی پارٹی سے تنخواہ ملا کرتی تھی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ پارلیمنٹ کے ان ارکان کے لئے جن کی مالی حالت اچھی نہیں ہے، کوئی ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ پارلیمنٹ میں شرکت کی وجہ سے جو مالی زیر باری ہوتی ہے اس کی کچھ تلافی ہوسکے۔ اس طرح یہ ہوگا کہ قابل لوگ صرف اس وجہ سے کہ وہ اپنے اخراجات خود نہیں برداشت کرسکتے قومی کاموں میں شرکت سے معذور نہ ہوں گے۔ چنانچہ ہاؤس آف کامنز نے یہ تجویز منظور کرلی کہ پارلیمنٹ کے ہر رکن کی ۴۰۰ پونڈ سالانہ تنخواہ مقرر ہو جائے۔

جب تک کابینہ پارلیمنٹ پر پوری طرح حاوی نہیں ہوئی تھی اس وقت تک ارکان اپنی اپج سے بہت کچھ کرتے تھے لیکن اب تو وہ بالکل مشین کے پرزے ہو کر رہ گئے ہیں۔ پارٹی بندی کے نظم و ضبط کی سختی کی بدولت ارکان کی شخصی حیثیت کا تقریباً خاتمہ ہوگیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب پارلیمنٹ کا ممبر صرف اپنے انتخاب کرنے والوں کا نمائندہ ہی نہ تھا بلکہ ان کے نائب یا وکیل کی حیثیت رکھتا تھا۔ بقول برکؔ تمہارے نائب کا فرض ہے کہ وہ تمہارے مفاد کے لئے محنت و کاوش سے کام لے اور اس کے ساتھ اپنی رائے کو بھی استعمال کرے۔ اگر وہ تمہارے (چننے والوں کے) خیالات کی خاطر اپنی رائے کو قربان کردیتا ہے تو وہ تمہاری خدمت نہیں انجام دیتا بلکہ تم سے غداری کرتا ہے۔ مجھ سے جہاں تک ہوسکا میں نے تمہارے مفاد کی تمہارے خیالات کے باوجود نگرانی کی۔ میں جانتا تھا کہ تم نے مجھے اسواسطے چنا ہے کہ میں مملکت کا ستون بنوں

نہ اس لئے کہ عمارت کے مرغ باد نما کی طرح جدھر کی ہوا ہو ادھر مڑ جاؤں"۔ اسی طرح لارڈ پیل کا مقولہ مشہور ہے کہ "جب تک میں انگلستان کا وزیر ہوں اس وقت تک میں یہ کبھی گوارا نہ کروں گا کہ اپنی رائے کو کسی دوسرے کی مرضی کا تابع کروں میں اپنے عہدہ کو سوائے اس کے کسی اور بات کا پابند نہیں کر سکتا کہ حفظ عامہ اور مفاد عامہ کے اصول کو پیش نظر رکھا جائے"

[اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں انگلستان کے بڑے بڑے مدبرین اس اصول کے قائل تھے کہ مفاد عامہ کی حفاظت کے لئے انھیں ٹھیک ٹھیک اس رائے پر عمل کرنا چاہئے جسے وہ ضروری اور مفید سمجھتے ہیں اپنے چننے والوں کے خیالات کی اسی وقت وہ پیروی کرتے تھے جبکہ وہ خیالات معقول ہوتے تھے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ اگر کوئی شخص کسی حلقۂ انتخاب سے چنا جاتا اور بعد میں کسی مسئلہ پر اس کی رائے اپنے منتخب کرنے والوں کی رائے سے مختلف ہوتی تو وہ مستعفی ہوجاتا اور پھر دوبارہ اپنے آپ کو انتخاب کے لئے پیش کرتا لیکن اب ایسا نہیں ہوتا اسواسطے کہ پارٹی بندی کی ترقی سے ارکان اپنی اپنی پارٹی کے مسلک کے پابند ہوگئے ہیں۔ ایسے آزاد ارکان جن کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے نہ ہو بہت کم ہوتے ہیں۔ پارٹی کے نظم و ضبط کی خاطر بعض اوقات پارلیمنٹ کے ممبر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف رائے دیں۔]

پارلیمنٹ کے ارکان کو خاص مراعات حاصل ہیں۔ مثلاً سوائے غداری یا کسی سنگین جرم کے انھیں گرفتار نہیں کیا جاسکتا۔ انھیں ایوان کے اندر پوری آزادی تقریر حاصل ہے۔ انھیں اختیار ہے کہ وہ کسی مسئلہ کے متعلق اپنی رائے صاف صاف ظاہر کریں۔ پرانے زمانے میں اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ بعض ارکان کو ان کی کسی تقریر کے سبب سے بادشاہ نے قید کرنے کا حکم دیدیا یا اگر کسی عہدہ دار کی کوئی تقریر ناپسند ہوئی اس کو عہدہ سے برطرف کردیا۔ جارج چہارم جب کیننگ سے ناراض ہوا تو اس کو معاشری جلسوں اور صحبتوں میں بلانا ترک کردیا۔ ایڈورڈ ہفتم نے جو ویسے نہایت بااخلاق بادشاہ تھا

لیبر پارٹی کے تین ارکان سے ان کی تقریروں کے سبب سے ناراض ہوکر انھیں اپنے یہاں کی دعوتوں میں بلانا بند کر دیا تھا۔

وضع قانون اور ایوان کی کارروائی کی سہولت کی خاطر ہاؤس آف کامنز نے خود تقریر پر بعض حدود عاید کردی ہیں۔ ۱۸۳۲ء کے قانون اصلاح کے بعد سے ہاؤس آف کامنز کا کام بہ نسبت پیشتر کے بہت بڑھ گیا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں سوشل (معاشرتی) مسائل جیسے لوکل گورنمنٹ، حمل ونقل، تعلیم، مزدوری اور بے کاری کے مسئلے ہاؤس آف کامنز میں اس کثرت سے پیش ہونے لگے ہیں کہ اس کے وقت کا زیادہ حصہ انھیں کے نذر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وقت کی کفایت کے خیال سے بحث وتنقید پر حدود عاید کردی گئیں۔ پھر بعض اقلیتوں کی یہ کوشش تھی کہ جان بوجھکر ایوان کی کارروائی میں رکاوٹیں پیدا کریں اس سے اور زیادہ پیچیدگی پیدا ہوگئی۔ بالخصوص آئرلینڈ کے قوم پرستوں کی پارٹی جو نہایت منظم تھی اکثر اس قسم کی رکاوٹیں پیدا کیا کرتی تھی جس کے سبب سے ایوان کا بہت وقت بیکار ضائع جاتا تھا۔ اگر ہر مقرر کے لئے تقریر کا وقت مقرر کیا جاتا تو بعض اوقات آئرلینڈ کے سب نمائندے اس قاعدے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے۔ اگر انھیں بولنے کی اجازت نہ دی جاتی تو یہ پروپگنڈا کیا جاتا کہ پارلیمنٹ میں ان کی زبان بندی کردی گئی ہے انھیں اپنے خیالات ظاہر کرنے کی بھی آزادی حاصل نہیں ہے جو ایک ابتدائی سول حق ہے۔ غرضکہ آئرلینڈ کے نمائندوں نے پارلیمانی کارروائیوں میں رکاوٹیں پیدا کرنے کو ایک مستقل فن لطیف بنایا تھا۔ ان حالات میں ۳ فروری ۱۸۸۱ء گلیڈاسٹن نے ہاؤس آف کامنز میں یہ قرارداد منظور کرالی کہ ہر وزیر کو یہ اختیار حاصل ہونا چاہئے کہ وہ ایوان میں یہ تجویز پیش کردے کہ جو کارروائی اس نے پیش کی ہے وہ چونکہ اشد ضروری ہے اس لئے اس پر بحث نہ ہوگی۔ اس طرح بلا مباحثے کے فیصلہ کرنے کا حق تسلیم کیا گیا جسے "کلوژر"[1] کہتے ہیں۔ ۱۸۸۷ء میں سرکاری

---

[1] Closure

ارکان کے علاوہ نجی ارکان کو بھی یہ حق حاصل ہوگیا کہ وہ بلا مباحثے کے فیصلے کی تحریک کرسکیں بشرطیکہ اسپیکر یہ نہ خیال کرے کہ یہ تحریک ان کے اس حق کا بیجا استعمال ہے۔ اسی طرح جب حکومت کی جانب سے کلوزر کی تحریک پیش ہو تو بھی اسپیکر کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اس امر کا فیصلہ کرے کہ حکومت اپنے اس حق کو بیجا طور پر نہیں استعمال کر رہی ہے۔ یہی اصول پارلیمنٹ کی مستقل کمیٹیوں[1] کے لئے بھی رکھا گیا ہے کہ جب صدر دیکھے کہ کسی مسئلہ پر کافی بحث ہو چکی تو وہ رائے طلب کرے۔ اس طرح آزادئ تقریر پر ایک طرح کی روک عاید کی گئی ہے ورنہ کسی مسئلہ پر کبھی فیصلہ ہی نہ ہوسکتا۔

نظری طور پر پارلیمانی نظام دراصل لوگوں کے ان ارادوں اور خواہشوں کو معین کرنے کا ایک وسیلہ ہے جن سے مملکت کی مشیت کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ پارلیمانی عمل کا مقصد اجتماعی منشاء کو معلوم کرنا ہے۔ بلاشبہ تقریر کی آزادی کے بغیر پارلیمانی عمل بے مقصد رہتا ہے۔ مختلف سیاسی قوتوں کا عمل اور جوابی عمل تقریر و تنقید ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ پارلیمانی حکومت تقریر کے ذریعہ حکومت کرنا ہے۔ خود لفظ پارلیمنٹ کے معنی تقریر کرنے کے ادارہ کے ہیں۔ دستوری حکومت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حکومت اپنے عمل کی جوابدہی تقریر کے ذریعہ کرتی ہے۔ لیکن آزادئ تقریر کا اصول بھی ان قواعد و ضوابط کا پابند ہے جو خود پارلیمنٹ نے اپنے اوپر عاید کئے ہیں۔ ان ضوابط میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ ارکان اپنے اس حق کو کس طور پر اور کس حد تک استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔ بغیر ان ضوابط کی پابندی کے ایوان کی مرضی کبھی معین نہیں کی جاسکتی۔ مختلف قوانین حقوق کے ذریعہ یہ اب مسلم ہوگیا ہے کہ پارلیمنٹ کے بحث مباحثے یا تقریر پر پارلیمنٹ کے باہر کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جاسکے گی۔ پارلیمنٹ کا اختیار سماعت بجائے خود اس معاملے میں کسی دوسرے ادارہ کا پابند نہیں۔ اگر کسی رکن نے پارلیمنٹ میں اپنی تقریر کے دوران میں کوئی بات کہی تو کامن لا کے تحت

---

[1] Standing Committees

اس پر کوئی کارروائی ممکن نہیں۔ ہاؤس آف کامنز کے اجلاس میں ہاؤس آف لارڈز کی کسی تقریر کا حوالہ نہ دینا چاہیئے اور اسی طرح ہاؤس آف لارڈز میں ہاؤس آف کامنز کی کسی تقریر کا حوالہ دینے کی ممانعت ہے۔ ہاؤس آف کامنز میں کسی مسئلہ کے متعلق رکن صرف ایک مرتبہ تقریر کرنے کا مجاز ہوگا کسی ایسے معاملے کے متعلق تقریر میں حوالہ نہیں دیا جا سکتا جو کسی عدالت میں پیش ہو۔ وزیر کسی ایسی سرکاری دستاویز کا اپنی تقریر کے دوران میں حوالہ دینے کا مجاز نہیں ہے جس کا پورا متن ہاؤس آف کامنز کے ارکان کے سامنے پیش نہ کر دیا گیا ہو یا کسی رکن کے طلب کرنے پر جس کو فوراً نہ پیش کیا جا سکے جس طرح عدالت میں کسی دستاویز کا حوالہ اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ وہ عدالت کے سامنے پیش نہ کی جائے، اسی طرح پارلیمنٹ کے طریق کار میں بھی اسی اصول پر عمل کیا جاتا ہے۔ بادشاہ کا نام بحث کو پر اثر بنانے کے لئے استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ غیر پارلیمانی الفاظ استعمال نہ کرنے چاہئیں۔ اگر کوئی مقرر نامناسب الفاظ استعمال کرے گا تو صدر کو اختیار ہوگا کہ ان الفاظ کو واپس لینے کا حکم دے۔ پرانے زمانے میں اور بعض اوقات اب بھی بعض ارکان اپنی خطابت کے زور پر ارکان کی رائے کو متاثر کر دیتے ہیں۔ لیکن جب سے پارٹی بندی کی ترقی ہوئی ہے خطابت کا اثر بہت کم ہوگیا اسواسطے کہ ارکان اپنی مرضی کے خود مالک نہیں رہے۔ ان کی رائے اپنی پارٹی کی رائے کے ماتحت ہوتی ہے۔ پٹ برک، شیریڈن، گلیڈ اسٹن اور ڈزرائلی کی خطابت ہمیشہ یادگار رہے گی۔ لیکن اب عام طور پر پارٹی لیڈر خطابت کے مقابلے میں سیدھی سادی عام فہم اور براہ راست مطالب کو ذہن نشین کرنے والی تقریر کو ترجیح دیتے ہیں۔

ہاؤس آف کامنز کو عدالتی اختیار سماعت حاصل ہے۔ ہاؤس اپنے کسی رکن کو سزا دے سکتا ہے۔ مثلاً کسی قصور کی بنا پر کسی رکن کو خارج یا معطل کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی رکن ہاؤس کے احکام کی خلاف ورزی کرے تو پارلیمنٹ سے ملحق ایک چھوٹا سا جیل خانہ ہے اس میں اس کو نظر بند کیا جا سکتا ہے۔ دستوری طور پر جس طرح سیکڑوں سال پہلے پارلیمنٹ کو

یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے کسی رکن کو سزا دے اسی طرح آج بھی حاصل ہے لیکن عملی اعتبار سے
اس حق کو استعمال میں نہیں لایا جاتا۔ حال کے زمانے میں جب مسٹر بریڈلا نے اسپیکر کے
احکام کی خلاف ورزی کی اور ہاؤس میں باوجود منع کئے جانے کے زبردستی داخل ہونیکی
کوشش کی تو انھیں عارضی طور پر نظر بند کر دیا گیا تھا سیشن کے خاتمہ پر چاہے ایوان ملتوی
ہوا ہو یا برخاست اس شخص کو جسے اسپیکر کے حکم سے نظر بند کیا گیا ہے رہا کرنا لازمی ہے۔
ملکی عدالتیں اس کی مجاز نہیں ہیں کہ پارلیمنٹ کو اس کے حق سے جو کسی رکن کو نظر بند کرنے
کے متعلق حاصل ہے محروم کریں یا اسے معرض بحث میں لائیں بقول "ڈائسی" پارلیمنٹ
کے دونوں ایوانوں کو جو اختیارات حاصل ہیں اور خاص طور پر ہاؤس آف کامنز
جن اختیارات پر عمل کرتا ہے ان کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کی (ہاؤس آف کامنز کی)
حیثیت اور اس کا اقتدار ملک کے معمولی قانون سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ یہ نظر بندی
صرف دو وجوہ کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ یا تو کسی رکن نے اپنے حق کا بیجا استعمال کیا ہو
یا ایوان کی توہین یا اسپیکر کی عدول حکمی کی ہو تو اس کے خلاف نظر بندی کی کارروائی
کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاؤس آف کامنز کے ارکان کو
جو حقوق حاصل ہیں وہ بھی مطلق حیثیت نہیں رکھتے بلکہ انھیں صرف مفاد عامہ
کے پیش نظر مقررہ حدود کے اندر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اس بات کو سیاسی اور نفسیاتی دونوں نقطۂ نظر سے اہمیت حاصل ہے کہ
ہاؤس آف کامنز کا وقت مختلف کارروائیوں کے لئے کس طور پر تقسیم کیا جائے ایوان
میں جن مختلف مفادات کی نمائندگی ہوتی ہے وہ سب اس کی تمام کارروائیوں
میں اپنے حصہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ حکومتی اقدام سے اور مزید
پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ حکومت ایوان کے زیادہ تر وقت کو اپنے تصرف میں
رکھنا چاہتی ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ غیر سرکاری ارکان کی تجاویز پر
تحدید عاید کی جائے۔ پارلیمانی کارروائیوں میں جب اس قسم کا تصادم پیدا ہو جائے تو

ضرور ہے کہ ایسے قواعد وضوابط ہونے چاہئیں جن سے یہ دشواری رفع ہوسکے۔ اس وقت اور بھی دشواری پیدا ہو جاتی ہے جب حکومت اپنی تجاویز کو زیادہ اہمیت دے کر دوسری تجاویز کے مقابلے میں قابل ترجیح قرار دیتی ہے یا اگر کبھی حکومت کی مخالف جماعت پارلیمانی عمل کے ذریعہ حکومت وقت کو نقصان پہنچانے، کمزور کرنے یا تباہ کرنے کے درپے ہو لیکن کوئی پارلیمانی حکومت اس وقت تک اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتی جب تک کہ پارلیمنٹ کی کارروائیوں میں اس کی خواہشات اور مطالبات کو تقدم اور ترجیح نہ حاصل ہو۔ پارلیمنٹ کا پروگرام مقرر کرنا بھی نہایت اہم ہے اسواسطے کہ اس پر اس کے کاموں کی مجموعی مقدار کا انحصار ہے کسی روز کا لائحہ عمل (آرڈرز آف دی ڈے) مقرر کرنے میں یہ سادہ اور عام اصول پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ ایوان کے ارکان کی اکثریت کی مرضی کا حتی المقدور لحاظ رکھا جائے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دستوری طور پر ایوان کی اکثریت کو یہ حق حاصل ہے کہ یہ طے کرے کہ اس کے سامنے جو معاملات پیش ہوں ان میں پہلے کون سا معاملہ پیش کیا جائے اور بعد میں کون سا۔ ایوان اپنے کام کی ترتیب کو معین کرنے کا مجاز ہے۔ جو پارلیمنٹ اپنے کام کی ترتیب کو معین نہیں کرسکتی اس کی حیثیت انتظامی بورڈ سے زیادہ نہیں۔ انیسویں صدی عیسوی میں پارلیمانی حکومت میں جو تبدیلیاں عمل میں آئیں ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ پارلیمنٹ اہم انتظامی معاملات کی ذمہ دار قرار پائی اور بالخصوص ملکی مالیات کا تعلق کلیتہً اسی سے وابستہ ہوگیا جس کے سبب سے اس کی قوت میں بہت اضافہ ہوا۔ پھر اس کے علاوہ جس پارٹی کو ہاؤس آف کامنز میں اکثریت حاصل ہوتی ہے اس کی کمیٹی یعنی کابینہ کے لئے وضع قانون کے متعلق تمام مجوزات اپنی طرف سے پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرنے کا حق تسلیم کرلیا گیا۔ ان دونوں باتوں سے یہ نتیجہ نکلا کہ حکومت کو پارلیمانی کارروائیوں کے لئے وقت تقسیم کرنے کا حق حاصل ہوگیا اور اپنے حسب صوابدید اپنی ضروریات کے لئے پارلیمنٹ کا وقت مخصوص کرنے کا اختیار مل گیا۔ نجی ارکان کو اپنی طرف سے

بہت کم تجاویز پیش کرنے کا موقع رہا جب تک کہ حکومت ان کی کسی تجویز کے ساتھ غیر معمولی طور پر دلچسپی نہ لے رہی ہو۔

ہاؤس آف کامنز کا حلقۂ عمل غیر محدود ہے۔ اسی لئے اس کے سامنے ہر قسم کے معاملات پیش ہوسکتے ہیں۔ وہ قومی اور ملکی ضروریات کے لئے وضع قانون کرتا ہے حکومت سے اخراجات اور نئے محصولات منظور کرتا اور جو بھی مسودات قانون اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں ان پر غور کرتا ہے۔ ہاؤس آف کامنز میں ایک طرف نو کروڑ ول پونڈ کے اخراجات کی منظوری دی جاتی اور برطانوی شہنشاہی کے اہم ترین امور کے متعلق قطعی فیصلے ہوتے ہیں اور دوسری طرف معمولی نوعیت کے مقامی یا شخصی معاملات کو معرض بحث میں لایا جاتا ہے۔ اسی ایوان میں اس کا تصفیہ ہوتا ہے کہ بین الاقوامی سیاست میں ملک کیا حکمت عملی اختیار کرے اور اسی میں یہ طے ہوتا ہے کہ خط ڈالنے کے ڈبے کس طرح نصب کئے جائیں اور پالتو کتوں کے گلے میں کس قسم کا پٹہ ہونا چاہئے۔ ہاؤس آف کامنز کے اسٹیج پر پارٹی کی لڑائیاں لڑی جاتی ہیں، حکومت کی سیاسی زندگی اور موت کے فیصلے ہوتے ہیں اور اشخاص یہیں اپنی قابلیتوں کے اظہار سے آئندہ ترقی کی منزلیں طے کرتے ہیں ۔ قوم کے آئندہ لیڈر وہی بنتے ہیں جو ہاؤس آف کامنز کی جانچ میں پورے اتریں اور اپنی قیادت کی صلاحیت کا ثبوت دیں۔ اور یہ سب کچھ اس ایوان کے محدود میقات کے اندر ہوتا ہے۔ مقامی اور بین الاقوامی مسائل، قانون کے عام اصول کا تعین، نظم ونسق کے کسی ادارے کو قایم کرنے یا مٹانے کے فیصلے، شہنشاہی مفاد کی نگرانی اور انگریزی قوم کے وقار کو دنیا میں قایم کرنے کی سعی وتدبیر سب کچھ پارلیمنٹ کے مقررہ اوقات کے اندر معرض بحث میں آتے ہیں۔ اگر ان تمام معاملات کے متعلق ہاؤس آف کامنز کا ہر رکن اظہار خیال کرے تو ظاہر ہے کہ کوئی کام کبھی طے نہ ہوسکے۔ اس لئے یہ سب کچھ مقررہ قواعد وضوابط کے تحت ہوتا ہے لیکن کچھ عرصے سے جب سے کہ پارٹی بندی کو فروغ ہوا اور پارٹی کے ڈسپلن کی پابندی پارلیمنٹ کے ارکان پر واجبی قرار پائی تو

ہے کہ مجوزہ مسودہ میں کوئی حصہ ایسا نہ ہو جو وزارت کے حامیوں کو ناپسند ہو یا جسکے متعلق مخالف جماعت نقصان رساں تنقید کر سکے اور اپنی تنقید کو کسی اعلیٰ یا مقبول اصول پر مبنی قرار دے سکے۔ کابینہ کو اگرچہ ہاؤس آف کامنز میں عموماً اکثریت حاصل ہوتی ہے لیکن وہ اس کی ہمیشہ کوشش کرتی رہتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنے مخالفوں کو مخالفت کا موقع نہ دے۔ انھیں اسباب کی بنا پر جب کوئی نیا قانون بنایا جاتا ہے تو کابینہ پوری احتیاط سے کام لیتی ہے۔ بعض اوقات اپنی ہی جماعت کے بعض لوگوں کے اصرار یا ہاؤس آف کامنز کے عام رجحان کے مدنظر کابینہ اپنے مجوزہ مسودہ میں اہم تبدیلیاں خود کر دیتی ہے۔

پارلیمنٹ کے منظور کئے ہوئے بعض قوانین عارضی نوعیت کے ہوتے ہیں جن کا منشاء کسی خاص صورت حالات پر قابو پانا ہوتا ہے۔ اگر آئندہ ضرورت ہوئی تو ان قوانین کے نفاذ کی مدت میں توسیع ہوتی رہتی ہے۔ بالعموم کسی قانون کو پارلیمنٹ میں منظور کرانے میں بہت وقت صرف ہوتا ہے لیکن ناگہانی حالات کے لئے جو قوانین پیش کئے جاتے ہیں وہ بہت جلد منظور ہو جاتے ہیں۔ ہاؤس آف کامنز کے متعلق عام طور پر یہ شکایت کی جاتی ہے کہ ہر قسم کے قانون وضع کرنے کا اختیار یہ ایوان اپنے تحت رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن پچھلے دنوں خاص طور پر جنگ عظیم کے بعد سے انگلستان میں یہ رجحان دن بہ دن قوی ہوتا جاتا ہے کہ حکومت کے مختلف محکموں کو ضابطے اور قواعد بنانے کے اختیارات دئے جائیں۔ عملی طور پر یہ قواعد وضوابط اسی طرح موثر ہوتے ہیں جیسے پارلیمنٹ کے منظور کئے ہوئے قوانین۔ مثلاً پچھلے دنوں انگلستان کے مختلف حصوں میں آئرش ریپبلکن آرمی کے بعض افراد نے دہشت انگیزی کی تحریک برپا کر رکھی تھی۔ یہ لوگ دہشت انگیز کے طریقوں پر عمل کر کے السٹر (شمالی آئرلینڈ) کو جنوبی آئرلینڈ میں شامل کرنے کے مدعی ہیں۔ چنانچہ ان کے ایجنٹوں نے انگلستان کے مختلف شہروں میں عمارتوں،

کارخانوں، اور ریلوں کو بارود سے اُڑانے کی کوشش کی اور اس طرح بہت سے لوگوں کی جانیں ضائع گئیں اور بہت سے زخمی ہوئے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۳۹ء میں ہوم سکریٹری نے اس کے متعلق ایک مسودۂ قانون ہاؤس آف کامنز میں پیش کیا جس کا مقصد دہشت انگیزی کے واقعات کی روک تھام تھا۔ چند روز کے اندر اندر مجوزہ مسودۂ قانون پارلیمنٹ میں پیش ہوا، بحث بھی ہوئی اور منظور بھی ہوگیا۔ اس قانون کی رو سے ہوم سکریٹری مجاز گردانا گیا ہے کہ وہ مشتبہ لوگوں کو بلاکسی عدالتی کارروائی کے جلاوطن کردے اور اگر کوئی اس کے حکم کی خلاف ورزی کرے تو اس کو پانچ سال کی سزا دی جائے۔ اسی طرح ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کے بعد پارلیمنٹ میں قانون حفظ عامہ چند گھنٹوں میں منظور ہوگیا۔ انگریزی پارلیمنٹ کی مشین کچھ اس طرح کی ہے کہ اس کے پہیئے بہت آہستہ آہستہ بھی چل سکتے ہیں اور جب ضرورت ہو تو ان کی رفتار میں انتہا درجہ کی تیزی بھی آسکتی ہے۔

(باقی آئندہ)

سود کے دو اہم نظریئے

یعنی

اسنادی نظریہ اور نظریۂ ترجیح نقد کا خلاصہ

از

سید فخر الحسن۔ ایم۔ اے (عثمانیہ) لکچرار معاشیات جامعہ عثمانیہ

(۱)

عالم فطرت کے مختلف مظاہر کی حقیقت و ماہیت سے اگر انسان اپنی تمام جولانیٔ عقل کے باوجود اب تک کما حقہٗ واقف نہ ہو سکا اور اس کا علم صرف "کیا ہوتا ہے" کی حد سے آگے نہ بڑھ سکا تو یہ کوئی تعجب کا مقام نہیں، اس لئے کہ یہ کائنات قدرت کی بنائی ہوئی ہے اس کے مظاہر قدرت کے پیدا کردہ ہیں۔ بھلا اس کی حقیقت کو انسان سمجھے تو کیوں کر سمجھے! لیکن اس عالم فطرت میں خود انسان نے جو ایک تمدن زندگی کا عالم پیدا کیا ہے اس کے مظاہر کی حقیقت و ماہیت کی تلاش میں بھی اس کی عقل درماندہ نظر آتی ہے ایک ہی مظہر کی جس کا وہ خود خالق ہے آج ایک توجیہہ پیش کرتا ہے تو کل دوسری، اور اس طرح یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ:

"ہر دم متغیر ہیں خرد کے نظریات"

چنانچہ اس تمدنی عالم کے شعبۂ معیشت کا بھی یہی حال ہے کہ اس کے مختلف مظاہر کے متعلق انسان صدیوں کے گہرے مطالعہ اور مختلف طریق تحقیق کے باوجود کوئی متفقہ اور صحیح نظریہ پیش نہ کرسکا کسی ایک معاشی مظہر کو لے لیجئے اہل علم اس کے مختلف نظریئے پیش کرتے ہیں۔ مثلاً قیمت کا نظریہ (حالانکہ یہ معاشیات کا اہم اور ایک بنیادی مسئلہ ہے) آج تک اس کا فیصلہ نہ ہوسکا کہ یہ کیوں کر مقرر ہوتی ہے۔ یہی حال سود کا ہے اب تک مختلف معاشیین نے اس کے مختلف نظریئے پیش کئے اور ان کے درمیان نہ صرف کوئی جزئی بلکہ بعض بنیادی اختلاف بھی پایا جاتا ہے اور یہ اپنے خصوصیات و نتائج کے اعتبار سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں دو نظریئے خاص طور سے لائق ذکر ہیں، ایک تو مشہور پیداآوری کا نظریہ جو اسنادی دبستان Classical School نے پیش کیا ہے دوسرا ترجیح نقد Liquidity Preference کا نظریہ جسے عہد جدید کے ایک ممتاز انگریز معاشی (جے۔ ایم کینس J. M. Keynes نے چند سال قبل پیش کرکے مفکرین معاشیات کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی ہے! اس میں شک نہیں کہ عہد حاضر کے بعض دیگر مشہور معاشیین نے بھی کم و بیش اس قسم کے نظریئے پیش کئے ہیں اور ان میں سے بعض یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ان کا اور کینس کا نظریہ ایک ہی ہے اور جو اختلاف ہے وہ محض جزئی اور اصلاحی۔ چنانچہ پروفیسر اوہلن Ohlin جس کے نظریہ کی بنیاد اس تاک ہوم نظریۂ پس اندازی و تشغل اصل پر ہے، اپنے نظریئے اور کینس کے نظریئے میں کوئی خاص فرق نہیں سمجھتے۔ گرچہ خود کینس اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں اور وہ اپنے نظریہ اور پروفیسر اوہلن اور دیگر سوئڈن دبستان Swedish School کے معاشیین کے نظریے میں نمایاں اختلاف سمجھتے ہیں۔

باایں ہمہ کینس کا نظریہ نہ صرف سب سے زیادہ نمایاں اور انقلابی حیثیت

رکھتا ہے بلکہ اُسے بڑی حد تک عملی اہمیت بھی حاصل ہوسکتی ہے۔

اس مضمون میں پہلے ہم اسنادی نظریئے کا مطالعہ کریں گے اور اس کے بعد کینس کے نظریۂ ترجیح نقد کو پیش کریں گے تاکہ دونوں کی نوعیت وخصوصیت کا ایک تقابلی علم ہوسکے۔

(۲)

اسنادی نظریہ :۔

اسنادی نظریہ کی رو سے سود کسے کہتے ہیں، یہ کیوں ادا کیا جاتا ہے اور اس کا تعین کیونکر ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں کی تشریح کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اصل کی اہمیت خصوصیت اور اس کی طلب ورسد کے حالات کی مختصر سی وضاحت کردی جائے۔

پیدائش دولت کے موجودہ ترقی یافتہ طریقے میں جو بوم باورک Bohm Bawark کے الفاظ میں ایک پیچیدہ اور بالواسطہ طریق ہے، اصل یا سرمایہ کو دیگر عاملین پیدائش کے مقابلے میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طریق پیدائش کو عام طور سے اصل وارانہ طریق پیدائش سے موسوم کیا جاتا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا کے تمام مروجہ نظامہائے معیشت میں خواہ وہ اشتراکی ہی کیوں نہ ہو اصل کی بحیثیت عامل پیدائش ہر جگہ ضرورت ہے اور کم وبیش یکساں اہمیت حاصل ہے۔

پیدائش دولت میں محنت کے ساتھ اصل سے کام لینے سے نمایاں طور پر محنت کی کارگردگی بڑھ جاتی ہے اور اس کی ہر اکائی بہ نسبت پہلے کے زیادہ دولت پیدا کرتی ہے اور جیسے جیسے اصل کے استعمال میں اضافہ ہوتا ہے دولت کی پیداوار میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ اصل کی یہی پیدا آوری کی صفت جو درحقیقت اس کا "افادہ" ہے اس کی طلب کا باعث بنتی ہے اور جس طرح دیگر اشیاء ان کے افادہ کی بنا پر طلب کی جاتی ہیں اصل بھی اپنے اس افادہ یعنی پیدا آوری کی

بنا، پر طلب کیا جاتا ہے۔

یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ اصل اس لئے طلب کیا جاتا ہے کہ اس میں پیدا آوری ہے اور پیدائش دولت کا کام بغیر اس کے نہیں چل سکتا اگر ہم یہ چیز پیش نظر رکھیں کہ اصل میں "قلت" ہے یعنی طلب کے مقابلے میں اس کی رسد کم ہے تو پھر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے حاصل کرنے کے لئے کچھ معاوضہ ادا کرنا بھی لازمی ہوگا چنانچہ اصل کے حاصل کرنے کا یہی معاوضہ جو اس کی پیدا آوری اور قلت کے باعث ادا کیا جاتا ہے سود ہے۔ غرض مختصراً ہم نے معلوم کر لیا کہ سود کیا ہے اور کیوں ادا کیا جاتا ہے۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ سود کا تعین کس طرح پر ہوتا ہے بالفاظ دیگر شرح سود کیونکر مقرر ہوتی ہے۔ اس کا صاف اور سیدھا جواب یہ ہے کہ عام اشیاء کی قیمت کی طرح شرح سود بھی قانون طلب و رسد کے زیر اثر ہے بالفاظ دیگر شرح سود اصل کی طلب و رسد کے نقطۂ توازن کے تابع ہوتی ہے۔ پس اس لئے اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اصل کی قیمت طلب اور قیمت رسد کیا ہے یعنی اصل طلب کرنے والا کس حد تک معاوضہ دینے پر اور اصل مہیا کرنے والا کس حد تک معاوضہ لینے پر آمادہ ہوتا ہے۔

قیمت طلب کے سلسلے میں ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اصل کی اکائی کی پیدا آوری مختلف شعبہ ہائے پیدائش میں مختلف ہوتی ہے یعنی بعض شعبے میں زیادہ بعض میں کم اور بعض کی ایسی حالت ہوتی ہے کہ یہاں پیدا آوری اختتام پر ہوتی ہے جسے اصطلاحاً پیدا آوری مختتم، یا کینس کی اصطلاح میں، کارکردگی مختتم کہا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب اصل کی پیدا آوری کے مختلف مدارج ہیں تو پھر اس کا معاوضہ کس لحاظ سے مقرر ہوگا۔ ایسی صورت میں یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مختلف شعبوں کی پیدا آوری کے اعتبار سے مختلف سود ادا کیا جائے اس لئے کہ عملاً یہ ناممکن ہے۔ رہی دوسری صورت یعنی بیشترین پیدا آوری کے لحاظ سے سود ادا کیا جائے لیکن ایسا بھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جہاں نسبتاً پیدا آوری کم ہے وہاں سود ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس طرح اصل کی

طلب کم ہو جائے گی لہذا ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے یعنی کمترین پیداآوری کے برابر سود ادا کیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ عملاً ممکن بھی ہے البتہ یہ واضح رہے کہ ایسی صورت میں یہ ہوگا کہ جن شعبوں میں اصل کی پیداآوری نسبتاً زیادہ ہے وہاں کچھ ماحصل زاید ملے گا جسے نفع پیداکنندہ Producers Surplus کہتے ہیں پس معلوم ہوا کہ اصل کی قیمت طلب پیداآوری مختتم کے مساوی ہوتی ہے بالفاظ دیگر اصل طلب کرنے والا جس شرح سود پر آمادہ ہوگا وہ اصل کی پیداآوری یا کارکردگی مختتم سے زیادہ نہ ہوگی۔

اصل کی قیمت رسد:—

جہاں تک قیمت رسد کا سوال ہے اس ضمن میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اصل کی رسد کن حالات پر مبنی ہے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ اصل کی رسد کا انحصار لوگوں کی پس اندازی کی عادت پر ہے یعنی لوگ اپنی تمام موجودہ آمدنی کو صرف نہ کردیں بلکہ کچھ بچا رکھیں تو اصل میں اضافہ ہوگا۔ اصل کی پس اندازی مختلف وجوہ کی بناء پر عمل میں آتی ہے بعض لوگ سماج میں عزت کی خاطر بعض آئندہ احتیاج رفع کرنے کی خاطر بعض کاروبار میں ترقی کی خاطر۔ غرض اس قسم کی مختلف محرکات کی بناء پر لوگ پس انداز کرتے ہیں۔

اب ایسے تمام پس انداز کرنے والوں کی عموماً تین قسمیں ہوسکتی ہیں ایک تو وہ جو اپنے پس اندوختہ کے لئے کچھ معاوضہ طلب نہ کریں بلکہ اسے محفوظ رکھنے کے لئے خود کچھ معاوضہ ادا کریں تو یہ گویا سود منفی کی حالت ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو اپنے پس اندوختہ کے عوض کچھ طلب نہ کریں جیسا کہ قرض حسنہ کی صورت میں ہوتا ہے۔ تیسرے وہ جو اپنے پس اندوختہ کا معاوضہ طلب کریں اور مختلف معاوضہ طلب کریں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ اگر پہلے دو قسم کے لوگوں کا پس اندوختہ اصل کی مقدار طلب کو پورا کرنے کے لئے کافی ہے تو پھر قیمت رسد کا سوال پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ مگر چونکہ ایسا ہونا مشکل ہے اور اصل کی مقدار طلب کو پورا کرنے کے لئے ایسے پس اندوختوں کی بھی

ضرورت ہوتی ہے لہذا قیمت رسد کا مسئلہ پیدا ہونا لازمی ہے۔ اب چونکہ ایسے پس اندوختہ کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک تو وہ جس کے لئے کچھ معاوضہ مل جانے کی ترغیب درکار ہے۔ دوسرے وہ جس کے لئے موجودہ شرح معاوضہ ضروری ہے اور اس سے کم معاوضہ پر پس انداز نہ ہوگا، یعنی جو اختتامی حد پر ہے۔ تیسرے وہ جو شرح معاوضہ کے بڑھ جانے پر پس انداز ہو۔ پس ایسی صورت میں سوال یہ ہے کہ کونسی شرح معاوضہ قیمت رسد کو ظاہر کرے گی۔ بالفاظ دیگر کس پس اندوختہ کے لحاظ سے سود مقرر ہوگا۔ ظاہر ہے کہ قیمت طلب کی طرح قیمت رسد بھی مختلف نہیں دی جاسکتی بلکہ ایک ہی قیمت دی جائے گی جو بیشتر بن شرح کے مساوی ہوگی۔ پس بالفاظ ٹاسگ Taussig "شرح سود اس نقطے پر قرار پاتی ہے جہاں پر اصل کی پیدا آوری مختتم پس اندوختہ کی قسط مختتم کو حاصل کرنے کے لئے کافی ہو"۔ مارشل نے سود اور شرح سود کی تعریف و تعین کا جن الفاظ میں کیا یہ کہ "سود جو کسی بازار میں اصل کے استعمال کی قیمت کے طور پر ادا کیا جاتا ہے وہ ایک ایسے متوازن سطح کی طرف مائل ہوتا ہے کہ اس بازار میں اس شرح سود پر اصل کی مجموعی طلب اس طرح سود پر حاصل ہونے والے مجموعی سرمایہ کے برابر ہوتی ہے۔"

غرض مندرجہ بالا تشریحات سے معلوم ہوا کہ اسنادی نظریہ کی رو سے سود پس اندازی یا انتظارکشی کا معاوضہ ہے جو اصل حاصل کرنے کے لئے ادا کیا جاتا ہے اور جس کا تعین اصل کی پیدا آوری مختتم کے زیر اثر ہوتا ہے اور اس نظریہ کی خصوصیت یہ ہے کہ شرح سود کے ذریعہ مجموعی پس اندازی اور شغل اصل میں مساوات رہتی ہے۔ نیز یہ کہ شرح سود میں اضافہ اور کمی کے باعث پس اندازی میں اضافہ یا کمی ہوتی ہے۔

(۳)

ترجیح نقد کا نظریہ

کینس کا نظریہ سود اسنادی نظریہ کی طرح سکونیاتی نہیں بلکہ حرکیاتی ہے کینس کے

نزدیک سود پس اندازی یا انتظارکشی کے بجائے ترجیح نقد کا معاوضہ ہے جس کا تعین
موجودہ مقدارِ زر کے زیر اثر ہوتا ہے۔ شرحِ سود ایک مظہرِ زر ہے یہ نہ تو پس اندازی
اور شغلِ اصل میں مساوات کا ذریعہ ہے اور نہ اس کے اضافہ اور کمی سے
پس اندازی میں اضافہ وکمی ہوتی ہے۔

یہ جاننے کے لئے کہ سود ترجیح نقد کا معاوضہ ہے۔ پہلے یہ جان لینا چاہئے
کہ کینس کی مراد ترجیح نقد سے کیا ہے۔ کینس نے اس سلسلے میں دو قسم کی تفسیاتی
ترجیحات کی وضاحت کی ہے۔ ایک تو ترجیح وقت ہے جس کے تحت ہم اپنی
آمدنی کا کچھ حصہ موجودہ استعمال کے لئے مختص کرتے ہیں اور کچھ آئندہ کے لئے۔
چنانچہ وہ اس کو "میلانِ صرف" اور میلانِ پس اندازی" سے تعبیر کرتا ہے جو بڑی
حد تک بوم باورک کی اصطلاح "صرف کرنے کی خواہش" اور "پس انداز کرنے کی
خواہش" کے مرادف ہے۔ کینس کے نزدیک ایسے موضوعی نوعیت کے آٹھ محرکات و
مقاصد ہیں جن کے تحت افراد اپنی تمام آمدنیوں کو موجودہ احتیاج پر صرف
کر دینے کے بجائے آئندہ کے لئے محفوظ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان محرکات و مقاصد کو

وہ احتیاط Precaution پیش بینی Forsight تخمینہ
Calculation اصلاح Improvement آزادی
Independence اولوالعزمی Enterprise نخوت Pride
اور بخالت Averice سے موسوم کرتا ہے۔ اسی طرح آمدنی کو
موجودہ احتیاجات پر صرف کرنے کے محرکات ہیں ناعاقبت اندیشی Short
sightedness سخاوت Generosity غلط تخمینہ Miscalculation
نمائش دولت Ostentation فضول خرچی Extravagance
شمار کرتا ہے۔

دوسری ترجیح یعنی یہ تصفیہ کر لینے کے بعد کہ آمدنی کا کس قدر حصہ آئندہ کے لئے

محفوظ کر لیا جائے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حصہ آمدنی کو کس شکل میں رکھا جائے۔ آیا اسے نقد کی شکل میں رکھا جائے یا پھر ایسے سود بخش اثاثے کی شکل میں جو کسی معینہ یا غیر معینہ مدت کے بعد نقد میں تبدیل ہو سکے۔ چنانچہ کینس آئندہ کے لئے اس مختصہ آمدنی کے حصے کو نقد کی شکل میں رکھنے کی خواہش کو ترجیح نقد سے تعبیر کرتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ سود کے دیگر مسلمہ نظریوں میں جو غلطی کی گئی وہ یہی کہ اس دوسری ترجیح کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اول الذکر ترجیح کی بناء پر سود حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ سود صرف اس طرح کی پس اندازی یا انتظار کشی سے حاصل نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ اس غیر صرف شدہ حصہ آمدنی کو نقد شکل میں محفوظ رکھنے کے بجائے دیگر شکل میں نہ رکھا جائے۔ بالفاظ دیگر سود انتظار کشی کے بجائے ترجیح نقد کا معاوضہ ہے جو افراد کو اس کے غیر صرف شدہ حصۂ آمدنی کو نقد کی شکل میں نہ رکھنے لئے آمادہ کرتا ہے۔ پس "شرح سود" خود کینس کے الفاظ میں "وہ قیمت ہے جو دولت کو نقد کی شکل میں رکھنے کی خواہش اور موجودہ مقدار نقد میں توازن پیدا کرتی ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر شرح سود یعنی ترجیح نقد سے دست بردار ہونے کا معاوضہ کم ہو جائے تو جملہ مقدار نقد جس کے رکھنے کی لوگ خواہش کرتے ہیں وہ موجودہ (نقد کی) رسد سے بڑھ جائے گی اور اگر شرح سود بڑھ جائے تو (جملہ مقدار نقد جس کے رکھنے کی لوگ خواہش کرتے ہیں وہ موجودہ نقد سے کم ہو جائے گی اور) ایک حصہ حقیقی مقدار نقد کا بچ رہے گا جس کو رکھنے کی کوئی خواہش نہ کرے گا۔ پس مقدار زر ایک دوسرا ذریعہ ہے جو ترجیح نقد سے مل کر حقیقی شرح سود خاص حالات میں معین کرتا ہے۔" لہذا معلوم ہوا کہ شرح سود کے تعین پر موجودہ حقیقی مقدار زر کا اثر پڑتا ہے اور اس لحاظ سے سود بھی ایک مظہر زر ہے۔

کینس کے نظریہ نے اسنادی دبستان کے اس خیال کو بھی باطل قرار دیا ہے کہ شرح سود کے ذریعہ پس اندازی اور شغلی میں مساوات پیدا ہوتی ہے یعنی اگر

پس اندازی یا شغل میں اضافہ ہو جائے تو شرح سود ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے دونوں میں توازن پیدا ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں جہاں تک پس اندازی اور شغل کے مساوی ہونے کا تعلق ہے کینس کو اس سے کوئی اعتراض نہیں۔ وہ اس امر کا معترف اس وقت سے جبکہ وہ اپنے اس نظریۂ سود پر پہنچا بھی نہ تھا۔ اسے جو کچھ اختلاف ہے وہ اسنادی معاشیین کے اس خیال سے کہ ان دونوں میں شرح سود کے ذریعہ توازن پیدا ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک مساوات کا سبب شرح سود نہیں بلکہ آمدنیوں کی سطح ہے۔

کینس نے اس سلسلے میں آمدنی، پس اندازی اور شغل کے مفہوم کو نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی ہے اگرچہ اس کے باوجود بھی بعض معاشیین کو اس ضمن میں کچھ غلط فہمیاں ہوگئی ہیں۔ مثلاً ہاٹرے نے Hawtery نہ صرف پس اندازی اور شغل کو مساوی سمجھا بلکہ مرادف وہم معنی بھی سمجھ لیا جس کے جواب میں کینس کو اس غلط فہمی کی طرف ہاٹری کی توجہ منعطف کرانی پڑی) وہ اس کی تعریف بھی اس طرح کرتا ہے جس سے نتیجتاً پس اندازی اور شغل کا مساوی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ پس اندازی کی مقدار افراد صارفین کے مجموعی طرز عمل کا نتیجہ ہے اور مقدار شغل کاروباری افراد کے مجموعی طرز عمل کا نتیجہ ہے اور ان دونوں مقداروں کا مساوی ہونا لازمی ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک آمدنی کے اُس حصہ کے مساوی ہے جو صرف کے بعد بچتا ہے۔ اگر اس امر سے اتفاق کر لیا جائے کہ آمدنی موجودہ پیداوار کی قیمت کے مساوی ہے اور موجودہ شغل موجودہ پیداوار کے اُس حصہ کی قیمت کے مساوی ہے جو صرف نہیں کیا گیا اور پس اندازی آمدنی کے غیر صرف شدہ حصہ کے مساوی ہے تو پھر پس اندازی اور شغل لازماً مساوی ہوں گے اور اس مساوات کو مختصراً اس طرح ظاہر کیا جا سکتا ہے:

آمدنی = پیداوار کی قیمت = (صرف) + (شغل)

پس اندازی = (آمدنی) ۔ (صرف)

∴ پس اندازی = شغل

بہرکیف اب رہی یہ بات کہ یہ مساوات شرح سود کے بجائے آمدنی کی سطح کے زیر اثر کس طرح عمل میں آتے ہیں تو وہ اس سلسلے میں اسنادی اسکول نے جہاں پر لغزش کی ہے بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر یہ فرض کیا جائے کہ شرح سود، اصل کی طلب اور شرح سود کا اثر دی ہوئی آمدنی سے پس انداز کرنے کی آمادگی پر کیا ہوگا۔ یہ تینوں چیزیں دی ہوئی ہیں تو ایسی صورت میں لامحالہ آمدنی ہی ایک ایسا ذریعہ ہوگی جو مقدار پس اندازی اور مقدار شغل میں مساوات پیدا کردے گی۔

غرض کینس کے نزدیک اسنادی اسکول نے مقدار آمدنی کے تغیرات کے اثر کو نہ صرف نظرانداز کردیا بلکہ یہ بھی غلطی کی کہ آمدنی مستقل رہنے کے مفروضے کے ساتھ یہ بھی فرض کرلیا کہ پس اندازی اور شغل دونوں میں ایک دوسرے کے بغیر علیحدہ طور پر فرق پیدا ہوسکتا ہے اور اس کی وجہ سے آمدنی میں کوئی فرق نہیں ہوسکتا حالانکہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے تغیر سے بھی آمدنی میں تبدیلی ہوتی ہے مثلاً اگر شغل میں اضافہ ہو تو آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا اور اس کے ذریعہ پس اندازی اور شغل دونوں میں مساوی اضافہ عمل میں آئے گا یا پھر اگر پس اندازی میں کمی ہو تو پھر شغل میں کمی ہوگی اور آمدنی کم ہوجائے گی اور بالآخر پس اندازی اور شغل میں کم سطح پر مساوات قائم ہوجائے گی۔ لہٰذا کینس کے خیال میں پس اندازی اور شغل اصل میں جو چیز مساوات پیدا کرتی ہے وہ شرح سود نہیں بلکہ مقدار آمدنی ہے۔ شرح سود کا عمل اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ صرف یہ بتا سکتا ہے کہ ایک خاص شرح سود کی صورت میں آمدنی کی سطح کیا ہوگی یا پھر یہ کہ شرح سود کیا ہونی چاہیئے اگر آمدنی کو کسی خاص سطح پر برقرار رکھنا منظور ہو۔

اصل کی کارکردگی یا پیدا آوری مختتم :۔

شرح سود کا جو تعلق اصل کی پیدا آوری یا کارکردگی مختتم سے ہے اس سلسلے میں

اسنادی نظریہ یہ ہے کہ شرح سود کا تعین اصل کی کارکردگی مختتم کے زیر اثر ہے کینس کا خیال یہاں بھی مختلف ہے وہ سود کو کارکردگی مختتم کے زیر اثر سمجھنے کے بجائے خود کارکردگی مختتم کو شرح سود کے زیر اثر سمجھتا ہے اِس لئے کہ اس کے خیال میں کارکردگی مختتم کا انحصار اصل کی موجودہ قیمت رسد اور اس کی متوقع پیداآوری پر ہے۔ چونکہ اصل کی پیداوار فوراً اس کے استعمال سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ مسلسل کئی سال گذرنے کے بعد۔ لہٰذا اصل کی کارکردگی مختتم کا تخمینہ اصل کے جرعہ مختتم کے استعمال سے آئندہ جن مختلف پیداوار کی توقع کی جاتی ہے ان کی موجودہ کم شمار کردہ قیمت Present discounted value کے لحاظ سے کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کم شماری Discounting کا انحصار موجودہ شرح سود پر ہوتا ہے، پس اگر کارکردگی مختتم کو متوقع پیداوار کی موجودہ کم شمار کردہ قیمت سمجھیں تو اس کے تعین کے لئے موجودہ شرح سود کا جاننا لازمی ہے۔ چنانچہ کینس کے نزدیک اس میں شک نہیں کہ توازن کی حالت میں شرح سود اصل کی پیدا آوری مختتم کے برابر ہوتی ہے اور دونوں کے درمیان عدم مساوات کی صورت میں موجودہ مقدار شغل میں اضافہ وکمی کرکے توازن کی حالت پر لانا مفید ہوتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پیدا آوری مختتم شرح سود کے زیر اثر ہے، بس کارکردگی مختتم کے جدول سے جو کچھ بھی پتہ چل سکتا ہے وہ یہ نہیں کہ شرح سود کیا ہے بلکہ یہ کہ ایک خاص شرح سود میں وہ کو کون سا نقطہ ہے جہاں پر شغل کی پیداوار کھینچ کر آجاتی ہے۔

شرح سود کے اضافہ وکمی سے پس اندازی کا تعلق :۔

اسنادی نظریۂ سود کے لحاظ سے شرح سود کے تغیر سے پس اندازی میں جو تغیر ہوتا ہے وہ یہ کہ اضافہ شرح سود سے پس اندازی میں بھی اضافہ ہوتا ہے، اور کمی شرح سود سے پس اندازی میں بھی کمی ہوتی ہے۔ بادی النظر میں یہ خیال

صحیح معلوم ہوتا ہے خصوصاً ایک معینہ مقدار آمدنی اور قلیل مدت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا امکان بھی ہے مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے کینس کے نزدیک اس میں شک نہیں کہ حقیقی پس اندازی کی مقدار پر شرح کا اثر ایک مستقل اہمیت رکھتا ہے لیکن استادی نظریہ کی رو سے یہ سمجھنا کہ شرح سود میں اضافہ پس اندازی میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے، حقیقت سے بہت دور ہے۔ یہ مفروضہ ممکن ہے ایک مستقل آمدنی کی سطح کے پیش نظر سکونی حالت میں صحیح ہو لیکن حرکیاتی حالات اور غیر مستقل آمدنی کا لحاظ کرتے ہوئے صحیح نہیں ہوسکتا۔

کینس کے نزدیک شرح سود میں اضافہ کی وجہ سے حقیقی پس اندازی کی مقدار میں کمی ہونا لازمی ہے، اس لئے کہ مجموعی پس اندازی مجموعی شغل اصل کے تابع ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ شرح سود کا اضافہ شغل اصل میں کمی کا باعث ہوتا ہے اور جب شغل اصل میں کمی ہوگی تو نتیجتاً آمدنی میں تخفیف ہو جائے گی اور یہ تخفیف پس اندازی میں تخفیف کا سبب ہوگی اور اس طرح ممکن ہے قلیل مدت میں شرح سود کا اضافہ پس اندازی کے موافق ہو اور اس کی وجہ سے اس میں اضافہ ہو جائے مگر طویل مدت میں اس کا مخالف اثر ہوگا اور حقیقی مقدار پس اندازی میں کمی کا باعث بن جائے گا۔ نیز اس اضافہ شرح سود سے نہ صرف حقیقی پس اندازی میں کمی واقع ہوتی ہے بلکہ مقدار صرف میں بھی تخفیف ہو جاتی ہے، کیونکہ جب مقدار آمدنی میں بھی کمی ہو جائے گی تو لامحالہ پس اندازی اور صرف دونوں کا متاثر ہونا بدیہی ہے۔ پس اس خیال کی معقولیت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں اور بہ آسانی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اضافہ شرح سود سے شغل میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے (جیسے استادی معاشیین بھی تسلیم کرتے ہیں) جس سے حقیقی آمدنی کی تمام سطح گھٹ جاتی ہے لہذا شرح سود کے اضافہ سے پس اندازی کی خواہش میں اضافہ ہوگا لیکن حقیقی پس اندازی کی قوت کم ہو جائے گی اور اس طرح طویل مدت میں نہ صرف حقیقی

پس اندازی میں کمی ہوگی بلکہ حقیقی مقدار صرف میں بھی کمی واقع ہو جائے گی۔

مندرجہ بالا خیال کے لحاظ سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شرح سود کی کمی سے پس اندازی میں اضافہ ہوگا لیکن واضح رہے کہ یہ صورت اس وقت ممکن ہے جب کہ لازماً شرح سود کی کمی کے باعث شغل اصل میں بھی اضافہ ہو کینس کے نزدیک ایسا نہیں ہوتا بلکہ شغل کا اضافہ شرح سود کے بجائے زیادہ تر مقدار آمدنی اور آئندہ کی غیر یقینی حالات پر منحصر ہے۔ سکونیاتی حالات میں جب کہ آئندہ کی قیمت اور مقدار پیداوار کے متعلق تیقن ہوتا ہے اس وقت البتہ کم شرح سود شغل اصل کا باعث بن سکتا ہے لیکن حرکیاتی صورت میں جب کہ آئندہ کی قیمت و پیداوار کی غیر یقینی ہوتی ہے اس لئے شرح سود کی کمی کا اثر نہیں پڑتا۔

شرح سود میں ایک خاص حد تک ہی کمی کی جاسکتی ہے، اس کے بعد اگر کمی کردی جائے تو لوگ اس شرح پر آمدنی مشغول کرنے کے لئے دینے کے بجائے نقد شکل میں رکھنا پسند کریں گے پس معلوم ہوا کہ ایک خاص حد سے زیادہ شرح سود میں کمی نہیں کی جاسکتی اور نہ اس کے ذریعہ شغل اصل میں اضافہ کرکے پس اندازی میں اضافہ کیا جاسکتا۔

تاہم یہ ضروری ہے کہ شرح سود کی کمی شغل اصل کے لئے ضروری ہے۔

غرض کینس کے نظریہ سود کے مطالعہ سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسنادی نظریہ کے مقابلے میں اسکی نوعیت مختلف اور حرکیاتی ہے بلکہ یہ بھی کہ معاشی مرفہ الحالی کے نقطۂ نظر سے شرح سود میں کمی کا رجحان زیادہ مفید ہے چنانچہ وہ اپنی کتاب کے خاتمہ میں یہ لکھتا ہے کہ:۔ "موثر مقدار پس اندازی لازماً مقدار شغل کے لحاظ سے مقرر ہوتی ہے اور مقدار شغل میں کم شرح سود سے ترقی ہوتی ہے بشرطیکہ ہم اس کو اس نقطہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش نہ کریں جہاں پر مکمل روزگار کی صورت پیدا ہو جائے پس ہمارے لئے بہترین صورت یہی ہے کہ شرح سود کو اصل کی کارکردگی مختتم کے جدول کے لحاظ سے اس نقطہ تک کم کریں جہاں پر مکمل روزگار کی صورت ہو۔"

ہندوستان کی معاشی ترقی کا پنج سالہ لائحۂ عمل

از

امتیاز حسین خاں۔ بی، کام (آنرز) لندن لیکچرار کامرس جامعہ عثمانیہ

تنظیم ما بعد جنگ کی اصطلاح کا چرچہ آج کل ہر طرف سننے میں آتا ہے جنگ کی پیدا کردہ تکالیف اور مصائب کے دوران میں انسانی دماغ نے دنیا کی بین الاقوامی اور قومی نقطۂ نظر سے نئی تنظیم کے خوش آیند خواب دیکھنا شروع کر دیے ہیں اور تنظیم ما بعد جنگ کے مختلف مسایل کے متعلق اکثر ممالک میں مباحث شروع ہو چکے اور بعض ادارے قایم ہو چکے ہیں۔ یہاں اس بات کا تذکرہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ جیسے صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ ممالک اور ہندوستان جیسے غیر ترقی یافتہ ملک کے مسایل کی نوعیت میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ اور خاص طور پر انگلستان میں جنگ کی تباہ کاریوں کے اثرات کو دور کرنے کے سلسلے میں جنگ کے ختم ہونے پر بہت سے انسانی اور معاشی وسایل کو کام پر لگانا پڑے گا۔ اس کے علاوہ جنگ کے حالات نے ان کی قومی معیشت کی ہئیت بالکل بدل دی ہے اور اس کی تنظیم جنگی اساس پر کی گئی ہے۔ جنگ کے بعد جنگی معیشت کو پھر سے امن کی معیشت میں تبدیل کرنا پڑے گا۔ اور یہ تبدیلی کچھ اس انداز سے ہونی چاہیئے کہ معاشرے میں کامل

روزگار کے حالات قائم رہیں، ان دونوں ملکوں میں معاشی نظام میں جنگ کی بے ترتیبیوں کو دُور کرنے کے لئے موزوں منصوبے تیار کیئے جانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اسکے برخلاف ہندوستان نے اب تک نہ تو براہ راست جنگی تباہ کاریوں کا سامنا کیا ہے اور نہ صحیح معنوں میں اس کی معیشت کی تنظیم جنگی اساس پر کی گئی ہے۔ یہاں قومی معیشت میں جنگ کی وجہ سے جو کچھ تھوڑی بہت بے ترتیبی پیدا ہوگئی ہے، اس کو صرف دُور کر دینا ہی کافی نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہاں کے انسانی اور معاشی وسائل کو پوری طرح سے کام میں لاکر قومی معیشت کو منظم کیا جائے اور عوام کی زندگی زیادہ خوش حال بنائی جائے۔ ہندوستان میں تنظیم جدید کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہاں تو تعمیر نو ہونی چاہیئے۔

اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے آٹھ مشہور صنعتی ماہرین (پرشوتم داس ٹھاکر داس، جے۔ آر ڈی ٹاٹا، جی۔ ڈی برلا، سر اردشیر دلال، سر سری رام، کستور بھائی لال بھائی، اے۔ ڈی شراف اور ڈاکٹر جان متھائی) نے جنگ کے بعد ملک کی معاشی ترقی کا ایک خاکہ پیش کیا ہے[1]۔ اس خاکے کی یادداشت کو تنظیم مابعد جنگ کا عنوان قصداً نہیں دیا گیا ہے بلکہ اسے "معاشی ترقی کا ایک لائحۂ عمل" کہا گیا ہے۔ ہندوستان کے خصوصی حالات میں آخر الذکر اصطلاح زیادہ صحیح اور موزوں معلوم ہوتی ہے۔

اصول غیر مداخلت، آزاد سرمایہ داری اور معاشی انفرادیت کا دور دورہ بہت دن ہوئے ختم ہو چکا۔ ان کی خرابیوں کی وجہ سے معاشی معاملات میں حکومت کی مداخلت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور ہر ملک میں معاشی منصوبہ بندی کی پالیسی کو فروغ ہو رہا ہے۔ آزاد سرمایہ داری میں افراد مختلف قسم کے معاشی تصفیے کرتے ہیں۔ آجر طبقہ منافع کمانے کی امید میں چیزیں تیار کرتا اور خدمات انجام دیتا ہے۔ قیمتوں کے تغیرات کو دیکھ کر یہ طے کیا جاتا ہے کہ مختلف چیزیں کتنی کتنی مقدار میں تیار کی جائیں اور ان کی تیاری میں

---

[1] ہندوستان کی معاشی ترقی کے لئے ایک لائحۂ عمل، مترجمہ سعید احمد مینائی، سلسلہ مطبوعات بزم بہاء نمبر ۱۱۔

مختلف عاملین پیدائش کی کیا مقداریں لگائی جائیں۔ شرح سود (دوسرے کا اصل استعمال کرنے کی قیمت) کی تبدیلیاں یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ موجودہ ضروریات اور آیندہ ضروریات پورا کرنے میں معاشی وسایل کی کیا تقسیم ہونی چاہیئے۔ معاشی منصوبہ بندی کے تحت معاشی معاملات میں نراجیت کا دور ختم ہو جاتا ہے حکومت کی نگرانی میں ایک ایسا مرکزی ادارہ یا محکمہ قایم کیا جاتا ہے جو مختلف قسم کے معاشی فیصلے کرتا ہے، مختلف چیزوں کی کتنی مقداریں تیار کی جائیں۔ کن کن صنعتوں میں معاشی وسایل کی تقسیم کیا ہونی چاہیئے۔ موجودہ ضروریات پورے کرنے پر کتنے عاملین پیدایش لگائے جائیں اور مستقبل میں عوام کی ضروریات پوری کرنے والی اشیا کی تیار کرنے والی مشینوں اور کارخانوں میں کتنا اصل لگایا جائے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاشی منصوبہ بندی میں پیدایش دولت، تقسیم دولت اور صرف دولت میں مرکزیت قایم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے معاشی منصوبہ بندی کی پالیسی کو باقاعدہ طریقے سے روس نے ۱۹۲۸ء میں پہلے منصوبے کا اعلان کر کے اختیار کیا۔ سرمایہ داری اور معاشی انفرادیت کے حامی معاشیین نے اس وقت یہ پیشین گوئی کی تھی کہ اشتراکیت اپنے جدید معاشی پروگرام میں کامیاب نہیں ہو سکے گی اور روس کا معاشی نظام بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ لیکن بعد کے واقعات نے معاشیین کے اس خیال کو غلط ثابت کر دکھایا۔ پچھلے تین سال کے حالات نے روس کے معاشی نظام کی صلاحیتوں اور منصوبی معیشت کی خوبیوں کو اُجاگر کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشی منصوبہ بندی کی طرف دوسرے ممالک میں بھی خاص طور پر توجہ کی جا رہی ہے۔ ہمارے ملک میں بھی کانگریس کی طرف سے ماہرین کی ایک کمیٹی (قومی منصوبہ بندی کی کمیٹی) مقرر کی گئی تھی لیکن اس کمیٹی کا مفید کام موجودہ جنگ کے شروع ہوتے ہی ملک کے سیاسی حالات کی وجہ سے رُک گیا، البتہ ملک میں منصوبی معیشت کے سب سے بڑے حامی مسٹر ویسوریا اپنی ان تھک کوششوں سے منصوبہ بندی کے مسئلے کو وقتاً فوقتاً زیر بحث لاتے رہے۔ انھوں نے اپنے دو کتابچوں کے ذریعہ

ملک کی صنعتی ترقی کا عملی خاکہ پیش کیا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے ابھی تک کوئی خاص قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔ تنظیم مابعد جنگ کے مختلف مسایل کو حل کرنے کے لئے کمیٹیاں ضرور مقرر کی گئی ہیں۔ ان کمیٹیوں کے بہت سے جلسے بھی ہوچکے ہیں۔ تقریریں ہوئیں، لیکن اب تک زرعی اور صنعتی ترقی کا کوئی لائحہ عمل نہیں تیار کیا گیا۔ البتہ تعلیم (سارجنٹ اسکیم) اور ذرائع نقل وحمل کو ترقی دینے کے لئے اسکیمیں تیار کی گئی ہیں اور صحت عامہ کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے۔ اس لئے بغیر کسی قسم کے مبالغہ کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بمبئی کے معاشی لائحہ عمل میں ملک کی معاشی ترقی کے لئے سب سے پہلا ٹھوس اور جامع پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ یہ لائحہ عمل مستقبل میں ہونے والے تمام مباحث کی ابتدا کا کام دے گا۔ اس کی عملی اور نظری اہمیت سے کسی کو کوئی انکار نہیں ہوسکتا۔

منصوبی معیشت کے لئے ایک مرکزی مقصد کا تعین ضروری ہے۔ ماہرین کے لائحہ عمل کا مرکزی مقصد یہ ہے کہ قومی آمدنی میں اس قدر اضافہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ہر شخص زندگی کی لازمی ضروریات کی تکمیل کے بعد زندگی کو پرلطف بناسکے اور مختلف تمدنی سرگرمیوں میں حصہ لے سکے۔ ڈاکٹر راؤ پروفیسر معاشیات جامعہ دہلی نے ۳۲-۱۹۳۱ء میں ہندوستان کی قومی آمدنی معلوم کرنے کی کوشش کی تھی اور مختلف اعداد و شمار کا تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ فی کس آمدنی ۶۵ روپے سالانہ ہوتی ہے۔ باوجود اس کے کہ پیچھے دس گیارہ سال میں اور خاص طور پر موجودہ جنگ کی وجہ سے کہا یہ جاتا ہے کہ ملک میں بہت کافی صنعتی ترقی ہوچکی ہے، پروفیسر موصوف نے ۴۳-۱۹۴۲ء میں ہندوستان کی قومی آمدنی کا جو اندازہ لگایا ہے اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ۳۲-۱۹۳۱ء کے روپے کی قدر میں فی کس آمدنی ۶۹ روپے سالانہ سے زیادہ آمدنی نہیں تھی۔ ہندوستان کی فی کس آمدنی اتنی نہیں کہ عوام اس کے ذریعے سے اقل ترین ضروریات زندگی بھی حاصل کرسکیں۔

اقل ترین معیار زندگی کی ضروریات میں غذا، لباس، مکان، طبی امداد اور تعلیم شامل ہیں۔ ان ماہرین کے اندازے کے مطابق اقل ترین معیار زندگی کے حصول کے لئے جنگ سے پہلے کی قیمتوں کی اساس پر ۷۴ روپے فی کس آمدنی درکار ہوگی۔ اگر ہم صرف اقل ترین معیار زندگی قائم کرنا چاہتے ہیں تب بھی قومی آمدنی میں کافی اضافہ کرنا پڑے گا۔ ہندوستانی عوام کی غربت کو دُور کرنے اور ان کی زندگی کو خوشحال بنانے کے لئے قومی آمدنی میں مزید اضافہ کی ضرورت ہوگی۔ لائحہ عمل کے پیش کرنے والوں کا خیال ہے کہ پندرہ سال کے عرصہ میں اس پر پوری طرح سے عمل پیرا ہوکر مجموعی قومی آمدنی تین گنا بڑھائی جا سکے گی۔ کیونکہ ہرسال ہندوستان کی آبادی میں ۵۰ لاکھ کا اضافہ ہورہا ہے اس لئے پندرہ سال میں مجموعی آمدنی میں تین گنا اضافہ فی کس آمدنی کو صرف دوگنا کرسکے گا، یعنی فی کس آمدنی صرف ۱۳۵ روپے سالانہ ہوسکے گی۔ قومی آمدنی میں یہ اضافہ کچھ بہت زیادہ نہیں ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مجموعی آمدنی میں مجوزہ سہ گنا اضافہ کسطرح سے ہوسکے گا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ زراعت اور صنعت وحرفت میں ایک خاص توازن قائم کرکے یہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ہماری معیشت میں زراعت بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور صنعتی ترقی بہت ہی کم ہوئی ہے اور اس طرح سے ہماری معیشت میں ایک خاص قسم کا عدم توازن پیدا ہوگیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ زیادہ متوازن معیشت قائم کی جائے۔ ۳۲-۱۹۳۱ء میں قومی آمدنی کے اعداد اس کا اظہار کرتے ہیں کہ اس میں صنعت، زراعت اور خدمات کا حصہ علی الترتیب ۱۷، ۵۳، ۲۲ فیصد تھا۔ لائحہ عمل کی مدت ختم ہونے کے بعد یہ تناسب بہت کچھ بدل جائے گا اور اندازہ کیا گیا ہے کہ ۳۵، ۴۰، ۲۰ فیصد ہوجائے گا۔

مجموعی آمدنی میں مجوزہ سہ گنا اضافہ کرنے کے لئے صنعتوں کی آمدنی کو ۵۰۰ فیصد، زرعی آمدنی کو ۱۳۰ فیصد اور خدمات کی آمدنی کو ۲۰۰ فیصد بڑھانے کی سفارش کی گئی ہے۔

لائحہ عمل کے تیار کرنے والوں کا خیال ہے کہ بظاہر صنعتی آمدنی میں زرعی آمدنی کے مقابلہ میں بہت زیادہ اضافہ معلوم ہوتا ہے، لیکن ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان کے ذرائع صنعتی ترقی کے سلسلہ میں اب تک بہت کم استعمال کیے گئے ہیں۔ ان کو پوری طرح سے استعمال کر کے صنعتوں سے بہت کافی آمدنی بڑھائی جا سکتی ہے۔ مجوزہ صنعتی ترقی کے باوجود ہندوستانی آبادی کی اکثریت زراعت پیشہ رہے گی۔ البتہ زمین پر آبادی کا جو غیر معمولی دباؤ اس وقت پایا جاتا ہے اس میں بڑی حد تک کمی ہو جائے گی اور متوازن معیشت کا قیام عمل میں آسکے گا۔

لائحہ عمل میں ہندوستانی زراعت کو نئے سرے سے تنظیم دینے اور اس کی بہت کچھ نہج بدلنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ زرعی پیداوار میں اضافہ کے لئے بعض اہم اور بنیادی اصلاحات بہت ضروری ہیں۔ انتشار اراضی اور تقسیم اراضی کی خامی کو جلد سے جلد دُور کرنا چاہیئے۔ زرعی مقروضیت کے بار کو کم کرنا بہت ضروری ہے۔ زمین کے کٹاؤ کا مسئلہ بھی بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس اہم مسئلہ کی طرف ابھی تک کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی ہے۔ ان اہم اصلاحات کے علاوہ آبپاشی کے ذرائع کو ترقی اور زیر کاشت رقبہ میں اضافہ کے ذریعہ سے بھی زرعی پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے۔ کاشت عمیق کے مختلف طریقے، بہتر بیج اور اچھی کھاد استعمال کر کے بھی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ نمونے کے مزرعے اور مشترکہ کاشت کو ترقی دینے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

لائحہ عمل میں صنعتی ترقی کے سلسلہ میں صنعتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، کلیدی صنعتیں اور اشیائے صرف کی صنعتیں۔ کلیدی صنعتوں کو جلد سے جلد ترقی دینی چاہیئے، کیونکہ ملک کی صنعتی ترقی کا انحصار ان صنعتوں کی موجودگی پر ہے۔ اگر ملک میں کلیدی صنعتیں موجود نہ ہوں تو عوام کی ضروریات پوری کرنے والی اشیاء تیار نہیں کی جا سکتیں۔ کلیدی صنعتوں کے ساتھ ساتھ اشیاء صرف کی صنعتوں کو بھی ترقی دینے کی سفارش کی گئی ہے۔ لائحہ عمل میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں کو بھی ترقی دینے کا مشورہ پیش

کیا گیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ایسا کرنے سے ایک طرف روزگار کے مسئلہ کو حل کرنے میں مدد ملے گی اور دوسری طرف اس کے باعث لائحہ عمل کے ابتدائی مدارج میں اصل خاص طور پر بیرونی اصل کی کم ضرورت پڑے گی۔

زرعی اور صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ ضروری ہے کہ ذرائع نقل وحمل کو بھی ترقی دی جائے۔ لائحہ عمل میں اس مسئلہ کی طرف بطور خاص توجہ کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ریلوں میں اکیس ہزار اور سڑکوں میں تین لاکھ میل کے اضافہ کی کوشش کرنی چاہیئے۔ سڑکوں کو ترقی دینا کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ تمام دیہات تجارتی شاہراہوں سے منسلک کر دئے جائیں۔ ساحلی جہاز رانی کو کامیاب بنانے کے لئے چھوٹی چھوٹی بندرگاہوں کی اصلاح اور ترقی پر بہت کافی روپیہ صرف کرنا چاہیئے۔ ہندوستانی عوام کی ذہنی اور جسمانی ترقی کے لئے مکانات کی تعمیر، صحت عامہ اور تعلیم کے متعلق بھی خاکہ میں بہت سی اہم سفارشات بیان کی گئی ہیں۔

لائحہ عمل کے مندرجۂ بالا اجزاء کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے پندرہ سال میں علٰحدہ علٰحدہ مصارف اور مجموعی مصارف کا اندازہ مندرجۂ ذیل اعداد کے ذریعہ سے کیا گیا ہے :-

صنعت	۴۴۸۰ کروڑ روپے
زراعت	۱۲۴۰ "
ذرائع نقل وحمل	۹۴۰ "
تعلیم	۴۹۰ "
صحت عامہ	۴۵۰ "
مکانات	۲۲۰۰ "
متفرقات	۲۰۰ "
کل مصارف	۱۰۰۰۰ کروڑ روپے

مندرجہ بالا اعداد کو دیکھنے سے لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ اکھرب روپے لائحہ عمل کو کامیاب بنانے کے لئے کہاں سے حاصل کیے جاسکیں گے۔ کہیں ایسا تو نہوگا کہ محض مالی مشکلات کی وجہ سے منصوبہ پر عمل نہ کیا جاسکے۔ لائحہ عمل کے تیار کرنے والے اس کے مالی پہلو کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مالی مسایل کو حل کرنے کے سلسلہ میں جنگ نے دنیا کو بہت کچھ سکھلایا ہے۔ قومیں جنگوں پر اربوں روپیہ صرف کرتی ہیں لیکن آج تک کسی قوم نے امن کی بُرائیوں مثلاً افلاس، تعلیم کا فقدان، بیروزگاری اور امراض کے ازالہ پر اس پیمانہ پر روپیہ صرف نہیں کیا۔ زر اور مالیہ کسی ملک کی قومی معیشت کا آقا نہیں بلکہ ملازم یا آلۂ کار ہے۔ اس حقیقت کو روس اور جرمنی کی معیشت میں تجربہ کرکے اور بھی واضح کردیا ہے۔

یادداشت کے چوتھے باب میں۔ اکھرب روپے حاصل کرنے کے مختلف ذرائع سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ذرائع آمدنی کو اندرونی اور بیرونی ذرائع دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ذریعہ سے اصل کی مقدار حاصل کرنے کے سلسلہ میں حسب ذیل اعداد پیش کیے گئے ہیں :۔

۱۔ بیرونی ذرائع آمدنی :۔

اندوختہ دولت	۳۰۰ کروڑ روپے
اسٹرلنگ تمسکات	۱۰۰۰ ”
توازن تجارت	۶۰۰ ”
بیرونی قرضے	۷۰۰ ”
میزان	۲۶۰۰ کروڑ روپے

۲۔ اندرونی ذرائع آمدنی :

بچتیں	۴۰۰۰ کروڑ روپے

تخلیق شدہ زر ۳۴۰۰ کروڑ روپے

میزان ۴۰۰۰ ،، ،،

مجموعی مالی ذرائع ۱+۲ = ۱۰۰۰۰ کروڑ روپے

خاکے کے آخر میں اس کے تیار کرنے والوں نے اس کا بھی خیال رکھا ہے کہ لائحہ عمل کو تین منصوبوں میں تقسیم کیا جائے۔ ہر منصوبہ کو مکمل کرنے کے لئے ۵ سال کی مدت مقرر کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں روس کے تجربہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ مجوزہ خاکہ میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ کلیدی صنعتوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اشیاء صرف کی صنعتوں کو ترقی دینے اور ان کی پیداوار کو بڑھانے کی طرف بھی خاص طور پر توجہ کی جائے۔ ایسا کرنے سے لائحہ عمل کے شروع کے دور میں ملک کی معیشت پر ضرورت سے زیادہ بار نہیں پڑے گا۔ پہلے منصوبہ پر ۱۴۰۰ کروڑ روپے، دوسرے پر ۲۹۰۰ کروڑ اور تیسرے پر ۵۷۰۰ کروڑ روپے کے صرفہ کی سفارش کی گئی ہے۔ اس طرح شغل اصل میں سلسلہ بہ سلسلہ کے لحاظ سے اضافہ کی سفارش کی گئی ہے۔

آخر میں ان چند مفروضات کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جن کو پیش نظر رکھ کر خاکہ تیار کیا گیا ہے۔ بعض اعتراضات ان مفروضات پر کئے گئے ہیں اس لئے ان کا تذکرہ اور بھی ضروری ہے۔ سب سے اہم مفروضہ یہ ہے کہ جنگ کے اختتام پر یا اس کے کچھ عرصہ بعد مرکز میں قومی حکومت کا قیام عمل میں آئے گا جسے معاشی معاملات میں کامل اختیار حاصل ہوگا۔ ماہرین نے ملک کے معاشی اتحاد پر بھی بہت زیادہ زور دیا ہے اور یہ فرض کیا ہے کہ ہندوستان کی آئندہ حکومت وفاقی اساس پر تشکیل پائے گی۔ معاشی معاملات میں مرکزی حکومت کا حلقۂ اختیار سارے ہندوستان پر وسیع ہوگا۔ مرکزی حکومت کے تحت قومی تنظیم کی ایک ایسی کمیٹی کا قیام عمل میں آئے گا جس میں متعلقہ مفادات کی نمایندگی ہوگی، اور جس کے تفویض لائحہ عمل کی ترتیب کے فرائض ہوں گے۔ یہ ضروری ہے کہ یہ کمیٹی حکومت کی تبدیلیوں اور سیاسی جماعتوں کے

اثرات سے آزاد ہو تب ہی وہ اپنا فرض اچھی طرح سے انجام دے سکے گی۔

(۲)

جب سے معاشی ترقی کا لایحہ عمل شایع ہوا ہے۔ اس کے متعلق بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ ملک کے طول و عرض میں اس سے بہت کافی دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مختلف مکاتیب خیال کے افراد نے اس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ان مباحث کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ لارڈ ویول وائسرائے ہند نے مرکزی مقننہ کے مشترکہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے اپنی تقریر میں اس کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ جن مقاصد کے حصول کے لئے یہ لایحہ عمل تیار کیا گیا ہے ان سے ان کی حکومت کو اصولاً پورا اتفاق ہے اور ان کی حکومت بھی اسی قسم کے لایحہ عمل کی تیاری میں مصروف ہے صرف اختلاف ذرائع کے اختیار کرنے میں ہو سکتا ہے۔ ملک کی دوسری سیاسی جماعتیں بھی اسی قسم کا کام انجام دینے میں مصروف ہیں۔ مزدوروں کی جماعت کی طرف سے ایک منصوبہ تیار ہو کر ملک کے سامنے پیش کیا جا چکا ہے۔ مسلم لیگ پاکستان کی معاشی ترقی کے سلسلہ میں غور و خوض کر رہی ہے۔ بمبئی کے لایحہ عمل پر ملک کے مختلف معاشیین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار مضامین، تقریروں اور بیانات کے ذریعہ سے کیا ہے اور ان ماہرین کی طرف سے بعض بہت ہی مفید مشورے پیش کئے گئے ہیں۔ معاشیین نے چند اعتراضات بھی کئے ہیں لیکن ایسا کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ لایحہ عمل کو ملک کے لئے زیادہ بہتر اور کارآمد بنایا جا سکے۔

جس مقصد کے حاصل کرنے کی غرض سے لایحہ عمل تیار کیا گیا ہے اس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں معاشی اور انسانی وسایل کی کمی نہیں اس کے باوجود اس کی غربت کا چرچا چہار دانگ عالم میں مشہور ہے اس زرخیز ملک کی اکثریت کو پیٹ بھر کر نہ تو کھانا ملتا ہے اور نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا میسر ہوتا ہے۔ رہنے کو مکان نہیں۔ صحت خراب اور تعلیم کا فقدان ہے۔ ہندوستانی عوام کا معیار زندگی دوسرے ممالک کے

مقابلہ میں بہت ہی پست ہے۔ انگلستان کا رہنے والا ایک معمولی شخص سالانہ جتنی رقم سگریٹ پر صرف کرتا ہے اس کے برابر ہندوستانی کی فی کس آمدنی ہوتی ہے۔ اس قلیل آمدنی میں بھلا کس طرح سے زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔ ان حالات میں کون شخص اس حقیقت سے انکار کرسکتا ہے کہ معاشی منصوبہ بندی کا اولین مقصد ہندوستانی عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنا ہونا چاہیئے۔ لائحہ عمل میں معیار زندگی کو جس سطح تک لانے کی سفارش کی گئی ہے وہ اقل ترین معیار ہوسکتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ اس اقل ترین معیار زندگی کی ضمانت کردی جائے اور ہر شخص کو یہ یقین دلایا جائے کہ اس کا مطالبہ کرنا اس کا قانونی حق ہے اور معاشرہ اور حکومت کا یہ فرض کہ عوام کا یہ مطالبہ پورا کیا جائے۔ اس قسم کی ضمانت کے ذریعہ سے لائحہ عمل کی ایک اہم خامی کو بھی دور کیا جاسکتا ہے اور یہ اہم خامی یہ ہے کہ اس میں صرف پیدائش دولت کو اہمیت دی گئی ہے اور صرف دولت کو نظر انداز کردیا گیا ہے۔ منصوبہ میں پیدائش دولت میں جس قدر اضافہ کی سفارش کی گئی ہے اس سے کہیں زیادہ اضافہ کی ضرورت لاحق ہوگی اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ معاشرہ کے بعض افراد کو اقل ترین معیار سے زیادہ دولت حاصل کرنیکی اجازت دیجائیگی

لائحہ عمل کے خلاف جو کچھ اعتراضات کئے گئے ہیں ان میں سے چند کی نوعیت سیاسی ہے اس لئے ان کا پہلے تذکرہ کردینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ فرض کیا گیا ہے کہ جنگ کے فوراً بعد مرکز میں قومی حکومت کا قیام عمل میں آئے گا جسے معاشی معاملات میں کامل اختیار حاصل ہوگا۔ ملک کے موجودہ سیاسی حالات کو دیکھنے کے بعد یہ مفروضہ زیادہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ حکومت برطانیہ اور حکومت ہند ملک کے سیاسی تعطل کو ختم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کے قائدین جیلوں میں بند پڑے ہیں۔ ان حالات میں ماہرین کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ ملک کی معاشی ترقی کے لئے لائحہ عمل پیش کریں۔ یہ اعتراض کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس میں کہاں کی دانشمندی ہے کہ بعض معاشی مسایل کو محض سیاسی حالات کی وجہ سے ملتوی کردیا جائے۔ اس وقت اگر مباحث کے ذریعہ سے بعض مسایل طے ہوجائیں اور تعمیری مدارج طے پاجائیں تو بعد میں کام شروع کردینے میں زیادہ وقت

صرف نہیں کرنا پڑے گا اور منزل مقصود کا راستہ جلد طے ہو جائے گا معاشی مسایل کا تصفیہ چند ہفتوں یا مہینوں میں نہیں ہوتا۔ ان پر غور و خوص کرنے میں بہت کافی وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے لائحہ عمل کے سلسلہ میں مباحث ابھی شروع ہو جانے چاہئیں۔

لائحہ عمل کے تیار کرنے والوں نے یہ بھی فرض کیا ہے کہ ہندوستان معاشی اور سیاسی حیثیت سے ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے، خاص طور پر ملک کے معاشی اتحاد پر بہت کافی زور دیا گیا ہے۔ مرکز میں ایک ایسی وفاقی حکومت کے قیام کی سفارش کی گئی ہے جس کا معاشی معاملات میں اقتدار سارے ہندوستان تک وسیع ہوگا۔ یہاں خاص طور پر ان جماعتوں اور افراد کی طرف سے اعتراض ہو سکتا ہے جو ملک کی معاشی اور سیاسی وحدت سے انکار کرتے ہیں اور ہندوستان کی سیاسی نجات دو یا دو سے زیادہ آزاد مملکتیں قائم کرنے میں تصور کرتے ہیں۔ اس اعتراض کو لندن کے مشہور اخبار ٹائمز کے نامہ نگار نے بھی اچھالنے کی خوب کوشش کی ہے تاکہ نہ صرف سیاسی بلکہ معاشی اختلافات کو بھی ابھارا جاسکے۔ قطع نظر اس اختلاف کے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کی معاشی ترقی کا جو رجحان اس وقت پایا جاتا ہے وہ کسی طرح سے بھی ملک کے لئے مفید نہیں ہے۔ تاریخی واقعات اور بعض دوسرے اسباب ایسے موجود تھے جن کی وجہ سے صنعتی ترقی بعض خاص خاص شہروں اور صوبوں میں مرکوز ہو گئی ہے۔ بمبئی اور بنگال دو ایسے صوبے ہیں جو صنعتی حیثیت سے دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں بہت آگے ہیں۔ ملک کی اہم صنعتیں انھیں دو صوبوں میں قائم ہیں۔ ان صوبوں کے بعد مدراس، یو۔پی اور بہار کا نمبر آتا ہے۔ ان کے علاوہ باقی تمام صوبوں کی حیثیت بالکل زرعی ہے۔ اور اگر ان کے یہاں بعض صنعتیں قائم ہیں تو وہ چھوٹے پیمانہ کی اور گھریلو صنعتیں ہیں۔ ملک کی معاشی ترقی کے اس رجحان کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ دولت کی علاقہ واری تقسیم میں عدم مساوات پیدا ہو چکی ہے۔ ملک کی دولت سمٹ کر چند شہروں اور معاشرہ کے خاص خاص طبقات میں جمع ہو گئی ہے۔ شہروں میں صنعتوں کی مرکزیت نے بہت سی معاشرتی خرابیاں پیدا کر دی ہیں۔ غرض سرمایہ داری

اپنی تمام معاشی اور معاشرتی خرابیوں کے ساتھ ملک میں ترقی کر رہی ہے ۔ زرعی علاقوں اور دوسرے ایسے طبقات اور افراد (جو سرمایہ داری کے فوائد سے مستفید نہیں ہو رہے ہیں) کو شکایت کا موقعہ پیدا ہوتا ہے ۔ اگر ملک کے اس معاشی رجحان کو نہ روکا گیا تو حالات اور بھی زیادہ ابتر ہو جائیں گے ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تعمیر صنائع کے رجحان کو ایسی منصوبہ بندی کے ذریعہ سے روکا جائے جو ملک کے ہر علاقے کے لئے مفید ثابت ہو سکے اور کسی ایک علاقہ یا طبقہ کو شکایت کا موقعہ نہ ملے ۔ ایک ایسا مرکزی ادارہ اور ہر صوبے اور ریاست میں ایسے مقامی ادارے قائم ہونا چاہئیں جو مقامی اور خصوصی حالات کا جائزہ لیں اور معاشی ، معدنی اور انسانی ذرائع کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ تصفیہ کریں کہ ہر صوبہ اور ریاست میں کس قسم کی صنعتیں قائم کی جا سکتی ہیں ۔ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہر صوبے اور بڑی ریاست میں کم سے کم دو کلیدی صنعتیں قائم کی جائیں ۔ اس طرح سے صنعتی ترقی کے فوائد کو تمام ملک میں پھیلایا جا سکتا ہے اور بغیر کسی قسم کی دقت کے ملک کے مختلف علاقوں میں کم از کم دو کلیدی صنعتیں قائم کی جا سکتی ہیں ۔ مزید برآں یہ بھی کوشش ہونی چاہیئے کہ بعض صنعتیں شہروں کے بجائے دیہاتوں میں قائم کی جائیں ۔ برقی قوت کو ترقی دینے کی وجہ سے ایسا کرنے میں بڑی آسانی پیدا ہو جاتی ہے ۔ جب تک صرف کوئلہ کے ذریعہ قوت محرکہ پیدا کی جاتی تھی صنعتوں میں مرکزیت کا رجحان پایا جاتا تھا ، اب جبکہ برقی قوت زیادہ استعمال ہونے لگی ہے صنعتوں میں لا مرکزیت پیدا کی جا سکتی ہے اور اکثر ممالک میں ایسا ہی ہو رہا ہے ۔ ہر صوبہ اور ریاست میں کلیدی صنعتوں اور دیہاتوں میں صنعتیں قائم کرنے سے ملک کے موجودہ معاشی رجحان کو درست کیا جا سکتا ہے ، اور صنعت بندی کی وجہ سے جو معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو روکا جا سکتا ہے ۔ ملک کی صنعتی ترقی کے لئے لائحہ عمل تیار کرتے وقت ان دونوں باتوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ انھیں کے مطابق مستقبل میں عمل ہوگا ۔

معاشی لائحہ عمل کے خلاف یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں زراعت کو نظر انداز کر کے

صنعتوں کو غیر معمولی طور پر ترقی دینے کی سفارش کی گئی ہے ، اور ہندوستان کی معاشی نجات صنعت بندی میں تصور کی گئی ہے ۔ سرمایہ داروں کے مفاد کی خاطر زراعت پیشہ لوگوں کے مفادات قربان کر دئے گئے ہیں ۔ اس خیال کا اظہار ہندوستان کے بعض معاشیین کی طرف سے کیا گیا ہے اور حکومت کی طرف سے بھی اس خیال کی حمایت کی جارہی ہے لیکن سب سے زیادہ اہمیت اس اعتراض کو لندن کے مشہور ہفتہ وار اخبار اکانمسٹ Economist نے دی ہے منصوبہ پر تنقید کرتے ہوئے اس اخبار نے اپنی رائے کا اظہار اس طرح سے کیا ہے کہ ہندوستانی آبادی کی اکثریت کا پیشہ زراعت ہے اور یہی ایسا پیشہ ہے جسے جنگ کی وجہ سے نقصان پہنچا ہے اس کے مقابلہ میں صنعتوں نے جنگ کے دوران میں بہت کافی ترقی کی ہے ۔ لائحہ عمل میں صنعتوں کو ہی ضرورت سے زیادہ ترقی دینے کی سفارش کی گئی ہے ۔ حالانکہ جنگ کے بعد زراعت ، ذرائع نقل وحمل اور رفاہ عامہ کے کاموں پر بہت کافی روپیہ صرف کرنا پڑے گا ۔ انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں صنعتوں کو ترقی دینے کے خلاف جو دلیل دی جاتی تھی اب اس کو پھر دہرایا گیا ہے اسنادی معاشیین کے بیان کردہ آزاد تجارت اور نظریۂ تجارت خارجہ کے اصول کی مدد لیکر یہ کہا جاتا تھا کہ مختلف ممالک کو تقسیم عمل اور تخصیص کار سے کام لینا چاہیئے اور ایسی چیزیں پیدا اور تیار کرنی چاہئیں جن کے پیدا اور تیار کرنے میں انھیں فوقیت حاصل ہو ۔ ہندوستان کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اسے زرعی اجناس کے پیدا کرنے میں زیادہ فوقیت حاصل ہے اس لئے ہندوستان کو زرعی ترقی کی طرف خاص طور پر متوجہ ہونا چاہیئے ۔ انیسویں صدی میں بعض دوسرے ممالک مثلاً امریکہ اور جرمنی کو بھی انگلستان والوں کی طرف سے اسی قسم کا مشورہ دیا گیا تھا ، لیکن ان دونوں ملکوں نے اس مشورہ پر عمل نہیں کیا اور اپنی صنعتوں کو تامین کی پالیسی اختیار کر کے ترقی دی ۔ اس وقت لائحہ عمل کے خلاف اس قسم کا جو پروپگنڈا کیا جارہا ہے اس کا زیادہ خیال نہ کرنا چاہیئے ۔

بعض ہندوستانی معاشیین کی طرف سے بھی یہ اعتراض ہوا ہے کہ منصوبہ میں صنعتوں کی ترقی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے ، دس ہزار کروڑ روپیوں کا تقریباً ۴۵ فیصد

صنعتوں کو ترقی دینے پر صرف کیا جائے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ صنعتوں کی ترقی دوسرے تمام شعبہ جات کی ترقی کے تقریباً برابر قرار دی گئی ہے مختلف شعبہ جات کی آمدنی میں اضافہ کے سلسلہ میں صنعتوں کی آمد کو ۵۰۰ فیصد اور زراعت کی آمدنی کو صرف ۱۳۰ فیصد بڑھانے کی سفارش کی گئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ زرعی ترقی صرف اس حد تک ہونی چاہیئے کہ ہندوستان اپنی آبادی کے لئے غذا مہیا کرسکے اور اپنی صنعتوں کے لئے ضروری خام اشیاء پیدا کرسکے۔ اسے بیرونی بازاروں میں اپنے مال کی کھپت کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ ماہرین کے اس خیال سے اکثر کو اتفاق نہیں ہوسکتا۔ کئی سال تک صنعتی ترقی کی غرض سے بہت سا مال برآمد کرنا پڑے گا اور برآمد شدہ اشیاء کی اکثریت زرعی اجناس اور خام اشیاء پر مشتمل ہوگی۔ اشیاء پیدائش (مشین وغیرہ) کی خاصی مقداریں باہر سے منگانی پڑیں گی اور ان کی ادائی اپنی چیزوں کے ذریعہ سے کی جاسکے گی۔ اس سلسلہ میں جوٹ اور چائے جیسی چیزوں کو برآمد کرکے بڑی مدد لی جاسکتی ہے، اور ان کی پیداوار کو بڑھانا صنعتی ترقی کے لئے بہت ضروری ہوگا۔ اس کے علاوہ خود صنعتی ترقی کے لئے یہ بھی بہت ضروری ہے کہ زرعی پیشہ لوگوں کی قوت خرید میں اضافہ کیا جائے تاکہ وہ مصنوعات کی زیادہ سے زیادہ مقداریں خریدنے کے قابل ہوسکیں۔ مصنوعات کی پیداوار میں پانچ گنا اضافہ سے کیا فائدہ اگر لوگ ان کو خرید نہ سکیں۔ اس لئے زرعی آمدنی کو ۱۳۰ فیصد سے بھی زیادہ بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیئے، اور دیہی زندگی میں بھی منصوبہ بندی کو اتنی ہی اہمیت ہونی چاہیئے جتنی کہ صنعتی زندگی میں۔ لائحہ عمل میں زرعی ترقی کا جو پروگرام پیش کیا گیا ہے وہ کافی نہیں ہے۔ نظام مالگزاری اور زمینداری میں اصلاحات کے سلسلہ میں بھی لائحہ عمل میں کچھ نہیں کہا گیا ہے۔ جب تک زراعت میں غرض داریاں Vested Interests قائم رہیں گی کسی قسم کی ترقی ناممکن ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسا زرعی منصوبہ تیار کیا جائے جو دیہات کی اکثریت کے لئے مفید ہو۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستانی آبادی کی اکثریت کا انحصار

زراعت پر ہے اور پچھلے پچاس ساٹھ سال کے عرصہ میں ہر مردم شماری میں زرعی آبادی کا فیصد بڑھ رہا ہے۔ اس کے اسباب گھریلو صنعتوں کی تباہی اور دوسرے وجوہ تھے ۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں زراعت پر صرف ۶۱ فیصد آبادی کا انحصار تھا۔ اب ۷۵ فیصد آبادی زراعت سے روزی حاصل کرتی ہے۔ زمین پر آبادی کا دباؤ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سب کو زراعت میں ہمہ وقتی روزگار حاصل نہیں ہوتا اور گاؤں میں رہنے والوں کا بہت کافی وقت بیکاری میں گذرتا ہے۔ اس طرح سے قومی معیشت میں ایک خاص قسم کا عدم توازن قائم ہوگیا ہے۔ لائحہ عمل کے پیش کرنے والوں کے اس خیال سے سب کو اتفاق ہے کہ قومی معیشت میں زراعت اور صنعت میں ایک خاص توازن قائم ہونا چاہیئے اور زراعت کی موجودہ غیر معمولی اہمیت میں خاصی کمی ہونی چاہیئے۔ دوسرے صنعتی ممالک کا یہ تجربہ ہے کہ جیسے جیسے زرعی آبادی کے فیصد میں کمی ہوتی ہے اور لوگوں کو صنعتوں میں روزگار ملتا ہے اور مختلف قسم کی خدمات انجام دینی پڑتی ہیں، ملک کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ، فرانس اور جرمنی نے خوشحالی اسی وقت حاصل کی جبکہ انھوں نے اپنی زرعی آبادی کو کم کرکے صنعتوں میں مشغول کیا۔ ۱۸۵۰ء میں جاپان میں آبادی کے ۸۵ فیصد کا تعلق زراعت سے تھا۔ ۱۹۳۰ء میں یہی تناسب کم ہوکر صرف ۵۰ فیصد رہ گیا تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ دولت میں بھی اضافہ ہوا۔ اگر ہم بھی اپنے ملک میں خوشحالی پیدا کرنی چاہتے ہیں تو ہمیں ان ممالک سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ صنعتوں کو بہت کافی ترقی دینے کے باوجود جیسا کہ لائحہ عمل میں کہا گیا ہے، ہندوستان کی آبادی کی اکثریت زرعی پیشہ رہے گی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر اس لائحہ عمل کو اختیار کرلیا جائے تو بیس سال کا عرصہ گذرنے کے بعد بھی زرعی آبادی کا تناسب ۵۵ فیصد سے زیادہ رہے گا۔

ملک میں صنعتوں اور مغربی قسم کی سرمایہ داری کو ترقی دینے سے ایک اور طبقہ کو بھی سخت اختلاف ہوسکتا ہے۔ یہ طبقہ ایسا ہے جسے ہندوستانی سیاست میں

بہت کافی اہمیت حاصل ہے۔ وہ لوگ جو چرخہ اور کھدر کے حامی ہیں لائحہ عمل کی سفارشات کو قبول کرنے کے لئے کبھی بھی تیار نہیں ہوں گے۔ یہ لوگ اصولاً سرمایہ داری کو ملک میں ترقی دینے کے مخالف ہیں۔ ان کے خیال میں مغربی سرمایہ داری بدیسی چیز ہے۔ اس کی ترقی کے ساتھ ساتھ بہت سی معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مغربی ممالک کو ان خرابیوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے، اس لئے جہاں تک ہوسکے ہمیں اس نظام سے بچنا چاہیئے، اور ملک میں دیہی خود مکتفی معیشت کو جس میں زراعت اور گھریلو صنعتوں کو خاص جگہ حاصل ہو ترقی دینا چاہیئے۔ یقین کے ساتھ ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان لوگوں کا لائحہ عمل کے متعلق کیا رویہ ہوگا، کیونکہ ان کی اکثریت اسوقت جیلوں میں قید ہے۔ بعض لوگوں کی طرف سے گھریلو صنعتوں کے سلسلہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کو اس حد تک اہمیت دی گئی ہے کہ لائحہ عمل کے شروع کے سالوں میں بہت سے لوگوں کو روزگار ملے گا اور بیرونی اصل کی محتاجی میں کمی واقع ہوگی تاکہ بڑے بڑے کارخانے قائم کرنے میں مدد ملے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کی پالیسی کو مستقل طور پر اختیار کرنے کے لئے نہیں کہا گیا ہے۔ گھریلو صنعتوں کو قائم رکھنے کا مقصد بظاہر صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو سرمایہ داری کی ترقی میں ایک ذریعہ بنایا جائے۔ اگر واقعی یہ مقصد ہے تو بہت سے لوگ اس سے اختلاف کریں گے۔ ہمارے ملک میں گھریلو صنعتیں ہر حیثیت سے بہت کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے ذریعہ سے بہت سے معاشی مسایل کو حل کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ ان کو منظم کرنے کا ایک باقاعدہ پروگرام تیار کیا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ سب گھریلو صنعتوں کو قائم رکھنے کی کوشش کی جائے، جن میں سکت باقی ہو انھیں کو برقرار رکھا جائے۔ بہت سی ایسی صنعتیں ہیں جن کو اگر مواقع فراہم کئے جائیں اور ان کی دقتیں دور کردی جائیں تو مشینوں کی بنی ہوئی چیزوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ غرض گھریلو صنعتوں کو ہندوستانی معیشت میں برقرار رکھنے کی مستقل تجاویز ہونی چاہئیں اور جس منصوبہ میں

اس قسم کی تجاویز پیش نہ کی گئی ہوں وہ لائحہ عمل بہت سے لوگوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ اس سلسلہ میں جاپان سے سبق حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس نے بھاری صنعتوں کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ چھوٹے پیمانہ اور گھریلو صنعتوں کو بھی اپنی معیشت میں ایک خاص جگہ دی ہے اور ان کو ملک اور قوم کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کے لئے مختلف طریقوں سے منظم کیا ہے۔

لائحہ عمل کے خلاف یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں صرف پیدائش دولت میں اضافہ سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس سے ہر شخص اتفاق کرتا ہے کہ پیدائش دولت میں بغیر اضافہ کے ہندوستانی عوام کی حالت کو بہتر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن صرف پیدائش دولت میں اضافہ مقصد کے حصول کے لئے کافی نہیں ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ دولت کی تقسیم میں مساوات پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ میں لائحہ عمل کے تیار کرنے والے بالکل خاموش ہیں، اس کے علاوہ انھوں نے معاشی نظام پر حکومتی تسلط کے متعلق بھی اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں یہ شکوک پیدا ہوچلے ہیں کہ کہیں وہ آزاد سرمایہ داری کو ترقی دینے کی کوشش میں تو نہیں ہیں۔ اسی لئے بعض لوگوں نے اس لائحہ عمل کو "سرمایہ داروں کے منصوبہ" کا خطاب دیا ہے۔ یہ مسئلہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ سرمایہ داری کی تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اس کی ترقی کے ساتھ ساتھ ملک میں بہت سی سیاسی اور معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ آزاد سرمایہ داری میں امیر کی دولت بڑھتی جاتی ہے اور غریبوں کی غربت کی شدت میں اضافہ ہوتا ہے۔ سرمایہ دار طبقہ مزدوروں کا معاشی استحصال کرتا ہے صنعتی شہروں میں مزدوروں کے تاریک اور گندے محلے قائم ہوجاتے ہیں جن میں بہت سی معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مزدور طبقہ کو بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور فاقوں تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ بڑے بڑے اجارے قائم ہوجاتے ہیں اور یہ اپنا معاشی اور سیاسی اقتدار قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی سرمایہ داری کی یہ خرابیاں پیدا ہوچکی ہیں۔

مزدوروں کو کم اجرت دی جاتی ہے اور زیادہ گھنٹے کام لیا جاتا ہے، اور اسی قسم کی بعض دوسری خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ قومی معیشت کے مختلف شعبہ جات میں غرضداریاں پیدا ہوچکی ہیں جس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ تقریباً تیس ۳۰ انتظامی ایجنسیوں نے بنک کاری، صنعت، ذرائع نقل وحمل پر اپنا اقتدار قائم کرلیا ہے، اگر حکومت کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت نہ کی گئی تو ان کا اقتدار برابر بڑھتا جائے گا اور ملک کی آبادی کی اکثریت کے لئے خطرناک نتائج پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔ اس لئے کوئی ایسا شخص جو ملک کی اکثریت کی بہبودی اور فلاح چاہتا ہے، آزاد سرمایہ داری کو ترقی دینے کی حمایت کبھی بھی نہیں کرسکتا۔ معاشی منصوبہ بندی کو اشتراکیت کے تحت بڑی آسانی سے اختیار کیا جاسکتا ہے، لیکن اشتراکیت میں بھی بعض خامیاں پائی جاتی ہیں، پیدائش دولت، صرف دولت اور تقسیم دولت میں حکومتی تسلط قائم ہونے کی وجہ سے لوگوں کی معاشی آزادی چھین لی جاتی ہے اور آمریت قائم کی جاتی ہے۔ صارفین کو اشیاء کے انتخاب کا نہ موقعہ ملتا ہے اور نہ پیشہ اور نہ اپنے سرمایہ سے کام لینے کا۔ میرے خیال میں عوام کی غربت کو دُور کرنے کے لئے اتنی قربانی کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ لیکن اگر ملک کی اکثریت اس کے لئے تیار نہیں ہے تو پھر سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان کوئی معاشی نظام تلاش کرنا پڑے گا۔ یہ معاشی نظام ایسا ہونا چاہیئے جس میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کی بُرائیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس معاشی نظام میں اس طرح سے معاشی منصوبہ بندی کی جائے کہ جمہوری آزادی بھی برقرار رہے اور منصوبہ بندی کا مقصد بھی حاصل ہوسکے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ حکومت پر عوام کے نمائندوں کا اقتدار ہو۔ حکومت بہت سے کام خود انجام دے اور بعض خاص معاشی معاملات ذاتی اہتمام کے تحت انجام پائیں۔ بہت سے ممالک میں سرمایہ داری کے تحت حکومتی اہتمام کا دائرۂ اثر بہت زیادہ بڑھتا جارہا ہے اور اس رجحان کو اچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس بات کی اور بھی سخت ضرورت ہے۔ ذاتی اہتمام بہت سی کلیدی، بنیادی اور دفاعی صنعتیں قائم

کرنے میں اب تک ناکام رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ صنعتی ترقی اور ملک کی دفاع کے لئے ان صنعتوں کا فروغ پانا ایک لازمی امر ہے۔ قومی اہمیت اور اس کی وجہ سے بھی کہ کہیں نئی غرض داریاں پیدا نہ ہو جائیں یہ ضروری ہے کہ یہ تمام صنعتیں حکومت کی ملکیت ہوں اور حکومتی اہتمام کے تحت قائم کی جائیں۔ اسی طرح سے ایسی تمام صنعتوں کو جن میں اجارہ قائم ہونے کا خطرہ پایا جائے انفرادی ملکیت سے نکال کر قومی ملکیت کے تحت لے آنا چاہیئے۔ بہت سے ترقی یافتہ صنعتی ممالک کا یہ تجربہ ہے کہ اجارہ کے خلاف قوانین پاس کرنے کے باوجود اس کی برائیوں کو پوری طرح سے دُور نہیں کیا جا سکتا۔ افادات عامہ کے تمام کاموں کو بھی حکومت خود انجام دے اور خود ہی مالک ہو۔ ان صنعتوں کے علاوہ بہت سے ایسے کام پھر بھی باقی رہ جائیں گے جو ذاتی اہتمام کے تحت انجام دئے جا سکتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی ضرورت اس امر کی ہو گی کہ حکومت اپنی عام نگرانی قائم رکھے تاکہ آجروں کو بہت زیادہ منافع کمانے کا موقعہ نہ مل سکے۔ اس طرح سے حکومتی اور ذاتی اہتمام کے حدود مقرر کر دئے جائیں گے اور سرمایہ داری اور اشتراکیت میں ایک امتزاج قائم کیا جا سکے گا۔

ہندوستانی معاشیین کی طرف سے سب سے اہم اعتراضات لائحۂ عمل کے مالی پہلو پر کئے گئے ہیں۔ لائحۂ عمل کو کامیاب بنانے کے لئے پندرہ سال کے عرصہ میں دس ہزار کروڑ روپے کا شغل اصل کرنا پڑے گا۔ معاشیین کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر ملک کے حالات کا خیال کرتے ہوئے قومی آمدنی میں اضافہ کے لئے ایک خاص تناسب سے شغل اصل میں اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ مختلف ممالک میں اس تناسب میں اختلاف پایا جاتا ہے اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ تناسب ۲ اور ۳ کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قومی آمدنی میں ۱۰۰ کروڑ روپے کا اضافہ کرنے کے لئے ۲۰۰ کروڑ اور ۳۰۰ کروڑ روپیوں کا مزید شغل اصل کرنا پڑے گا۔ ہندوستان کے متعلق خیال ہے کہ یہ تناسب ۲ء۴ ہوتا ہے اس لئے ۴۴۰۰ کروڑ روپے مزید آمدنی حاصل کرنے کے لئے دس ہزار کروڑ روپیوں کا شغل اصل درکار ہوگا۔ یہاں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ یہ تناسب معلوم کرتے وقت جنگ سے

پہلے والی قیمتوں کو فرض کیا گیا ہے۔ جنگ کے بعد قیمتوں کی جو بھی سطح رہے اس کے لحاظ سے تشکیل اصل کی مقدار میں اضافہ یا کمی کرنی پڑے گی۔ بظاہر دس ہزار کروڑ روپے بہت زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ایسے لوگوں کے لئے جو صرف لاکھوں میں سوچنے کے عادی ہوں۔ دراصل ایسا نہیں ہے۔ ہندوستان کے وسایل کا خیال کرتے ہوئے یہ رقم کچھ زیادہ بڑی معلوم نہیں ہوتی۔ دوسرے ممالک کے مصارف جنگ پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس کی اہمیت اور بھی کم ہو جاتی ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ موجودہ جنگ کے دوران میں جتنے سالانہ مصارف کر رہا ہے دس ہزار کروڑ روپے اس کے صرف ایک تہائی ہوتے ہیں۔ ہندوستانی قوم کو پندرہ سال کے عرصہ میں اس رقم کو صرف کرنیکا مشورہ دیا گیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دس ہزار کروڑ روپے کہاں سے آئیں گے۔ اوسطاً ۶۶۶ کروڑ روپے سالانہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس سلسلہ میں دوسرا سوال یہ ہے کہ صنعتی ترقی کے لئے ہم دوسرے ممالک سے ضروری خام اشیاء، فنی مہارت اور مشنری وغیرہ بھی حاصل کر سکیں گے یا نہیں، اور ان کی ادائی کرنے کے قابل بھی ہو سکیں گے یا نہیں۔ خاص طور پر بعض اہم اور بنیادی صنعتیں قائم کرنے کے لئے مشنری اور با مہارت محنت کی بہت کافی ضرورت ہوگی۔ یہ اندازہ پیش کیا گیا ہے کہ ۱۰ ہزار کروڑ میں سے ۲۶۰۰ کروڑ روپے کا صرفہ بیرونی ممالک میں کرنا پڑے گا۔ اس رقم کے حاصل کرنے کے حسب ذیل ذرائع بیان کئے گئے ہیں:

اسٹرلنگ فاضلات۔	۱۰۰۰ کروڑ روپے
سونا	۳۰۰ "
توازن تجارت	۶۰۰ "
بیرونی قرضے	۷۰۰ "

اعتراضات کرنے والوں کا خیال ہے کہ مندرجہ بالا اندازے پیش کرتے وقت بہت زیادہ

خوش امیدی سے کام لیا گیا ہے۔ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بیرونی ممالک سے اتنے زیادہ وسایل ضرور حاصل کئے جا سکیں گے اسٹرلنگ فاضلات کو زر کاغذی جاری کرنے میں استعمال کیا جا رہا ہے اور ان سے اس وقت تک مشینیں وغیرہ خریدنے کا کام نہیں لیا جا سکتا جب تک کہ حکومت ہند خود اپنی تمسکات ریزرو بنک کو نہ دے۔ اندوختہ دولت سے ۳۰۰ کروڑ روپے حاصل کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اندوختہ دولت کو بیرونی ذرائع میں کیوں شمار کیا گیا ہے، اس کی محض وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی اندوختہ دولت سونے اور چاندی کی شکل میں موجود ہے اور یہ چیزیں اپنے ہی ملک میں معاشی ترقی کے لئے استعمال نہیں کی جا سکتیں۔ البتہ سونے کی حیثیت بین الاقوامی زر کی سی ہے جس کے ذریعہ سے دوسرے ممالک سے وسایل حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے بجا طور پر اسے بیرونی ذرائع میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اندوختہ دولت سے پیدا آور کام اسی وقت لیا جا سکتا ہے جبکہ قومی حکومت ملک میں قائم ہو اور وہ عوام کے جذبات کو ابھار کر سونا فروخت کرنے اور شغل اصل کرنے پر مجبور کرے۔ توازن تجارت کو موافق رکھ کر (جس کا مطلب یہ ہے کہ برآمد کے مقابلے میں درآمد کم ہو) ۶۰۰ کروڑ روپے حاصل کرنے کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی مد ہے جس کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا انحصار بہت کچھ بین الاقوامی حالات پر رہے گا۔ اس کے علاوہ اس مد کو اندرونی بچتوں میں شامل کرنا چاہیئے۔ جب ایک ملک دوسرے ممالک سے کم مال خریدتا ہے اور اپنا زیادہ مال فروخت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ملک کے رہنے والے بچتیں کرتے ہیں۔ بیرونی ذرائع کی آخری مد دوسرے ممالک سے قرضوں کی رکھی گئی ہے۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ دوسرے ممالک خاص طور پر انگلستان اور امریکہ جیسے ملکوں سے بہت کافی مقدار میں قرضے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ان ملکوں میں سرمایہ بہت کافی جمع ہو چکا ہے اور اس سے کام لینے کے مواقع بہت کم رہ گئے ہیں۔ لیکن

بیرونی ممالک سے قرضے حاصل کرنے کی وجہ سے نئی نئی غرض داریاں پیدا ہونے کا خطرہ موجود ہے اور بیرونی سرمایہ کی خرابیوں کو جن کا ہم پہلے سے شکار ہو چکے ہیں پھر برداشت کرنا پڑے گا۔ ان خرابیوں کو دور کیا جاسکتا ہے اگر حکومت بیرونی سرمایہ کو کنٹرول کرے اور منصوبی معیشت میں اس قسم کا کنٹرول قائم ہونا ایک ضروری امر ہے۔

بیرونی ذرائع سے کہیں زیادہ اندرونی ذرائع اہمیت رکھتے ہیں، اگر توازن تجارت کی مد کو بھی اندرونی بچتوں میں شامل کرلیا جائے تو مجموعی رقم ...۸ کروڑ روپے ہوتی ہے پندرہ سال کے عرصہ میں ...۸ کروڑ روپیوں کی بچت یا ۵۳۳ کروڑ روپے سالانہ کی بچت کرنی ہوگی تب ہی لایحۂ عمل کو کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ آمدنی میں اضافہ کیساتھ قومی آمدنی کا صرف ۱۶ فیصد بچانے سے ۵۲۴ کروڑ روپے سالانہ حاصل کئے جاسکیں گے۔ دوسرے ممالک مثلاً روس اور جاپان صنعتی ترقی کے لئے اپنی قومی آمدنی کا ۲۰ فیصد تک بچا چکے ہیں، اس لئے ہندوستان کے لوگ بھی آسانی سے ۱۶ فیصد بچا سکتے ہیں اور ان کے معیار زندگی پر کچھ زیادہ بار نہیں پڑے گا۔ البتہ ایک دم بچتیں نہیں کی جاسکیں گی، اس لئے کمی کو پورا کرنے کے لئے حکومت کو تمسکات جاری کرکے زر کی تخلیق کرنی ہوگی تاکہ معاشی وسایل کو حرکت پذیر کیا جاسکے تخلیق شدہ زر کا اندازہ ..۳۴ کروڑ کیا گیا ہے۔ یہی وہ تجویز ہے جس پر اکثر معاشیین نے سخت قسم کی تنقید کی ہے۔ یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ اس طرح سے زر کی مقدار میں اضافہ کرنے کا نتیجہ ملک میں افراط زر اور اس کی تمام برائیاں ہوگا۔ ہندوستان کو جنگ کے دوران میں افراط زر کے حالات سے مقابلہ کرنا پڑرہا ہے جنگ کے بعد اس پالیسی کو کبھی بھی اختیار نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن جو لوگ تخلیق شدہ زر کی حمایت کررہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ جنگ کے دوران میں افراط زر کی پالیسی اور جنگ کے بعد کی پالیسی میں بہت بڑا فرق ہے۔ جنگ کے دوران میں اشیا کی مقداروں میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوا ہے اور زر کی مقدار کئی گنا بڑھ گئی ہے اس لئے قیمتیں چڑھ گئی ہیں اور لوگوں کو مصائب کا سامنا کرنا پڑرہا ہے۔ جنگ کے بعد جب لایحۂ عمل کو

اختیار کیا جائے گا اور اس کے لئے زر کی مقدار بڑھائی جائے گی تو اس کے ساتھ ساتھ پیدائش دولت بھی بڑھے گی چیزوں کی مقداروں میں خود بخود اضافہ ہو جائے گا اور عوام کو کسی قسم کی مصائب کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ لائحہ عمل تیار کرنے والوں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ اس کے شروع کے مدارج میں اشیاء صرف کی مقداریں بھی بڑھانے کی کافی کوشش کی جائے۔ مختلف طبقات میں مساوات قائم کرنے کے لئے قومی معیشت پر مختلف قسم کے حکومتی کنٹرول اور راتب بندی کے طریقہ کو اختیار کرنے کی بھی سفارش کی گئی ہے۔ زر کی مقدار کو بڑھا کر پیدائش دولت میں اضافہ کرنے کے تجربہ کو جرمنی اور روس کامیابی سے اختیار کر چکے ہیں۔ ہمارے ملک میں ان دونوں ملکوں کے مقابلہ میں انسانی اور معاشی وسایل بہت زیادہ بیکار موجود ہیں۔ تخلیق زر کی پالیسی کو محض عارضی طور پر اختیار کرنا پڑے گا اور جب پیدائش دولت بڑھ گئی تو نیا زر ملک کی ضروریات کے لئے زیادہ نہیں ہوگا۔ اس کا امکان ہے کہ لائحہ عمل کی مدت ختم ہونے پر اشیاء کی مقداریں اتنی زیادہ ہو جائیں کہ قیمتیں بجائے بڑھنے کے کم ہوں۔ اس طرح سے عوام کا معیار زندگی بڑھے گا اور انھیں کوئی خاص قربانی نہ کرنی ہوگی۔ البتہ حکومت کو زر کی مقدار بڑھانے میں بہت ہوشیاری سے کام لینا پڑے گا۔

لائحہ عمل کے خلاف جو کچھ اعتراضات ہوئے ہیں ان کا تذکرہ کر دینے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بعض خوبیوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے۔ اس کے تیار کرنے والوں کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ انھوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے ایک ایسے اہم کام کو انجام دیا جسے حکومت باوجود اپنے تمام وسایل کے پچھلے دو تین سال کے عرصے میں انجام نہ دے سکی۔ ملک میں لائحہ عمل سے بہت زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں کو ملک کے معاشی مسائل سے بہت کافی لگاؤ ہو چلا ہے۔ ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ لائحہ عمل کے تیار کرنے والوں نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ انھوں نے اسے ملک کے سامنے آخری شکل میں پیش کیا ہے۔ ان کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ لوگوں کو مباحث کا

موقعہ مل سکے اور وہ تنقید اور اعتراضات سننے کے لئے تیار رہیں۔ منصوبہ کے مختلف پہلوؤں کی تفصیلات کے متعلق بعد میں کتابچے شائع کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ لائحہ عمل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اس کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں عوام کو بہت زیادہ تکالیف کا سامنا نہ کرنا پڑے جیسا کہ روس میں ہو چکا ہے جبکہ ضرورت سے زیادہ وسایل شروع کے سالوں میں اشیاء پیدائش (مشین وغیرہ) تیار کرنے میں لگا دیے گئے تھے۔ یہاں اشیاء پیدائش میں اضافہ کی سفارش تدریجی طور پر کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اشیاء صرف کی مقداریں بڑھانے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ سالہ لائحہ عمل اور اسی قسم کے دوسرے لائحہ عمل پر غور کرنے کے لئے ایک ایسا منصوبی کمیشن مقرر کیا جائے جس میں مختلف مفادات کی نمائندگی کی گئی ہو۔ اس کمیشن کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ زراعت، تجارت، صنعت و حرفت، غرض قومی معیشت کے کسی شعبہ میں نئی نئی غرض داریاں پیدا نہ ہوں اور پرانی غرض داریاں جلد سے جلد ختم ہو جانا چاہیئے اور جو بھی لائحہ عمل منظور کیا جائے اس کا مقصد ہندوستانی عوام کی زندگی زیادہ خوشحال بنانا ہونا چاہیئے۔

تنقید و تبصرہ

یہ چھوٹا سا رسالہ جو چھوٹی تختی کے ۶۰ صفحات پر
ترکستانی خاتون شاہراہ انقلاب پر مشتمل ہے جناب قدوس صہبائی کی تالیف
ہے۔ خود مولف کے الفاظ ہیں "یہ چند مضامین کو ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔
یہ فوضینہ نامی ایک ترکی عورت کی سوانح حیات ہے جس نے ترکستان کی قدیم زندگی کو
خیرباد کہہ کے بالشوی آزادگی اختیار کرلی۔ اس سوانح کا مقصد ترکستان کی قدیم نسائی
زندگی کی خرابیاں بے نقاب کرنا ہے جن کو بالشوی انقلاب نے دُور کیا۔ ......"
اس میں کوئی شک نہیں کہ بالشوی انقلاب نے ترکستان کی قدیم اور خصوصاً نسائی زندگی
کی بدنما اور مہلک روایتوں کو مٹا دیا اور بہت کچھ روشنی پھیلائی۔ لیکن یہ تصویر کا ایک ہی
رُخ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ترکستان کی نسائی زندگی میں بہتیری خرابیاں تھیں جو قدیم زمانے
سے چلی آتی تھیں، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں خوبیاں بھی تھیں
جن کو بالشوی انقلاب سے نقصان پہنچا۔ اس انقلاب سے بہتیری بُرائیاں دُور ہوئیں
لیکن اس سیلاب میں قدیم معاشرے کے اچھے پہلو بھی بہہ گئے جو بہت بڑا نقصان ہے۔
زبان اس سے زیادہ ستھری اور سلیس ہونی چاہیئے۔ بعض جملے بہت گنجلک اور بے ڈول
ہو گئے ہیں اور پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی دوسری زبان سے ترجمہ کیا گیا
ہے۔ مثلاً "ایک ترقی یافتہ انسان کو ...." منجملہ دیگر حیرت میں ڈال دینے والے

مشاہدوں کے ایک یہ بھی ہوتا ہے۔ "تقریباً تیرہ خوش رو لانبے اور تندرست ہندوستان کے ہندو اور مسلمان کا مرتبہ آہستہ آہستہ ہال میں ایک سنجیدگی اور پُر وقار متانت کے ساتھ داخل ہوئے۔"

بخارا کا جمہوری انقلاب یہ ایک چھوٹا رسالہ ہے جو چھوٹی تختی کے ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ سید عالم خان سابق شاہ بخارا نے فارسی میں اپنی سوانح حیات لکھی تھی جس کو جناب قدوس صہبائی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ ایک اچھا کام ہے۔ اس سے ترکستان کی حالیہ تاریخ کے بعض پہلو روشنی میں آجاتے ہیں۔ نہ صرف ترکستان کی قدیم سیاست اور فرمانروائیاں معلوم ہوتی ہیں بلکہ وہ کشمکش حیات بے نقاب ہوتی ہے جو قدیم سیاست و معاشرت اور بولشویی انقلاب کے درمیان ہوئی۔ یہ رسالہ بہت مختصر ہے اور پڑھنے کے بعد بہت کچھ تشنگی رہ جاتی ہے۔ اگر مولف اس کو پوری وضاحت سے بیان کرتے تو اچھا ہوتا لیکن یہ دراصل مولف کی کوتاہی ہے۔ تاہم صہبائی صاحب قابل شکریہ ہیں کہ یہ ضروری رسالہ فارسی سے اردو میں منتقل کردیا۔ ایسا تمام ادب اردو میں منتقل ہونا چاہیئے۔ ترجمہ زیادہ صاف وستھرا ہونا چاہیئے۔ بعض جگہ اچھا ترجمہ نہیں ہوا اور ترجمہ معلوم ہوتا ہے، مثال کے طور پر دو ایک جملے یہ ہیں: "چونکہ ان لوگوں کا مقصد بھی بالشویکوں کے مقصد کی حد تھا" "بولشویک جماعت نے کھلم کھلا مقابلہ اور مجادلہ و محاربہ کا خوفناک آغاز کردیا۔" وغیرہ۔ دوسری طبع میں اس کی نظر ثانی ہوسکتی ہے۔

صدیقی

تاریخ سیاسیات از عبدالمجید صدیقی۔ ایم۔اے۔ ایل ایل۔ بی (عثمانیہ) استاذ تاریخ جامعہ عثمانیہ و معتمد شعبۂ تاریخ ادارہ ادبیات اردو۔ حیدرآباد دکن۔ ۱۹۴۴ء۔ ملنے کا پتہ۔ سب رس کتاب گھر ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن صفحہ ۲۷۲ قیمت (عہ)۔

ضرورت تھی کہ تاریخ سیاسیات پر ایک ٹھوس اور مختصر کتاب لکھی جائے جس کا پیرایۂ بیان

عام فہم اور دلچسپ ہو۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ پروفیسر صدیقی صاحب اس ذمہ دارانہ کام کو سرانجام دینے میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ آپ کی کتاب ۱۶ ابواب پر مشتمل ہے جس میں ایک عالمانہ مقدمہ کے علاوہ، دور قدیم، دور وسطیٰ اور دور جدید کے سیاسی تخیل کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔

آپ نے مقدمہ میں سیاسی زندگی کے آغاز و نشو و نما پر بحث کی ہے۔ نیز سیاسی نظریوں کی اضافی حیثیت پر بھی زور دیا ہے۔ اکثر و بیشتر سیاسی نظریئے گرد و پیش کے حالات اور ماحول کے کیفیات کے تابع ہوتے ہیں۔ سیاسی نظریوں کی عالمگیر حیثیت پر جو مصنفین کہ زور دیتے ہیں انھیں یہ امر بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ مقدمہ کے آخری حصہ میں لایق مصنف نے سیاسی نظریوں کی افادیت کو بھی واضح کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ دُنیا کے بڑے بڑے انقلابات کی بنیادیں کسی نہ کسی سیاسی نظریہ میں پائی جاتی ہیں۔

قدیم سیاسی تخیل کے تحت آپ نے یونانی و روما کے سیاسی افکار کو پیش کیا ہے۔ بہتر ہوتا اگر آپ افلاطون کے خیالات پر تبصرہ کے سلسلہ میں اس کی عصری اہمیت کو بھی واضح کرتے۔ اس مشہور یونانی مفکر نے منتخب افراد کے ذریعہ حکومت کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یوں بھی قابل ذکر ہے کہ اس نے فاشزم کے نظریہ کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اسی طرح روما کے سیاسی افکار کی عصری اہمیت کو بھی واضح کیا جاتا تو مناسب ہوتا موجودہ دور کے آمریت اور روما کے بعض سیاسی نظریات میں گہرا تعلق ہے۔

دور وسطیٰ کے سیاسی تخیل کے تحت آپ نے مسیحیت کے کارہائے نمایاں کو پیش کیا ہے لیکن اس حصہ کا قابل قدر باب وہ ہے جس میں آپ نے اسلام کے سیاسی تخیل کی وضاحت کی ہے۔ افسوس ہے کہ سیاسی تخیل کی ساری کتابیں اس موضوع سے خالی پائی جاتی ہیں، حالانکہ ادارات اور نظریات کے لحاظ سے اسلام اور مسلمانوں کے خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ یہ دور قدیم اور دور حالیہ کے مابین اتصالی کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صدیقی صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ سیاسی تخیل کی تاریخ کے فراموش کردہ

حصوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے اور دوران بحث خلافت، انتخاب خلیفہ، اقتدار اعلیٰ، تفریق اختیارات جیسے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ نے اقتدارِ اعلیٰ کے سلسلہ میں نظریۂ انقلاب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ نظریہ کچھ زیادہ تفصیل کا محتاج ہے۔ نیز آئندہ ایڈیشن میں چند اہم مسلمان سیاسی مفکرین مثلاً ماوردی غزالی نظام الملک طوسی ابن خلدون وغیرہ کے خیالات بھی مختصراً پیش کئے جائیں تو کتاب کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔

دورِ جدید کے مباحث کے سلسلہ میں آپ نے قومی مملکتوں کے آغاز وعروج پر روشنی ڈالی ہے۔ یہاں سے سیاسی تخیل کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے اور خالص دنیوی نقطۂ نظر مقدم بن جاتا ہے۔ مکیاولی تو اسی قسم کے تخیل کا محض ایک پیشرو تھا۔ اصلاح مذہبی کی تحریک نے پاپائی اقتدار کے بہت سارے مخالف مفکرین پیدا کر دیئے حکومتوں کے اقتدارِ اعلیٰ کا مسئلہ پیش ہونے لگا، اور وقتاً فوقتاً مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا مشیت عامہ کا نظریہ جسے رُوسو نے شد و مد کے ساتھ پیش کیا وہ ایک تجریدی تصور ہے جو واقعہ کے اعتبار سے عوام کی نہیں بلکہ حکومت کی مرضی کا ایک دوسرا نام ہے۔

کتاب کے آخری حصہ میں لائق مصنف نے افادیت۔ انفرادیت تصوریت۔ اشتراکیت۔ فاشیت۔ نازیت۔ تکثیریت جیسے نظریوں پر بحث کی ہے۔ حکومت کے فرائض کے متعلق عدم مداخلت کا جو نظریہ پیش ہوا تو کچھ ہی عرصہ کے بعد اس کے نقائص نمایاں ہونے لگے اور اس کا ردعمل اشتراکیت کی صورت میں نمودار ہوا۔ لیکن اشتراکیت نے انفرادی شخصیت کے وجود سے کبھی انکار نہ کیا۔ اس نے صرف انفرادیت کے غیر صحت بخش اور غیر معاشرتی عناصر کی بیخ کنی کی کوشش کی۔ البتہ فاشیت اور نازیت نے مملکت کا ایک ایسا تصور قائم کیا جس کے تحت انفرادی حقوق اور مفاد کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ انسان کی شخصیت حکومتوں کے اغراض کی تکمیل کا ایک ذریعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اسی سلسلہ میں اگر صدیقی صاحب ہیگل کے فلسفہ اور فاشیت کے نظریہ میں جو گہرے تعلقات ہیں انھیں

واضح کرتے تو ہمیں تصوریت اور فاشیت کے باہمی میل جول کا پتہ لگانے میں آسانی ہوتی۔ تصوریت اور فاشیت پر تنقید کے سلسلہ میں ہمیں تکثیری نظریہ کے مطالعہ سے خاصی مدد ملتی ہے لیکن یہاں مصنف نے اختصار سے کام لیا ہے۔

مزید دو ایک چیزیں ایسی ہیں جن کا آئندہ اڈیشن میں لحاظ رکھا جائے تو مناسب ہوگا۔ اس میں کلام نہیں کہ مصنف نے جا بجا حواشی میں اُردو اصطلاحات کے انگریزی مرادفات درج کئے ہیں لیکن کتاب کے ضمیمہ کے طور پر ان تمام اُردو اصطلاحات کی ایک مکمل فہرست دی جائے جو اس کتاب میں استعمال کئے گئے ہیں اور ان کے انگریزی مرادفات بھی لکھ دیئے جائیں۔ نیز حواشی میں جو انگریزی الفاظ درج ہیں انھیں ٹائپ کے حروف میں لکھنا بہتر ہوگا۔

ہماری خواہش ہے کہ صدیقی صاحب اسی قسم کی ایک تفصیلی تاریخ سیاسیات بھی لکھیں جو منتہیوں کے لئے کارآمد ثابت ہو۔

محمد عبدالقادر

مولانا عبیداللہ سندھی از پروفیسر محمد سرور صاحب شائع کردہ سندھ ساگر اکاڈمی۔ لاہور۔ قیمت للعہ ر۔

پروفیسر محمد سرور صاحب کو مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کی صحبت میں بیٹھنے اور ان کے خیالات کا مطالعہ کرنے کا جو موقع حاصل ہوا ہے وہ شاید ہندوستان میں کسی دوسرے شخص کو حاصل نہ ہوا ہوگا۔ مولانا کے تبحر علمی سے استفادہ کے لئے اعلیٰ علمیت کی ضرورت تھی جو پروفیسر محمد سرور صاحب میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اور پھر مصر جاکر علوم اسلامیہ کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کے خیالات کو پیش کرنے کے لئے ان سے بہتر شخص ملنا مشکل تھا۔

یہ بہت اچھا ہوا کہ مولانا کے خیالات ایک جگہ قلمبند ہوگئے جن سے اب

دوسرے لوگ بھی استفادہ کرسکتے ہیں۔ اس کتاب میں مذہب و تمدن کے نہایت اہم مسائل کے متعلق مولانا کی رائے اور توجیہہ کو پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں اسلامی زندگی کے نہایت اہم مباحث آگئے ہیں۔ چنانچہ وحدت انسانیت، خداپرستی اور انسان دوستی، انسانیت کے بنیادی اخلاق، تصوف، تاریخ اسلام کے پس منظر، اسلامی افکار میں رجحانات، اسلامی ہند میں اکبر، اورنگ زیب اور شاہ ولی اللہ کی حیثیت اور اثر، آخر میں ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل پر بحث کی گئی ہے۔

ان تمام مذکورہ بالا مباحث کو سرور صاحب نے نہایت سلیقہ کے ساتھ پیش کیا ہے اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ کتاب کا انداز بیان دلکش ہے۔ شروع کرنے کے بعد دل چاہتا ہے کہ ختم کرکے اٹھا جائے۔ اُمید ہے کہ اُردو داں پبلک اس کتاب کی معنوی خوبیوں سے پورا پورا فایدہ اُٹھائے گی۔ ممکن ہے بعض مسائل کے متعلق اختلاف رائے کیا جائے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے افکار میں قوت اور اجتہاد ہے جو ہماری نئی نسلوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(ی)

دوسرے رسائل

علیگڑھ میگزین فانی نمبر فانی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی یاسیت ہے۔ وہ غم اور یاس کا شاعر ہے لیکن فانی غم کی اعلیٰ بلندیوں سے دنیا والوں سے خطاب کرتے ہیں۔ ان کے غم میں جتنی گہرائی ہے دوسروں کی مسرت میں اتنی

گہرائی کبھی نہیں آسکتی۔ مسرت کا تجربہ کبھی گہرا نہیں ہوسکتا۔ یہ ضرور ہے کہ زندگی میں غم ہی غم نہیں، اور چیزیں بھی ہیں۔ لیکن فانی پر تصورِ غم اس قدر حاوی ہے کہ وہ زندگی اور کائنات کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے غم سے وہ لذت حاصل کرتے ہوں جس طرح دوسرے مسرت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ غم کی شاعری میں ٹریجڈی کی طرح اعلیٰ ترین آرٹ کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فانی کا آرٹ ایک مسلسل المیہ کا اظہار ہے۔ ان کے شعر میں خلوص ہے اور ان کی شخصیت سے اس کا گہرا تعلق معلوم ہوتا ہے ورنہ اس میں تاثیر نہ ہوتی۔

زبان، اندازِ بیان اور مضمون آفرینی کی بدولت فانی کا شمار اُردو کے بہترین غزل گو شعرا میں کیا جائے گا۔ ان کی لطافتِ بیان مسلّم اور ان کا کلام ابتذال سے قطعاً پاک ہے۔ ان کی بعض غزلیں ہماری زبان کے کلاسک میں شامل ہونے کے لائق ہیں مثلاً

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
سا ری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا

فصلِ گُل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
یا کوئی وحشی اور آپہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

لیجئے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہیئے
اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدت گزری چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہونچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

شاید میں درخورِ نگہ گرم بھی نہیں — بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دُور
آنکھیں چرا کے آپ نے افسانہ کر دیا — جو حال تھا زباں سے اور بیاں سے دُور

ہر دل کو تیرے غم نے مسلماں بنا دیا
توفیقِ اضطراب کو ایماں بنا دیا

میری نگاہ معترفِ عجزِ خاک تھی
تیری نظر نے خاک کو انساں بنا دیا

جب اس نے غم سے پردہ اٹھایا تو عشق تھا
جب دل کو بے نقاب کیا جاں بنا دیا

تاج یہ ہفتہ وار اخبار مولوی سید حسن صاحب کی ادارت میں دفتر تاج گلزار حوض حیدرآباد (دکن) سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ مضامین کا معیار اچھا ہے۔ زیادہ تر مضامین سیاسی اور معاشی مسائل کے متعلق ہوتے ہیں تاکہ پبلک کو ان سے واقفیت حاصل ہو۔ پہلے نمبر میں مولوی سید محمد تقی صاحب کا مضمون "پرانا حیدرآباد" دلچسپ ہے۔ اس قسم کے اور مضامین اگر کبھی کبھی شائع ہوتے رہیں تو یقیناً بہت مفید ہوں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی معاشیات
کے
چند فقہی اور قانونی ابواب

اسراف ۔ میرے نزدیک صرف دولت میں مندرجہ بالا اصولی مشورہ کے حدود سے آگے بڑھنا اسراف ہے ۔ خواہ "العفو" کے قاعدہ کی خلاف ورزی وہ لوگ کریں جن کی آمدنیوں کا ذریعہ "اصل" و سرمایہ ہو یا "قوام" کی راہ چھوڑکر کل البسط" (اندھادند خرچ) کی راہ وہ اختیار کریں جن کو اپنے مصارف میں حکم دیا گیا تھا کہ اعتدال کو حتی الوسع اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑیں ۔ اور "تبذیر" سے یہ بالکل ایک جداگانہ معاشی قانون ہے ۔ تبذیر کے متعلق قرآن سے بتایا جاچکا کہ وہ شیطان کی برادری میں داخل ہونا اور اس کی صفت کفوریت میں حصہ دار ہونا ہے ۔ اور "اسراف" سے بھی اسلام گو منع کرتا ہے لیکن اس کا نتیجہ اس نے وہ نہیں بتایا جو تبذیر کا ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ اس کا انجام یہی ہے جس کا اظہار قرآن نے

فتقعد ملوما محسورا   پس بیٹھ جاؤ گے ملامت زدہ درماندہ ہوکر

سے کیا ہے یعنے دھتکارا، اور درایا ہوا، مایوس، ور ماندہ بن کر مسرف بیٹھ جاتا ہے۔ اور یہ ایک واقعہ ہے جس کا ظہور اسی زندگی میں اور جس کا تجربہ اسی "الحیوۃ الدنیا" میں قریب قریب ہر مسرف کو ہوتا رہتا ہے "العفو" کے قانون کا بھی جہاں قرآن میں ذکر ہے وہاں یہ فرما کر

کذلک یبیّن اللہ لکم الایات	یوں ہی خدا تمھارے سامنے نشانیوں کو
لعلکم تتفکرون فی الدنیا والآخرۃ	کھولتا ہے تاکہ دنیا اور آخرت میں سوچ بچار کرسکو۔

ادھر اشارہ کیا گیا کہ قانون "العفو" ایک دنیاوی قانون اور معاشی استحکام کا ایک ذریعہ ہے۔

یہاں خصوصاً "العفو" کا جو مطلب میں نے بیان کیا ہے اس سے ایک خاص اعتراض کا بھی ازالہ ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بعض حدیثی روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل کے لئے
لم یکن یدخر شیاءً لغدٍ	کوئی چیز بینت کر نہیں رکھتے تھے۔

اسی طرح بعض تاریخی بیانوں سے معلوم ہوتا ہے

قد کان کثیر من فضلاً الصحابۃ	بڑے بڑے صحابیوں میں بکثرت ایسے حضرات
ینفقون فی سبیل اللہ جمیع	تھے جو اللہ کی راہ میں اپنے سارے مملوکات خرچ
املا کھم ولم یعنفھم النبی	کر ڈالتے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
صلی اللہ علیہ وسلم	کبھی ان کے اس فعل پر تنبیہ نہیں فرمائی۔

مثلاً اکثر وعظ کی مجلسوں میں سُنایا جاتا ہے کہ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دفعہ اپنا کل مال چندہ میں لاکر حاضر کر دیا، جب پوچھا گیا کہ گھر میں کیا چھوڑا بولے اللہ اور اس کا رسولؐ (اوکما یقول القصصہ والوعاظ)۔ قانون اسراف کی قرآن میں جو مذمت کی گئی ہے اس کو دیکھ کر لوگوں کو شبہہ ہوا اور ہونا چاہئے تھا، عموماً اس کا جواب پھر یہی

دیا گیا ہے کہ

ھذا خطاب لغیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم (الجصاص)	یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسروں سے خطاب ہے یعنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسراف کے قانون سے مستثنیٰ تھے (اور بعض صحابہؓ بھی)۔

بڑے بڑے طویل صفحات میں اس پر جو بحث کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ اسرافی قوانین کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو توکل تام اور خدا پر کامل بھروسہ کرنے کی قوت اپنے اندر نہ رکھتے ہوں، باقی جو اس طاقت سے سرفراز ہیں وہ اپنا سارا مال چاہیں تو لٹا سکتے ہیں۔
مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور فضلاء صحابہؓ کے متعلق سب کچھ خرچ کر دینے کا جو دعویٰ کیا گیا ہے اس کے سمجھنے میں لوگوں نے ذرا تامل سے کام نہیں لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تو یہ کہا جاتا ہے کہ "لم یکن ید خر لغدٍ" (یعنے کل کے لئے بچا کر نہ رکھتے تھے) اور پھر حدیث ہی کی کتابوں میں ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جائداد کو جسے یہودیوں کا قبیلہ بنی النضیر مدینہ کے قریب چھوڑ کر جلاوطن ہو گیا تھا

کان للنبی صلی اللہ علیہ وسلم خاصتہ ینفق علی اھلہ نفقۃ سنۃ ویحبس لاھلہ قوت سنتھم وما بقی جعلہ فی الکراع والسلاح عدۃ فی سبیل اللہ (صحاح ستہ)	یہ جائداد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خالصہ جائداد میں شمار ہوتی تھی جس سے اپنے اہل و عیال کے لئے سال بھر کے خرچ کی تکمیل فرماتے اور ایک سال کا خرچ روک رکھتے تھے اور جو باقی بچ جاتا اس کو جہاد کی سواریوں اور ہتھیاروں میں صرف فرماتے اور اللہ کی راہ میں جو جنگ ہوتی اس کا ساز و سامان تیار فرماتے۔

اسی طرح فتح خیبر کے بعد جو حصہ آپ کو خیبر میں ملا تھا، اگرچہ بند و بست تو آپ نے یہودیوں ہی کے ساتھ کر دیا تھا لیکن سالانہ جو آمدنی اس سے ہوتی تھی۔ بخاری میں ہے کہ

کان یعطی ازواجہ مائۃ وسق	اپنی بیویوں کو آپؐ سو[1] وسق عطا فرماتے تھے
ثمانون وسق تمر و عشرون	جس میں اسّی وسق کھجوریں ہوتی تھیں اور بیس
وسق تمر	وسق جو۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں جب خیبر کے یہودیوں کا اخراج عمل میں آیا، تب حضرتؓ نے ازواج مطہرات سے کہلا بھیجا کہ آیا وہ زمین اور پانی چاہتی ہیں، یا جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کھجور اور غلّہ ملتا تھا، وہی لیتی رہیں گی۔

فمنھن من اختار الارض والماءُ	پھر ان میں بعضوں نے زمین اور پانی کو اختیار
منھن عائشۃؓ وحفصۃؓ واختار	فرمالیا جن میں حضرت عائشہ اور حفصہ
بعضھن الوسق	رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی تھیں، اور بعضوں نے
(بخاری ومسلم)	اپنے لئے الوسق (مقررہ پیمانہ کے حساب سے
	غلّہ ہی مقرر کرالیا)۔

ان روایات کے رہتے ہوئے "ماید خو لغد" کا یہ مطلب قرار دینا کہ "جمیع املاک" یعنے ہر قسم کی جائداد اور مملوکات کو آپؐ ختم کر دیتے تھے اور کل کے لئے نہیں چھوڑتے تھے۔ یقیناً صحیح نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر یہ کہا جائے کہ ان جائدادوں یا "اصل" سے جو آمدنی ہوتی تھی اسی "فضل المال" یا "العفو" کو آپؐ اس حد تک خرچ کر دیتے تھے کہ کل کے لئے مثلاً کچھ نہ رہ جاتا تھا تو روایات کی توثیق کی بھی صحیح شکل ہو سکتی ہے اور یہی کلیہ ان صحابیوں کے متعلق قرار دینا چاہیئے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اپنا سب کچھ لے کر چلے آئے تھے یعنے "العفو" اور "فضل المال" کے سلسلہ میں جو کچھ ان کے پاس اس وقت تھا اسے لاکر حاضر کر دیا کرتے تھے نہ کہ اپنے باغات، مکانات، زمینوں یا تجارتی پونجی سب کو ختم کر دیا کرتے تھے اور اس قاعدہ کو مان لینے کے بعد تمام روایتوں میں تطبیق ہو جاتی ہے خواہ مخواہ قرآن کے

---

[1] وسق ایک عربی پیمانہ ساٹھ صاع کا، اور صاع تقریباً تین سیر کے برابر ہوتا ہے ۱۲

قانون اسراف کے متعلق یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ اس پر نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا اور نہ فضلاء صحابہؓ نے۔

بہر حال "شغل اصل" کی آمدنی والوں کے لئے "العفو" اور بغیر "اصل" کے کمانے والوں کے لئے "قوام" یہی دونوں حدیں "معاشی اعتدال" اور "توازن" کو باقی رکھنے کی اسلامی تدبیریں ہیں۔

چونکہ "قوام" کی واقعی حد بندی مشکل تھی اس لئے اس کے حدود کی تعیین ہر شخص کے اختیارِ تمیزی کے سپرد کردی گئی، لیکن باوجود اس کے جہاں تک میں سمجھتا ہوں بعض ایسی خواہشیں جن کی تکمیل کی اسلام نے مزاحمت نہیں کی ہے ان کی بعض شکلوں کے متعلق اندیشہ تھا کہ عموماً لوگ اختیار تمیزی کو صحیح طور پر استعمال نہ کرسکیں گے اور "قوام" کی حد سے باہر ہو جائینگے اس لئے خصوصیت کے ساتھ ان جزئیات کو اسلام نے بجائے لوگوں کے سپرد کرنے کے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، یہی وجہ ہے کہ کھانے پینے پہننے رہنے سہنے الغرض ان تمام معاشی راہوں میں بعض ایسے معین احکام اسلام میں ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ "اسراف" کے قانون کو ان مسائل کی حد تک اسلام نے کچھ حدود بھی متعین کر دیئے ہیں مثلاً شراب ہی کا پینا ہے، یہ صحیح ہے کہ شراب کی ممانعت میں معاشی وجوہ سے زیادہ اخلاقی و اجتماعی اسباب کو دخل ہے۔ قرآن نے خود ہی بعض اسباب کو بیان کیا ہے لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ شراب ہی نہیں بلکہ اس قسم کی تمام نشہ اور چیزوں میں جہاں اور خرابیاں ہیں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ جس کی تعبیر فقہاء

قلیلہ ید عوالی کثیرہ — اس کی تھوڑی مقدار بڑی مقدار کو دعوت دیتی ہے یعنے اس کا مقدمہ بن جاتی ہے۔

سے کرتے ہیں۔ آدمی ابتداءً ان کی قلیل مقدار استعمال کرتا ہے لیکن دن بدن ان کی چھوٹی مقدار بڑی مقدار کو دعوت دیتی چلی جاتی ہے اور بالآخر وہ اشخاص اور خاندانوں کے لئے ایک معاشی دشواری کا سبب بن جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ شریعت اسلامی میں شراب اور شراب جیسی دوسری چیزیں مثلاً سیندھی، بھانگ، گانجہ، افیون وغیرہ کے کھانے پینے کو جو ناجائز ٹھہرایا گیا ہے ان میں علاوہ دیگر اخلاقی و اجتماعی مصالح کے اس معاشی دشواری کو بھی دخل ہے۔ آج دنیا کے تجربات بتا رہے ہیں کہ جن ممالک و اقوام نے ان منحوس چیزوں کو ترک کیا تھوڑے دنوں میں ان کی معاشی مصیبتوں میں کمی ہونی شروع ہو جاتی ہے۔

اسی طرح ظاہر ہے کہ اسلام "لباس" اور "زی" کے مسئلہ میں زینت تک کی اجازت دیئے ہوئے ہے۔ ستر پوشی کے سوا خود قرآن نے "و ریشاً" کے لفظ سے نیز "خذوا زینتکم (ای لباسکم) عند کل مسجد"[1] وغیرہ میں لباس کی بڑی غرض زینت ہی رکھی ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ نئے جوڑوں کو پہننے کے بعد فرماتے کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے یہ لباس پہنایا جس سے منجملہ اور فوائد کے "اتجمل فی حیواتی" (جمال حاصل کرتا ہوں میں اپنی زندگی میں) مگر لباسی سلسلہ میں مردوں کے لئے جہاں سونے چاندی کے زیورات حرام کئے گئے ہیں ان ہی کے ساتھ "القسی"[2] "لبس الحریر" کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شائد ان کپڑوں کی ممانعت میں اس نقطہ نظر کو بھی دخل ہو کہ مردوں میں ان چیزوں کے استعمال سے ایک قسم کی نسوانیت اور بیجا نزاکت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اگر مسلمانوں کا صنف کرخت اپنی کرختگی کی خصوصیت کو باقی رکھتے ہوئے لباس کے اس حصہ سے بچ جائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس مذہبی عمل کا اثر ان کے معاشی حال پر بھی

---

[1] ۔ ہر سجدہ گاہ کے پاس اپنی زینت کو اختیار کرو، یعنے عربوں کا دستور تھا کہ غیر قریشیوں کو کعبہ کا طواف کپڑوں سے کرنے نہیں دیتے تھے، حق تعالیٰ حکم دیا کہ باضابطہ ڈریس کے ساتھ مساجد میں آیا کرو۔ ۱۲

[2] ۔ یمن کے ایک ریشمی کپڑے کا نام تھا، اور حریر تو ظاہر ہی ہے اسلام میں مردوں کو ان کپڑوں کے استعمال کی اجازت نہیں۔ ۱۲

نہیں پڑے گا۔ لباس ہی کے سلسلہ میں بعض حدیثوں میں جو یہ آیا ہے

نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تستر الجدر — منع فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ دیواروں پر پردے ڈالے جائیں۔

یعنی "خواہ مخواہ" جیسے آدمی کپڑے پہنتے ہیں دیواروں کو بھی کپڑے پہنائے جائیں جیسا کہ لوگ بے ضرورت پردوں کی بھرمار اپنے مکانوں میں کرتے ہیں اور عرب میں تو اب تک دستور ہے کہ دیواروں کو غالیچوں اور مخملی کپڑوں سے ڈھانک دیتے ہیں گویا غلافِ کعبہ کی نقل کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل پر مختلف اوقات میں ناراضی کا اظہار فرمایا۔ ایک واقعہ اس موقعہ پر یاد آیا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے یہاں شادی کی تقریب تھی عورتوں نے شادی والے مکان میں سبز رنگ کے کپڑوں کا غلاف مختلف مقامات پر چڑھایا تھا، مہمانوں میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے، دیواروں کے اس ڈریس کو دیکھ کر ابن عمرؓ سے آپ نے فرمایا

یا عبد اللہ اتسترون الجدر — عبد اللہ کیا تم دیواروں کو بھی کپڑے پہناتے ہو۔

حضرت سالم بن عبد اللہ جن کی یہ شادی تھی ان ہی کا بیان ہے کہ

فقال ابی واستحیا غلبتنا نساءنا ابا ایوب — میرے والد نے فرمایا اور شرمائے ہوئے تھے ابو ایوب عورتیں ہم پر (اس معاملہ میں) غالب آگئیں۔

جواب میں حضرت ابو ایوب نے فرمایا

من خشیت ان یغلبنہ فلم اخش ان یغلبنک — مجھے اگر کسی کے متعلق اگر یہ اندیشہ تھا کہ عورتیں اس پر غالب آجائیں گی تو مجھے اس کا اندیشہ نہ تھا کہ عورتیں تم پر بھی غالب آجائیں گی۔

اور یہ فرما کر حضرت ابو ایوبؓ

لا اطعم طعاماً ولا ادخل لکم بیتاً　　　میں نہ تمھارا کھانا ہی کھاؤں گا اور نہ تمھارے گھر میں قدم رکھوں گا۔

فرماتے ہوئے واپس چلے گئے۔ اثرم کے حوالہ سے مغنی میں یہ روایت منقول ہے، میں نے قصداً اس کو اس لئے درج کیا کہ ہندوستان میں بھی تقریبات کے تکلفات میں زیادہ دخل عورتوں کے غلبہ ہی کو ہوتا ہے "عورتیں نہیں مانتیں" گویا یا قدیم تاریخی فقرہ ہے۔

اسی طرح مکانوں کو تصویروں وغیرہ سے آراستہ کرنے کی اسلام میں جو ممانعت ہے کاش اگر دنیا "تصویر کشی" کے مسئلہ میں اسلام کے مشورہ کو مان لیتی تو علاوہ ان اعتقادی و اخلاقی مصائب کے جو تصویروں کی راہ سے دنیا پر نازل ہوئے یا نازل ہو رہے ہیں ایک بڑا زبردست ذریعہ معاشی بچت کا بھی نکل سکتا تھا۔ آج ان ہی تصویروں کی لعنت ہے کہ ممالک متحدہ امریکہ کی دولت کا پانچواں حصہ صرف سینما بازی کے نذر ہو رہا ہے اور وہ تو خیر سودخوار ساہوکاروں کا ملک ہے۔ غلام ہندوستان باوجود اپنی فاقہ مستیوں کے آج جتنی دولت تصاویر بینی پر برباد کر رہا ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے اور لطف یہ ہے کہ دیندار نہیں بلکہ دنیادار حکومتیں اس معاشی غارت گری کی پشت پناہ بنی ہوئی ہیں۔ بخاری و مسلم میں ہے

ان اشدّ الناس عذابا یوم القیمۃ المصورون　　　قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب میں مبتلا ہونے والے تصویر کشوں کی جماعت ہوگی۔

اس کے بعد انسداد تصویر کشی کے لئے اور کیا کہا جاتا۔ قلم سے تصویر کھینچی جائے یا کھینچنے کے کسی اور آلہ سے تعجب ہے کہ اس زمانہ میں بعض لوگ فوٹو اور قلم کی تصویر میں فرق کرتے ہیں۔ حالانکہ قلم والی تصویروں سے وہ معاشی بربادیاں قطعاً بنی آدم پر عائد نہیں ہوئی ہیں جو اس جدید آلہ کی تصویروں سے عائد ہو رہی ہیں۔ اسی سلسلہ کی "چیز" "مکان" کا مسئلہ بھی ہے۔ قرآنی آیت

استعمرکم فیھا　　　اور اللہ تعالیٰ نے اے آدم کے بچو اس زمین میں

تم کو آبادی کا حکم دیا۔

کے متعلق امام ابو بکر حصاص نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں زمین کی عمارت و آبادکاری کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس لئے "عمارت" کا شمار مطالبات واجبہ میں ہے لیکن کیا اس کی بھی کوئی حد ہے؟ قرآن مجید میں

تتخذون مصانع لعلکم تخلدون	تم ایسی عمارتیں بنا رہے ہو، تاکہ تم اس میں ہمیشہ رہو۔

یا

اتبنون بکل ریع ایۃ تعبثون	تم ہر ٹیلے پر نشانیاں بغیر کسی مقصد کے فضول کھڑی کرتے ہو۔

قوم ثمود و عاد کے ذکر میں

وتنحتون من الجبال بیوتاً فرھین	اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو خوش باشی کرتے ہو۔

وغیرہ کے ذریعہ سے "تعمیری حدود" کی طرف اشارے کئے گئے گویا ایسے مکانات جن سے معلوم ہو کہ بنانے والے شائد ہمیشہ ہمیشہ رہنے کے لئے اسے بنا رہے ہیں جیسا کہ پہلی آیت کا اقتضا ہے یا ایسی عمارتیں یا عمارتوں کے اجزا جن کا کوئی فائدہ نہ ہو اسلام کی نگاہ میں بظاہر ناپسندیدہ نظر آتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی مختلف اقوال اسی باب میں پائے جاتے ہیں مثلاً ارشاد ہے

ان المسلم لیوجر فی کل شی ینفقہ	مسلمان جس چیز میں جو کچھ خرچ کرتا ہے
الا فی شی یجعلہ فی التراب	اس میں ثواب ملتا ہے لیکن صرف وہ
(کنز العمال بحوالہ بخاری)	خرچ جو وہ مٹی میں خرچ کرتا ہے۔

کبھی ارشاد ہوتا ہے

اذا لم یبارک الرجل فی مالہ	جب اللہ کسی کے مال میں برکت نہیں دیتا تو

جعلہ فی الطین والتراب اس کے مال کو کیچڑ اور مٹی میں خرچ کراتا ہے۔

(کنز) (بیہقی)

کبھی فرمایا جاتا

من جمع مالا من غیر حقہ سلطہ اللہ علی الماء والطین۔ جو نا جائز ذرائع سے مال اکٹھا کرتا ہی ہے، تو خدا اس کی دولت کو پانی اور کیچڑ میں خرچ کرا دیتا ہے۔

(کنز)

ان تمام روایتوں سے بہر حال تعمیری سلسلہ میں بھی ایک نقطۂ نظر اسلام کا معلوم ہوتا ہے کہ حتی الوسع ایک مرنے والے آدمی کو اسی قسم کا مکان بنانا چاہئے جس سے اس کا جنازہ نکلنے والا ہے باقی اپنی آیندہ نسل کا حیلہ بنا کر لق و دق محلات بنانے والے کیا اتنا خیال نہیں کرتے کہ آخر کتنی پشتوں تک بلکہ زیادہ تر تو بنانے والے کے بعد ہی ورثہ کے ہاتھ کا وہ ایک جوتہ بن جاتا ہے۔ ماسوا اس کے مکان میں "تفاخر" کے جذبات کی کارفرمائی زیادہ موثر انداز میں شروع ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب مدینہ منورہ میں ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے مکان میں کچھ کنگروں کا اضافہ فرمایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ادھر گزر ہوئی دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ فلاں صاحب کی یہ جدت ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہو گئے، صحابیؓ جب آئے تو ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی ان کو محسوس ہوا معلوم ہوا کہ تمھارے مکان کی ان جدت طرازیوں کو دیکھ کر حضورؐ کو تنغص ہوا ہے۔ صحابیؓ اسی وقت اٹھے اور جا کر گرا دیا۔ دوبارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر سے جب گزر ہوا اور مکان کی اس حالت کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ انھوں نے اس کو گرا دیا تو ان کی آپ نے تحسین فرمائی۔ مقصد یہ تھا کہ اگر مکانوں میں جدت طرازیوں کا یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر ع کیں رہ کراں ندارد۔ واقعہ یہ ہے کہ جس ملک و قوم، شہر و دیہات میں یہ عارضہ پھیلا ہے اس نے بالآخر شہریوں کو بدترین معاشی پیچیدگیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔

صحابہ کرام اور بعد کو علماء اسلام نے بھی اس باب میں اس حد تک غلو کیا ہے کہ

مساجد تک میں تزخرف اور رنگ سازی اصفرار واحمرار یعنے زرد و سرخ سے رنگنے تک کو ناپسند کیا ۔حتیٰ کہ حکومت کے روپے کو قدر ضرورت سے زیادہ مسجدوں میں لگانے کی بعض فقہاء نے ممانعت کردی تھی کہ وہ مسلمانوں کا حق ہے لیکن بعد کو علماء نے "شوکت اسلام" کے نقطۂ نظر کو قایم کرکے خصوصاً جب امراء کے مکانات بڑے بڑے بننے لگے اور قرآن کی آیت "فی بیوت اذن اللّٰہ ان ترفع" کے تحت اس کی اجازت دیدی ہے[1] حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب مسجد نبوی میں نقش و نگار والے پتھروں اور ہندوستانی ساگوان کی شہتیریں پہلی دفعہ استعمال کیں تو اس کا صحابہؓ میں بڑا چرچا ہوا بخاری میں ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اس حدیث سے جس میں ہے کہ جیسی مسجد آدمی دنیا میں بنائے گا اسی کی مثل جنت میں اس کو عمارت ملے گی، لوگوں کی تسلی کی کہ اگر معمولی حیثیت کی مسجد بنے گی تو اسی حیثیت کا مکان جنت میں ملے گا۔ بہرحال کچھ بھی ہو اس زمانے میں خواہ اس کو ارتقاء تمدن اور عروج عمران کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہو لیکن میرے خیال میں عام باشندوں کی معاشی حالت کا اندازہ کرکے اسلام نے مکان کے مسئلہ میں لوگوں کی بہت کم ہمت افزائی کی ہے۔ اگرچہ مسلمانوں نے اسلام کے اس معاشی "مشورہ" پر زیادہ توجہ نہ کی۔ اور ہوا جو کچھ ہوا۔

---

[1] آیت قرآنی سورہ نور سے منقول ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "ان گھروں میں اللہ کے جن کے متعلق اللہ نے اجازت دی ہے کہ وہ بلند کئے جائیں"۔

[2] ۔ علامہ ابن المنیر فرماتے ہیں لما شید الناس بیوتھم و زخرفوھا ناسب ان یصنع ذلک بالمساجد صونا لھا عن الاستھانۃ (یعنے جب لوگوں نے اپنے گھروں کو پرشوکت اور آراستہ پیراستہ کرنا شروع کیا تو مناسب معلوم ہوا کہ بے عزتی اور ذلت سے بچانے کے لئے مساجد کے ساتھ بھی اسی طرز عمل کو روا رکھا جائے) فتح الباری صفحہ ۳۶۹ ج ۔

یہاں ایک بات قابل ذکر یہ ضرور ہے کہ تعمیرات کے متعلق باوجود اس نقطۂ نظر رکھنے کے پھر بھی اسلام اس کا حامی ہے کہ جتنی بھی عمارت بنائی جائے صرف استحکام واستواری ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ جمالیاتی حیثیت سے خواہ مخواہ اس کی ضرورت نہیں کہ بلا وجہ مکان کی شکل بھونڈی بنا دی جائے یا اینٹ، چونے، پتھر، گارے کے استعمال میں قصداً بدسلیقگی برتی جائے۔ مسجد نبوی حالانکہ تکلفات سے پاک کرکے بن رہی تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص کرکے اس کے لئے اینٹیں ڈھلوائیں جن سے مسجد بھی بنی، اور حجرات مبارک کی تعمیر بھی ان ہی اینٹوں سے ہوئی۔ مسجد نبوی جس وقت بن رہی تھی تو طلق بن علی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو یمامہ (نجد) کے رہنے والے تھے جہاں کی تعمیری حالت حجاز سے بلند تھی، وہ بھی کام کرنے والوں میں شریک تھے۔ ان کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بار بار فرماتے

قربوا الیمامی من الطین فانہ احسنکم لہ مسًا واشدکم لہ سکبا (مسند احمد)

اس یمامی کے پاس گارا لے جاؤ، کیوں کہ وہ ملنے دلنے اور ڈھانے میں سب سے اچھا ہے۔

طلق کہتے ہیں کہ میں کدال لے کر مٹی اور پانی سے گارا بنا رہا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے طرز عمل کو دیکھتے اور فرماتے کہ

دعوا الحنفی والطین فانہ اضبطکم للطین (رواہ ابن حبان)

گارے کے معاملہ کو اور اس حنفی (بنی حنیفہ سے چونکہ تعلق تھا) چھوڑ دو کیونکہ گارا بنانے میں یہ سب سے زیادہ استوار و ہوشیار ہے۔

طلق نے پھر چاہا کہ دوسرے صحابیوں کے ساتھ اینٹوں کے ڈھونے میں شرکت کریں۔ اجازت چاہی ارشاد ہوا

لا اخلط لھم الطین (ابن حبان)

نہیں تم تو گارا بنانے چلے جاؤ۔

یہاں ایک خیال یہ بھی گزرتا ہے کہ "اسلام" میں "مقابر" کے متعلق جو یہ حکم پایا جاتا ہے یعنے

نھی رسول اللّٰہ صلی علیہ وسلم	منع فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
عن تجصیص القبور والنباء	قبروں کو گچ کرنے سے اور یہ کہ ان پر
علیھا (صحیح مسلم)	مکان بنایا جائے۔

علماء اسلام اگرچہ اس امتناعی حکم کی مصلحت عموماً یہی لکھتے ہیں جس کی طرف وفات کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مشہور فقرہ

لعن اللّٰہ الیھود والنصارٰی	یہود ونصارٰی پر خدا کی لعنت ہو،
اتخذوا قبور انبیاءھم	انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو
مساجد (بخاری)	سجدہ گاہیں بنالیں۔

میں اشارہ فرمایا تھا لیکن اسی کے ساتھ اگر مسلمان اس حکم کو تعمیری کاروبار کے سلسلہ کا ایک معاشی مشورہ بھی قرار دیتے تو خدا ہی جانتا ہے کہ ان کی کمائی ہوئی دولت کی کتنی بڑی مقدار ایک ایسے کام میں صرف ہونے سے بچ جاتی جس سے نہ زندوں کو نفع پہنچا اور نہ بیچارے دفن ہونے والوں ہی کا اس میں کچھ فائدہ ہوا بلکہ پختہ عمارتوں اور سنگین قبروں کی وجہ سے خدا کی زمین کا آج جتنا بڑا حصہ بے کار رکا ہوا ہے غالباً اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء مبارک کی تعمیل کی صورت میں واقعہ کی یہ نوعیت بہت کچھ بدلی ہوئی ہوتی۔

مگر باوجود اس حکم کے اسلام کا اجمالیاتی نقطہ نظر جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے قبروں تک میں باقی رہا ہے۔ پہلے بھی چند حدیثیں اس باب میں درج ہو چکی ہیں، ایک اور حدیث جو قریب قریب ان ہی حدیثوں کے ہم معنی ہے یہاں بھی تبرکاً درج کرتا ہوں۔ روایت یہ ہے کہ کسی قبر میں جو لبن (کچی اینٹیں) لگائی گئی تھیں درمیان میں کچھ خلا باقی رہ گیا تھا، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ

سد داخلال اللبن امان — اینٹ کے درمیان جو شگاف رہ گیا ہے اسے
هذا الیس بشئ ولکنه یطیب بنفس — بند کر دو، اگرچہ یہ ہے تو کچھ نہیں، لیکن زندہ
الحی (کنز العمال) — کے نفس کو اس سے راحت ہوتی ہے۔

"یطیب بنفس الحی" کا یہی مطلب ہے کہ زندوں کے جی کو بھلا معلوم ہوتا ہے اور یہی تو جمالیات کی روح ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ عہد تنزل و تباہی میں بھی اسلامی گھرانوں میں مختلف ذرائع سے جو آمدنیاں آتی ہیں اگر اس دولت کے صرف کرنے میں مسلمان تبذیر اور ریاء الناس جیسے مذموم فعل سے بچتے ہوئے مسلمانوں کے "اصل دار" "العفو" کے قانون پر اور محنت و مزدوری کرنے والے "قوام" کے نظریہ پر تھوڑا بہت بھی عمل پیرا ہوں اور ساتھ ہی مرد اپنے اوپر سونے چاندی کی چیزوں کو رنگین لباس کو اور تعمیری مقابلہ بازیوں کو ترک کرکے اگر اب بھی اپنے آپ کو حد اعتدال میں رکھیں تو عموماً ذرائع معاش سے محروم ہونے کے باوجود قوموں کے درمیان اتنے ہلکے نظر نہ آئیں جتنے اب نظر آتے ہیں۔

اگرچہ انصاف کی ایک بات کا مجھے پھر بھی اعتراف ہی کرنا چاہیئے کہ "اسلام" کے دیئے ہوئے پروگرام سے مسلمانوں کا اتنے دُور ہونے کے باوجود عہد تنزل و انحطاط میں بھی زندگی کے معاشی شعبوں میں ایک خاص حال ہے جس کا اندازہ قوموں سے مقابلہ کرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اس وقت قابل لحاظ دنیا میں تین ہی قسم کے تمدن ہیں ایک یورپ والوں کا ہے اس کے مقابلہ میں ایک تمدن وہ بھی ہے جو خاص مظاہر و آثار کے ساتھ ہمارے ملک کی ایک بڑی آبادی پر طاری ہے یعنے ہم جسے ہندوستانی تمدن کہہ سکتے ہیں، اور تیسرا تمدن مسلمانوں کا ہے ان تینوں تمدنوں کا جب بطور مقابلہ کے موازنہ کیا جائے تو ایک عجیب بات یہ نظر آتی ہے کہ باوجود اتنی بے اعتدالیوں کے پھر بھی نقطۂ اعتدال سے اگر کچھ قریب ہیں تو مسلمان ہی ہیں۔ تفصیل کا تو موقعہ نہیں لیکن

چند مثالوں سے اس کو یوں سمجھا جا سکتا ہے۔

کھانے ہی کے مسئلہ کو لیجئے، ایک مغربی ڈنر کے لئے آپ کو آلو کی ایک ایک قاش اور گوشت کے ہر ہر تکے کے لئے الگ الگ پلیٹوں کی ضرورت ہے۔ گویا ایک اوسط درجہ کا ڈنر جس میں آٹھ دس آدمی سے زیادہ کھانے والے نہ ہوں، جہاں تک میرا خیال ہے کم از کم پندرہ بیس پلیٹوں اور اسی مقدار میں چھری کانٹوں و دیگر لوازم دست شوئی وغیرہ کی ضرورت ہے، اس کے مقابلہ میں ایک اور قوم اسی ملک میں پائی جاتی ہے جو بیسویں صدی عیسوی میں بھی صرف کیلے اور ڈھاک کے پتوں کو اپنی رسوئی جمانے کے لئے کافی سمجھتی ہے۔ شاذ و نادر شکل ہی نہیں بلکہ اب بھی بڑی بڑی تقریبوں میں رسوئی پتوں پر جمائی جاتی ہے اور یہ تو اعلیٰ اور متوسط طبقہ کا حال ہے باقی ادنیٰ طبقوں میں تو یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ زمین میں گڑھا کھود کر اس میں دال سالن ڈال دیا جاتا ہے اور بخوشی ہاتھ کے چمچوں سے ان کو نکال کر نوش جان کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ اگر ان استثنائی قوانین پر نظر ڈالی جائے جن کی وجہ سے لحمیات و قندیات (پیاز، لہسن) وغیرہ کے مصارف سے یہ بے نیاز ہیں۔ یہی حال رہنے سہنے کے مکانوں کا ہے۔ ایک مغربی جوڑے کے لئے کم از کم چھوٹے سے چھوٹے مکان میں اتنی گنجائش ہونی چاہیئے اور اتنے کمرے نکلنے چاہئیں تاکہ ڈرائنگ روم، بڈروم، باتھ روم اور بھی چند روموں اور ان کے ساتھ کچن، آوٹ ہوسز کی ضرورت ہے، گویا آٹھ دس کمروں کے بغیر انسانوں کا ایک جوڑا بھی کسی طرح گذر نہیں کر سکتا۔ اسی کے مقابلہ میں ایک قوم وہ بھی ہے جو افلاس و غربت کی وجہ سے نہیں کیونکہ غربت و افلاس میں آج مسلمانوں کا مدمقابل کون ہو سکتا ہے بلکہ اپنے قومی خصوصیات کی بنیاد پر ان کی اکثریت چند خاندانوں کے ساتھ جسے (اجمالی خاندان) کہتے ہیں ایک ایسے مکان میں بآسانی گزر کرتے ہیں جن میں بمشکل دو تین کمرے بھی رہنے کے قابل ہوں۔ دیوار کا کام زیادہ تر رات کی تاریکی سے لیا جاتا ہے، ایک ایک تخت پر پورا خاندان میاں، بیوی، بہو، بیٹے، داماد اور بیٹی کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔

لباس میں مغربی اقوام کی اگر یہ حالت ہے کہ ہر وقت اور ہر قسم کی تقریب کے لئے خاص وضع خاص قطع اور خاص رنگ کے سوٹ کی ضرورت ہے۔ ایک ایک شخص کے ٹرنک میں اسی لئے پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ جوڑے مختلف اوقات و تقریبات کے لئے محفوظ رہتے ہیں۔ صرف جوتے خانوں میں مختلف شکلوں، رنگوں کے جوتوں کی قطار اندر قطار نظر آتی ہے۔ چھڑیوں کے گٹھے کونوں میں رکھے ہوتے ہیں۔ مغرب کے مقابلہ میں مشرق کی مدمقابل قوم کا حال اسی سے ظاہر ہے کہ نوے فی صدی اس قوم کے افراد جوتوں سے بے نیاز ہیں۔ لباس میں بہ مشکل چیند کرتے، دھوتیاں زیادہ تر ایک سے بہ مشکل زیادہ۔ اچھے اچھوں، کھاتے پیتوں کے پاس آپ کو ملیں گی۔ بیسویں صدی میں اب تک سلائی اور کتربیونت کے جھگڑوں سے ان کی اکثریت بے نیاز ہے۔ بستر میں تو شک، تکیہ، چادر کی ضرورت حذف کر دی گئی ہے، کوئی معمولی دری یا کمبل ان تمام ضرورتوں کی قائم مقامی کے لئے موجود ہے جو گرمی، برسات، جاڑے میں کسی انسان کو پیش آسکتی ہیں۔

الغرض خوراک، مکان، لباس صرف ان ہی چند شعبوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو بلا مبالغہ ان میں ایک قوم ثریٰ میں اور دوسری ثریا، یا ایک اکاش اور دوسری پاتال میں کھڑی نظر آتی ہے۔ اب ان ہی دونوں کے ساتھ مشرق و مغرب کے مختلف علاقوں میں ایک وہ قوم بھی رہتی ہے جو اپنے پیغمبرؐ کی زبان مبارک سے "اُمت وسط" کے آسمانی لقب سے ملقب ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا اس "وسطیت" کا مغز تو مدت ہوئی اس قوم سے نکل چکا ہے لیکن اس وقت تک جو چھلکا اس تعلیم کا ان کی زندگی کے مختلف قالبوں پر چڑھا ہوا ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ کھانا ہو یا پینا، پہننا ہو یا رہنا زندگی کے ان تمام معاشی شعبوں میں ہر منصف مزاج آدمی کو مختلف جہات سے اب بھی نسبتاً وسط ہی میں یہ قوم کھڑی نظر آسکتی ہے، نہ مسلمانوں کو ایک ایک معمولی ڈنر کے لئے چالیس چالیس پلیٹوں اور ساٹھ ساٹھ، ستر ستر چھری کانٹوں کی ضرورت ہے اور نہ وہ اتنے پست ہیں کہ ہتوں میں کھاتے ہوں۔ پیتل کی جو تعالی وا دانے چھوڑی ہو اسی میں پوتے کی بھی رسوئی جمتی ہو نہ ہر کام

کے لئے نہ ان کو الگ الگ مکان اور مرصع کمرہ کی ضرورت ہے اور نہ ان کا یہ حال ہے کہ ایک ایک کوٹھری میں تین تین پشت تک پیدا ہوتے اور مرتے چلے جاتے ہیں، نہ ہر وقت اور ہر تقریب کے لئے ان کو الگ ٹائی الگ کوٹ، علٰحدہ پتلون، نئے قسم کے جوتے کی ضرورت ہے'' اور نہ وہ ایک ایک جوڑے، بن سلی وصوتی میں پورا سال بسر کرنے کے عادی ہیں۔ نہ وہ شراب اور ستور کی چربی کھا کھا کر اعصابی ہیجانوں کو اپنے قابو میں رکھنے سے عاجز ہیں، اور نہ صرف دال بھات اور گھاس پات کھا کھا کر انسانیت کے بعض قیمتی عناصر کو ضائع کر رہے ہیں۔ میں نے یہ چند مثالیں صرف تفہیم کے لئے دی ہیں ورنہ میرا دعویٰ ہے کہ اتنے دُور ہو جانے کے باوجود بھی بحمد اللہ مسلمان اپنے ''دین وسط'' کے بچے کھچے اثرات کے نتائج سے اب بھی خالی نہیں ہیں۔ اس سے توقع پیدا ہوتی ہے کہ اگر معاشیات کے صحیح نظام کو موجودہ زمانہ کی تعبیروں میں ان کے سامنے پیش کیا جائے جو ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو وراثت میں ملا ہے اور بجائے سینوں کے اب صرف سفینوں میں باقی رہ گیا ہے'' اور وہ بھی ایسے لباس میں کہ تعبیرات کی تبدیلیاں ان کی حقیقی قیمتوں تک نگاہوں کے پہنچنے میں مزاحم ہوتی ہیں۔ تو غالباً جتنی آسانی کے ساتھ اس قالب میں آپ کو وہ ڈھال سکتے ہیں دوسری قوموں سے کامیابی کے ساتھ اتنی توقع نہیں کی جاسکتی

ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً شاید اس کے بعد حق تعالیٰ کوئی نئی بات پیدا کریں۔

''صرف دولت'' کی بحث جس کے تذکرہ میں عمداً مجھے انتہائی اجمال سے کام لینا پڑا کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو اب مقالہ مقالہ نہیں کتاب بن جاتی، اب اسی نقطہ پر اس کو ختم کرتا ہوں لیکن ختم کرنے سے پہلے اسی ''صرف دولت'' کے ایک قرآنی قانون کا تذکرہ اس سلسلہ میں ضروری معلوم ہوتا ہے اور اسی مسئلہ پر بس اس مقالہ کا انشاء اللہ خاتمہ ہوگا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا دولت کمانے کے متعلق اسلام نے جہاں چند قیود و شرائط عائد

گئے ہیں "صرف دولت" کے متعلق بھی اس نے کچھ حدود اور نشانات مقرر کر دیئے ہیں ان ہی حدود و نشانات کی تعبیر تبذیر و اسراف، "قانون العفو" "قانون قوام" "مسئلہ ربا" "ان الناس" وغیرہ ہے بظاہر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں صرف دولت کے ان قوانین کی حیثیت صرف دینی مسائل کی ہے، یعنی جو ان کی پابندی کرے گا خدا کی خوشنودی حاصل کر کے آخرت میں مستحق ثواب و اجر ہوگا، جو خلاف ورزی کرے گا خدا کے عتاب اور عقاب کی مجازاتی و مکافاتی نتائج میں مبتلا ہوگا گویا خدا اور بندے کے درمیان کا معاملہ ہے۔ دوسروں کو یا حکومت کو مال اور صاحب مال کے متعلق کسی دخل اندازی کا حق نہیں ہے زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو وعظ و پند کے ذریعہ سے روکا جائے یعنی نہی عن المنکر کے عام قانون کے تحت اگر کوئی تعرض کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلام اسی پر قناعت کر لیتا تو دوسرے مذاہب و دیانات کے جو رجحانات دنیا اور دولت دنیا کے متعلق عام طور سے پائے جاتے ہیں: مثلاً

دولت مند کا آسمانی بادشاہی میں داخل ہونا
مشکل ہے۔ متی باب $\frac{19}{23}$

اور صرف مشکل ہی نہیں بلکہ

تم سے پھر کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے
میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند
خدا کی بادشاہی میں داخل ہو۔ متی باب $\frac{19}{24}$

اور غلط سمجھا گیا یا صحیح لیکن باور یہی کرایا گیا کہ جہاں تک روپے پیسے کے سانپ بچھوؤں کو اپنے گھر سے باہر کوئی نکال سکتا ہو نکالے اور مایہ کے اس جنجال کو جتنی قوت کے ساتھ توڑ سکتا ہو توڑے۔ مایہ ہی سے نہیں بلکہ اپنے اندر سے بھی جو مال و دولت کی تمنا اور آرزو کو نکالے گا وہی "نروانا" کا مستحق ہو سکتا ہے[۱]۔ مشرقی و مغربی مذاہب و ادیان میں جب عام طور سے دولت

---

[۱] مذکورہ بالا نظریات مسیحیت (دین مغربی) ویدک دھرم بودھ ازم (مشرقی مذاہب) کے اساسی نظریات کی طرف اشارہ ہے ۱۲

کے متعلق یہ خیال مسلط تھا اس وقت قرآن کا دولت کی حفاظت اور صحیح استعمال کے لئے اجمالی ہی نہیں بلکہ تفصیلی رنگ میں ایک مستقل نظام پیش کرنا اس کی تعلیم کی اختصاصی بلندیوں کے ثبوت کے لئے کافی تھا۔

مگر جو دین اپنی کاملیت کا مدعی ہے اور اپنے بعد اس نے دنیا کو آئندہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کسی جدید پیغام اور نئے نظام کے پیش ہونے سے مایوس کر دیا ہو اس کے تکمیلی و اختتامی کام کو صرف اسی نقطہ پر ٹھہرنا نہ چاہیئے تھا اور یہی واقعہ بھی ہے کہ وہ نہیں ٹھہرا ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح بہت سے اخلاقی اور اجتماعی جرائم کو دینی حیثیت سے گناہ یا حرام قرار دیتے ہوئے اس کو حکومت کا جرم بھی قرار دیا ہے اور ان پر دار و گیر اسلامی حکومت کا فریضہ ٹھہرایا ہے، مثلاً زنا، چوری، قتل کے لئے اس نے باضابطہ قانونی سزائیں مقرر کی ہیں اور یہ چیز اسلام کی خصوصیت نہیں ہے لیکن حیرت اس پر ہے کہ ان اخلاقی و اجتماعی جرائم کے ساتھ غالباً اسلام ہی پہلا مذہب ہے جس نے معاشی جرائم کو بھی حکومت کا جرم قرار دے کر باضابطہ اس کے لئے قانونی سزا تجویز کی ہے۔ اسلام میں معاشیات اور معاشیاتی مسائل کو کتنی اہمیت حاصل ہے منجملہ دیگر شواہد کے ایک بڑی دلیل اس کا یہ طرز عمل بھی ہو سکتا ہے۔

فقہ یا حدیث میں نہیں بلکہ باضابطہ قرآن مجید میں اس کے متعلق ایک "قانون" عطا کیا گیا اور یہ وہی قانون ہے جسے ہم "سورہ النسا" کی اس آیت میں پاتے ہیں ارشاد ہے

ولا تؤتوا السفهاء اموالكم التي جعل الله لكم قياماً — اور کم عقلوں کو اپنے اموال حوالہ نہ کرو جن میں خدا تمہارے قیام کی قوت رکھی ہے۔

بظاہر مندرجہ بالا آیت میں مسلمانوں کو اسی طریقہ سے خطاب کیا گیا ہے جس طرح "سرقہ" کی سزا کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا گیا

السارق والسارقة فاقطعوا ايديهما — چور اور چورنی، پس کاٹ دو ان کے دونوں ہاتھ۔

یا زنا کے متعلق

الزانیة والزانی فاجلد واکل	زنا کرنے والے، زنا کرانے والی پس کوڑے
واحد منھا	ماروان میں ہر ایک کو۔

وغیرہ میں خطاب گو عام مسلمانوں کو ہے لیکن عملی تکلیف مسلمانوں کی اس سیاسی اور اجتماعی قوت کو ہے جو تعزیر و حدود و قصاص کو نافذ کرسکتی ہو یعنی مسلمانوں کی حکومت مخاطب ہے۔ ٹھیک اسی طریقہ سے مندرجہ بالا آیت میں حکم دیا گیا۔

کہ اموال خواہ وہ انفرادی طور پر کسی کی ملک میں ہوں لیکن جب ملک کی وہ دولت ہے تو سارے باشندگان ملک کا وہ مال اس لحاظ سے ہے کہ اس کی حفاظت و نگرانی کی جائے اور اس لئے حکم دیا گیا کہ اس مال کو ایسے لوگوں کے حوالہ نہ کرو جو "السفھاء" ہوں "السفھاء" سفیہ کی جمع ہے۔ سفیہ کا مادہ سفہ ہے سفہ کی تعریف اسلامی قانون میں یہ کی گئی ہے

السفہ نوعان احدھما لخفة	سفاہت کی دو قسمیں ہیں، ان میں ایک قسم تو
فی العقل وکان بسببہ القلب لا	وہ ہے کہ کسی کی عقل میں ضعف اور سبکی ہو،
یھتدی الی التصرفات	اور اس کی وجہ سے اس کا دل صحیح تصرفات
(تکملہ بحرالرائق ج ۸ ص ۶	کی طرف راہنمائی نہ کرتا ہو۔

یہ تو سفہ کی پہلی قسم ہوئی

والثانی ان یکون سفیھا مضیعاً	دوسری قسم وہ ہے کہ وہ ایسا سفیہ و
لمالہ اما فی التبذیر بان یجمع	نادان ہو جو اپنا مال برباد کرتا ہو خواہ پینے
اھل الشر والفساد فی دارہ	پلانے میں مثلاً یا جی بدمعاش لوگوں کو اپنے
یطعمھم و یسقیھم	گھر میں جمع کرے انھیں کھلائے پلائے اور
یصرف باب الجائزہ والعطاء	انعام و اکرام کے دروازے ان پر
علیھم	کھولے۔

(تکملہ بحرالرائق ج ۸ ص ۶)

گویا پہلی صورت "اسراف" کی ہوئی اور دوسری صورت "تبذیر" کی۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کا یہ حکم ہے کہ ملک کا جو باشندہ مندرجہ بالا معاشی عوارض میں مبتلا ہو جائے اور "صرف دولت" کے مقررہ قوانین سے تجاوز کر رہا ہو تو ان کے اختیار سے ان کا مال لے لیا جائے لیکن کون لے اور لینے کے بعد پھر ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے چونکہ اس حکم کی مخاطب حکومت ہے اس لئے اس کا فقہاء اسلام نے یہی مطلب لیا ہے کہ حکومت محکمۂ عدالت یعنی محکمۂ قضاء کے ذریعہ ان کے مال کو اپنے چارج میں لے لے اور ان پر نگرانی قائم کر دے اصطلاحاً حکومت کے اس فعل کو اسلامی قانون میں "الحجر" کا قانون کہتے ہیں بحرالرائق میں ہے کہ مذکورہ بالا صفات جس شخص میں پائے جائیں

فیحجر علیه القاضی	اس پر حجر کا قانون عائد کر دے۔

(صـ۹۱)

لغت میں "حجر" کے معنی روکنے کے ہیں لیکن قانونی اصطلاح میں حکومت کے اس حکم کی تعبیر ہے جس کے بعد "قولی وفعلی تصرفات" اور کاروبار پر کسی کے قانونی روک عائد کی جائے "السفہا" پر حجر کا قانون جب نافذ کیا جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ

فلا ینفذ بیعه وشراءه وهبته و	اس کی خرید و فروخت، لین دین، ھبہ صدقہ
صدقته وما اشبه ذلک من	اور ایسے سارے تصرفات جن میں شکست و
التصرفات اللتی تحتمل النقض	فسخ کی گنجائش ہو، نافذ نہیں ہوتے۔
والفسخ بدائع صـ۱۷۱ ج ۷	

ایسا آدمی فقہی اصطلاح میں "محجور" کہلاتا ہے "سفاہت" کی جو تعریف پہلے بیان کی گئی اگر ان ہی صفات کے ساتھ کوئی سن بلوغ کو پہنچ جائے اور سفاہت کے صفات پھر بھی اس میں پائے جاتے ہوں تو تمام آئمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ حکومت اس پر "حجر" کا قانون عائد کر کے اس کے مال اور جائداد کو اپنی نگرانی میں لے لے اور جب تک "رشد" کا احساس اس سے نہ ہو مال پر تصرف نہ عطا کیا جائے۔

صاحب بحرالرائق لکھتے ہیں

وھذا عند الامام وعندھما لا یرفع الیہ مالہ حتی یونس منہ الرشد ولا یجوز التصرف منہ (جلد ۲ ص ۹۴)۔	یہ امام صاحب کا مذہب ہے اور ان کے دونوں تلامذہ (محمد و ابو یوسف) کا خیال ہے کہ جب تک رشد کا احساس اس سے نہ ہو، اس کا مال اس کے تصرف میں نہ دیا جائے اور نہ تصرفات کی اس کے جائز ہوں گے۔

اور یہ ضابطہ قرآن کی آیت

حتی آنستم منھم رشدا	جب تک ان سے "رشد" کے آثار تم پر ظاہر نہ ہوں۔

سے ماخوذ ہے البتہ "رشد" کے معنی میں اختلاف ہے۔ لغوی معنی اس کے تو "سوجھ بوجھ" کے ہیں لیکن امام ابو حنیفہ عمر کے ساتھ اس کو وابستہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ

یمنع عنہ مالہ الی خمس و عشرین سنتہ (بدائع)	اپنے مال سے وہ پچیس سال کی عمر تک روکا جائے گا۔

لیکن ان کے دونوں "تلامذہ" قاضی ابو یوسف امام محمد بن حسن بجائے عمر اور سن کے "رشد" کے واقعی علامات پر "قانون حجر" کے ارتفاع کو مبنی سمجھتے ہیں یعنی خواہ اس کی عمر کتنی ہی کچھ ہوگئی ہو لیکن جب تک سفاہت کے علامات اس میں پائے جائیں گے "حکومت" "حجر" کو باقی رکھے گی اور مال و جائداد اس کے سپرد نہیں کی جائے گی۔ ہدایہ میں ہے

وقالا لا یدفع الیہ مالہ ابدا حتی یونس رشدہ ولا یجوز تصرفہ فیہ (کتاب الحجر)	دونوں حضرات فرماتے ہیں، کہ اس کا مال اسے کبھی نہ حوالہ کیا جائے گا جب تک اس سے رشد کے آثار کا پتہ نہ چلے، اور نہ اس کے تصرفات جائز ہوں گے۔

یہ تو اس وقت ہے جب سفاہت کی صفات کے ساتھ کوئی بالغ ہوا ہو لیکن بالغ جس وقت

ہوا تھا اگر اس وقت اس کی حالت اچھی تھی پھر بُری صحبتوں یا کسی اور وجہ سے سفاہت کے کام کرنے لگا تو اس وقت امام ابو حنیفہ اگر چہ "حجر" کی ضرورت محسوس نہیں کرتے لیکن ان کے دونوں شاگرد محمد بن حسن و قاضی ابو یوسف، امام شافعی سب کے سب قائل ہیں کہ "حجر" کے تحت بزور لایا جائے گا، ہدایہ کا متن ہے

قال ابو یوسف ومحمد وهو قول الشافعي الحجر على السفيه ويمنع من التصرف في ماله	قاضی ابو یوسف، امام محمد اور یہی امام شافعی کا قول ہے کہ اس قسم کے سفیہ پر بھی حجر کا قانون لگایا جائے اور اپنے مال میں تصرف کرنے سے روک دیا جائے گا۔

تکملہ بحر الرائق میں فتاوی بزازیہ سے نقل کیا ہے کہ حجر کے تحت

السفيه والمغفل والمديون على قولهما وعليه الفتوى كما في البزازيه ص۸۹	اسفیہ اور مغفل (بدحواس) اور مقروض سب پر حجر کا قانون امام محمد و ابو یوسف کی رائے کے مطابق عائد کیا جائے گا اسی پر فتویٰ ہے جیسا کہ فتاوی بزازیہ میں ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ ہر قسم کے "سفیہ" پر "حجر" کا قانون اس وقت تک حکومت کو عائد کئے رہنا چاہیئے جب تک اس میں سفاہت کے صفات بالا پائے جاتے ہوں۔ علامہ طوری نے سچ لکھا ہے کہ گو "حجر" سزا کی صورت ہے لیکن واقع میں

في الحجر شفقة على خلق الله وهي احد طرفي الديانة والاخر التعظيم لامر الله (ج ۸، ص۸۸ تکملہ بحر)	حجر اللہ کی مخلوق پر مہربانی ہے اور خلق خدا پر مہربانی مذہب کا بڑا حصہ ہے۔ نیز حق تعالیٰ کے احکام (متعلقہ بہ مال) کا احترام ہے۔

مالی تصرفات کی سفاہت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بُرے کام ہی میں اپنا مال برباد کرتا ہو بلکہ فقہاء نے یہاں تک تصریح کردی ہے کہ اگر وہ اپنا مال برباد کرتا ہو

فی الخیرات بان جمع مالہ فی بناء مسجد واشباھہ فیحجر القاضی (ص ۹۱)	نیک کاموں میں بایں طور کہ اپنے کل مال کو جمع کرکے مسجد بنانے لگے یا اسی قسم کی کوئی اچھی بات تو قاضی اس پر بھی حجر کرے گا۔

جو لوگ قرآنی آیت "قل العفو" کی تفسیر کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اپنے اور اپنے بال بچوں کے ضروری مصارف پر خرچ کرنے کے بعد جو کچھ بچ جائے اس کو خرچ کر دینے کا اس میں حکم ہے ان کو اسلامی قانون کے اس دفعہ پر غور کرنا چاہیئے کہ مسجد تک کے بنانے پر بھی اگر کوئی اپنا سارا مال صرف کر دے گا تو قانون حجر کی رو سے معاشی مجرم قرار پاکر حکومت کی نگرانی میں چلا جائے گا۔ اگر یہ قانون صحیح ہے تو قرآن کے "العفو" پر عمل کرنے والے کو فقہاء مجرم کیوں قرار دیتے ہیں اور کیسا مجرم جس کے مال و جائداد کو حکومت اس کے قبضہ سے چھین کر اپنی نگرانی میں لے لے اور تمام ملک میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ آئندہ سے اس شخص کے مالی تصرفات مثلاً خرید و فروخت، صدقہ، ہبہ وغیرہ سب ناجائز قرار دیئے جاتے ہیں جو ان سے ایسا معاملہ کرے گا وہ نقصان اٹھائے گا۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مالی تصرفات میں سفاہت کے ارتکاب کرنے والوں پر حکومت کی دراندازی اس پر موقوف نہیں ہے کہ کوئی ان کی سفاہت کے متعلق حکومت میں دعوئی دائر کرے بلکہ اس دعوے کی مدعی خود حکومت ہوتی ہے۔ محیط سے طوری نے نقل کیا ہے کہ

القضاء بالحجر لیس بقضاء بل فتوی بعدم شرائط القضاء وھی الدعوی والانکار (ص ۹۱)	"حجر" کا حکم جو کسی پر دیا جاتا ہے تو یہ قضاء اور فیصلہ نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت فتوئی کی ہے کیونکہ قضاء کے لئے تو دعوئی اور انکار دعوئی کی ضرورت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ملک کے باشندوں میں جو شخص بھی صرف دولت کے متعلق سفاہت کے

معاشی جرم میں مبتلا نظر آئے حکومت کا فرض ہے کہ فوراً اس کو طلب کر کے واقعات کی تحقیق کے بعد اس کی جائداد اور اموال کو اپنے قبضہ میں لے لے اور اس شخص کے متعلق عام اعلان کر دیا جائے کہ تمام مالی تصرفات اس کے غیر قانونی ہیں البتہ خود اس کے اور اس کے اہل و عیال کے مصارف کے لئے حکومت اپنے صوابدید سے کچھ معینہ رقم معین کر دے۔ طوری لکھتے ہیں

و ینفق علیه و علی ولده و علی زوجته و من تجب ... النفقه من ذوی الرحامه من ماله لان احیاء ولده و زوجته من حوائجه الاصلیه والانفاق علی ذوی الارحام واجب علیه حقا لقرابته والسفه لا یبطل حقوق الناس ولا حقوق الله تعالی (تکملہ ج ۷ ص ۹۳)	حکومت (اسی کی جائداد) سے خود اس پر اس کے بچوں پر بیوی پر اور جن رشتہ داروں کا نفقہ اس پر واجب ہوا خرچ کرے گی کیونکہ اس کے بچوں اور بیوی کا زندہ رکھنا اسکی حقیقی ضرورتوں میں سے ہے اور رشتہ داروں پر خرچ کرنا اس کی قرابت کی وجہ سے واجب ہے۔ وجہ یہ ہے کہ "سفاہت" سے نہ انسانوں کے حقوق باطل ہوتے ہیں اور نہ خدا کے۔

اور یہ دفعہ دراصل قرآن کے الفاظ

وارزقوهم فیها واکسوهم وقولوا لهم قولا معروفا۔ (النساء)	اور کھلاؤ ان کو اور پہناؤ اسی مال سے اور ان کو اچھی بات کے ساتھ خطاب کیا کرو۔

کی تفسیر و تشریح ہے "فقہاء" نے اس کی بڑی تفصیل کی ہے کہ علاج و معالجہ سیر و تفریح حج و زیارت و خیر و خیرات وغیرہ کے سلسلہ میں اس کو دیا جائے یا نہ دیا جائے دیا جائے تو کتنا دیا جائے اور کس ذریعہ سے دیا جائے براہ راست دیا جائے یا کسی معتبر نگران کے حوالہ کیا جائے کہ حسب ضرورت اس پر صرف کرے۔ اس کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔

بہر حال چونکہ قرآن نے "السفہاء" کے لئے "حجر" کا حکم حکومت کو دیا اور سفاہت میں زیادہ دخل بدعقلی ہی کو ہوتی ہے اس لئے فقہاء اسلام نے علاوہ ان معاشی مجرموں کے اسی لئے کہ ان میں بھی مالی تصرفات کے لئے جس عقل وشعور کی ضرورت ہے نہیں ہوتی اس قانون کو رعایا کے اور چند طبقات کے لئے بھی عام کر دیا ہے۔ یعنی جیسے جنون ہو، مغلوب الحال ہو، مدہوش ہو، فاسد العقل ہو، معتوہ ہو، معتوہ دراصل ایک قسم کے مجنون ہی کو کہتے ہیں۔ یعنی

قلیل الفہم فاسد التدبیر	کم سمجھ اور الٹی پلٹی تدبیریں کرنے والا تو وہ
الا انہ لا یضر ولا یشتم	ہے لیکن نہ ضرر پہنچاتا ہے اور نہ گالی گلوچ کرتا
(ص۸۹)	ہے۔

اسی طرح جو نابالغ ہو اور اس کا ولی نہ ہو تو حکومت اس کی جائداد کو بھی بلوغ تک اپنی نگرانی میں لے لے گی۔ یوں ہی باوجود استطاعت کے جو لوگوں کے قرض ادا کرنے سے گریز کرتا ہو یا قرض خواہوں کو جس کے متعلق اندیشہ ہو کہ اگر اس کو اپنے مال میں تصرف کی اجازت دی جائے گی تو ہمارا قرض ممکن ہے کہ ڈوب جائے یا اندیشہ ہو کہ مال کو دوسرے کے نام منتقل کر دے گا یا مقروض ہوا ور قرض خواہ حکومت میں درخواست دیں کہ اس کی جائداد سے ہمارے قرض کی ادائی کا سامان کیا جائے۔ ان تمام صورتوں میں کبھی دعوی کے بعد اور کبھی بغیر دعوی کے حکومت کو "حجر" کا اختیار ہے جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں سینکڑوں دفعات کے ذیل میں کی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی حضرت معاذ بن جبل صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ قرض میں ان کی ساری جائداد مستغرق ہوئی، قرض خواہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان کی جائداد سے ہمارا قرض ادا کر دیا جائے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ

انہ علیہ السلام حجر علی معاذ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ پر

وقسم ماله لغرمائه	حجر کا قانون نافذ کردیا اور ان کے مال
(تکملہ ج ، ص۳۳)	ان کے قرض خواہوں میں بانٹ دیا۔

گویا حکومت کو اس قسم کے اختیارات دوسرے کے اموال پر خاص حالات میں حاصل ہیں اس کا یہ عملی ثبوت تھا۔

اب میرا یہ مضمون ختم ہوتا ہے۔ آج یورپ "کورٹ آف وارڈس" کے نام سے ایک قسم کے جدید محکمہ کے اضافہ کے ساتھ ہمارے ملک میں ظاہر ہوا ہے، عموماً سمجھا جاتا ہے کہ یہ بھی مغرب کے تحائف جدیدہ میں کوئی جدید سوغات ہے لیکن یہ سب اسی وقت ہمیں سمجھایا گیا اور یہ سمجھنے پر مجبور رہوئے جب اپنا جو کچھ تھا سب بھلا دیا گیا۔ جامعات سے ہمارے علوم مذہب کے نام سے موسوم کرکے خارج کر دیئے گئے اور اس علم کے جاننے کے جرم میں رزق کے دروازے ان پر مسدود ہوئے ایسی حالت میں جو کچھ بھی نہ سمجھایا جائے اور ہم جو کچھ نہ سمجھ لیں سب ہی کا کافی موقعہ ہے۔ مگر گذشتہ چند صفحات میں جس قانون کا مجمل ترین خلاصہ پیش کیا گیا ہے کیا انصاف کرنے والے کہہ سکتے ہیں کہ واقعی "کورٹ آف وارڈز" کے محکمے یورپ کے اختراعات میں سے ہیں۔

میں آخر میں تبرکاً وتیمناً اپنے اس بیان کو بخاری شریف کی اس حدیث پر ختم کرتا ہوں

عن مغيرة بن شعبة رضي الله تعالیٰ عنه	مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ
عن رسول الله صلى الله عليه وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا نے تم پر
قال ان الله حرم عليكم عقوق الامهات	حرام کیا ماؤں کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ
ووأد البنات ومنع وهات وكره لكم	درگور کرنا اور خود نہ دینا اور دوسروں سے کہنا
ثلاثاً قيل وقال وكثرة السوال و	کہ "لائے جاؤ" اور ناپسند کیا اللہ نے تمہارے لئے
"اضاعة المال" (رواه البخاری ومسلم)	تین باتیں قیل وقال کو کثرت سوال کو اور "مال کے برباد کرنے کو"

والله يقول الحق وهو يهدى السبيل وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين

برطانوی دستور میں ہاؤس آف کامنز کی اہمیت

(بسلسلۂ گذشتہ)

ملک کے نظم و نسق کے لئے جن اخراجات کی ضرورت ہوتی ہے ان کا مہیا کرنا ہاؤس آف کامنز کا خاص حق ہے جس سے اس ایوان کا قدیم مدمقابل ہاؤس آف لارڈز محروم کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس حق کو رکھنے کے باوجود ہاؤس آف کامنز کو عملی طور پر مالیاتی معاملات میں زیادہ دخل حاصل نہیں ہے بلکہ اس کے مالی اختیارات کو کابینہ استعمال کرتی ہے۔ اصولی طور پر سب سے پہلے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہاؤس آف کامنز میں کسی ایسی مالیاتی تجویز پر غور نہیں کیا جا سکتا جو کابینہ کی طرف سے پیش نہ کی گئی ہو۔ پچھلے زمانے میں ہاؤس آف کامنز کو مالیات کے معاملوں میں جو دخل حاصل تھا اس کو وہ عاملہ کی روک تھام کے لئے استعمال کیا کرتا تھا۔ لیکن اب حالت یہ ہے کہ ہر سال کروڑوں پونڈ کی منظوری ہاؤس آف کامنز میں بغیر کسی بحث و تنقید کے ہو جاتی ہے۔ مالیات کے متعلق جملہ تجاویز ٹریژری کی جانب سے پیش کی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کابینہ جب بجٹ تیار کرتی ہے تو وہ اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہاؤس آف کامنز میں وہ منظور نہ ہو جائے۔ بغیر ہاؤس آف کامنز کی منظوری کے کابینہ کوئی محصول عاید کرنے، قرض لینے یا اخراجات منظور کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ سالانہ بجٹ کی منظوری یا اس کے علاوہ دوسری مالیاتی تجاویز جب تک ہاؤس آف کامنز میں منظور نہ ہولیں ملک کے نظم و نسق کی مشین نہیں چلائی جا سکتی۔ جب بجٹ پیش ہوتا ہے تو ہاؤس آف کامنز کے ارکان اس کے پوری طرح مجاز ہیں کہ وہ متعلقہ وزیروں سے

دریافت کریں کہ ان کے محکموں کے اخراجات کے لئے اتنی رقم کیوں درکار ہے؟ ہر محکمے کے اخراجات کی باقاعدہ سرکاری تنقیح کی جاتی ہے تاکہ اس امر کا تعین ہو سکے کہ پارلیمنٹ کی منظور کی ہوئی رقوم بے جا طور پر تو نہیں خرچ کی گئیں۔ اس غرض کے لئے صدر محاسب (آڈیٹر جنرل) کا مستقل محکمہ موجود ہے اور جس کا عہدہ ججوں کی طرح بڑی حد تک حکومت کے اثر سے آزاد رکھا جاتا ہے۔

لیکن اس کے ماسوا ہاؤس آف کامنز کے ۱۵ ارکان کی ایک کمیٹی ہر سال مقرر کی جاتی ہے جس کے ذمہ حسابات کی تنقیح ہوتی ہے۔ اس کمیٹی کا صدر اس جماعت کا رکن نہیں ہوتا جو برسر اقتدار ہے اور جس کو ہاؤس آف کامنز میں اکثریت حاصل ہے بلکہ وہ مخالف جماعت کا کوئی ذی وجاہت رکن ہوتا ہے۔ اس کمیٹی کو کمیٹی آف پبلک اکاؤنٹس کہتے ہیں۔

یہ کام حکومت وقت کا ہے کہ وہ اس امر کا تعین کرے کہ سال رواں کے لئے اس کو کس قدر رقم ملکی نظم و نسق کو چلانے کے لئے درکار ہوگی۔ چنانچہ اسی کے مطابق حکومت اس کا تعین کرتی ہے کہ کن کن ذرائع سے کتنی کتنی رقم حاصل کی جائے تاکہ نظم و نسق کے جملہ اخراجات کی کفالت ہو سکے۔ تمام سرکاری اخراجات کا تخمینہ ہر سال نئے سرے سے نہیں بنایا جاتا۔ بعض اخراجات مستقل حیثیت رکھتے ہیں جیسے شاہی اخراجات، ججوں کی تنخواہیں اور پنشنیں، قومی قرضہ کا سود وغیرہ۔ ان کے علاوہ فوج، بحریہ، فضائی بیڑا اور سول سروس کی تنخواہیں بھی مستقل اخراجات میں شمار ہوتی ہیں اگرچہ ان کے تخمینہ میں سال بہ سال حالات و ضروریات کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جب سال بھر کے اخراجات کا تخمینہ تیار کیا جاتا ہے تو جس محکمہ کو نئے اخراجات کرنا ہوتے ہیں اس کے نمائندے ٹریژری کے نمائندوں سے ملتے ہیں اور تفصیلات اور اپنی تجاویز کے متعلقات پر بحث کر لیتے ہیں۔ بعض اہم مسائل جیسے تعمیر مکانات کی کوئی نئی اسکیم یا بین الاقوامی صورت حال کے بگڑنے کے سبب سے اسلحہ جنگ کی تیاری اور مزید فوج بھرتی کرنے کے لئے نئے اخراجات کی منظوری ایسے معاملے ہیں جن کا تصفیہ کابینہ کرتی ہے۔ معمولاً ٹریژری حکومت کے ہر محکمہ کو گشتی بھیجتی ہے اور اس کے مطالبات کا تخمینہ طلب کرتی ہے۔ اس امر کی محکموں کو تاکید کی جاتی

ہے کہ وہ سال گزشتہ کے اخراجات واعداد کو بعینہ قائم رکھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ اپنی ضروریات کے مطابق نئے تخمینے تیار کریں۔ اگر گزشتہ سال کے تخمینے میں کوئی خاص تبدیلیاں کی جا رہی ہوں تو ضروری ہے کہ متعلقہ محکمہ ٹریژری کو اس کی نسبت اطلاع کردے اور اس کی رائے حاصل کرلے بیشتر اس کے کہ اس محکمہ کا تخمینہ مکمل ہو کر ٹریژری کو بھیجا جائے۔ اگر ٹریژری محکمہ کے تخمینہ کی کسی تبدیلی کو ناپسند کرتی ہے تو ممکن ہے معاملہ کابینہ کے سامنے پیش ہو بشرطیکہ اس معاملہ کو غیر معمولی قومی اہمیت حاصل ہو ورنہ معمولاً ٹریژری کی رائے قطعی تصور کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سرکاری محکمے اپنے تخمینہ جات مکمل کر کے ٹریژری کو بھیجتے ہیں تو درحقیقت وہ پہلے سے ٹریژری کے منشا کو ان کے متعلق معلوم کر لیتے ہیں۔ مختلف محکموں کے جو تخمینہ جات اور وہ مستقل اخراجات جو "کنسالی ڈیٹڈ فنڈ سروس" کے نام سے موسوم ہیں سال بھر کے کل اخراجات پر مشتمل ہوتے ہیں جن کو مختلف محصولات کے ذریعہ حکومت فراہم کرنا اپنا فرض تصور کرتی ہے تاکہ ملک کے نظم ونسق کو چلا سکے۔ ہاؤس آف کامنز اس کا مجاز ہے کہ وہ یہ تعین کرے کہ میزانیہ میں کل رقم کس قدر منظور کی جائے اور وہ رقم کن کن ذرائع سے حاصل کی جائے لیکن ہاؤس نے اپنے آپ کو اس اہم حق سے محروم کر لیا ہے کہ وہ خود مختلف قومی ضروریات کے لئے اخراجات تجویز کرے۔ یہ کام اب کابینہ انجام دیتی ہے۔

ہاؤس آف کامنز میں جب کابینہ کی جانب سے بجٹ کا مسودہ پیش کیا جاتا ہے تو ہاؤس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس امر کی پوری طرح چھان بین کرے کہ قومی نظم ونسق کے لئے جو خرچ کی تجویز کی گئی ہے وہ کم سے کم ہے جو ان حالات میں ممکن ہے۔ قوم کی پوری مالی حالت کا جائزہ لینے کے لئے ہاؤس آف کامنز ایک کمیٹی کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ کس مد پر کتنا خرچ کیا جائے۔ اس کو کمیٹی آف سپلائی کہتے ہیں۔ جب یہی کمیٹی اس پر غور کرتی ہے کہ یہ اخراجات قومی آمدنی کے کن ذرائع سے حاصل کئے جائیں تو اس کو کمیٹی آف ویز اینڈ مینس کہتے ہیں۔ ہاؤس آف کامنز جب ان کمیٹیوں کی شکل اختیار

کرتا ہے تو اسپیکر اس کی صدارت نہیں کرتا بلکہ کمیٹی آف سپلائی کا علحدہ صدر منتخب ہوتا ہے اور کمیٹی آف ویز اینڈ مینس کا علحدہ۔ جب بجٹ تیار کیا جاتا ہے تو وہ دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ایک حصہ میں اخراجات اور دوسرے میں محصولات وغیرہ کے ذرائع آمدنی کی تفصیل ہوتی ہے۔ جس طرح اور دوسرے قوانین ہاؤس آف کامنز میں منظور کئے جاتے ہیں اسی طرح بجٹ کا مسودہ بھی ہاؤس میں منظور ہونے کے بعد نافذ ہوتا ہے۔ دوسرے مسودات قانون کی طرح بجٹ کی تجاویز پر بھی پارٹی بندی کے نقطۂ نظر سے ہاؤس آف کامنز میں غور کیا جاتا ہے۔ حکومت کے حامی بجٹ کی تجاویز کی حمایت کرتے ہیں اور مخالفین مخالفت کرتے ہیں لیکن مخالف جماعت کی تنقید بجٹ پر بھی سیاسی نقطۂ نظر سے ہوتی ہے۔ مخالف جماعت بجٹ کے ان کمزور پہلوؤں کو چن لیتی ہے جن کی مخالفت سے وہ اپنے حریفوں کے مقابلہ میں سیاسی فائدہ حاصل کرسکتی ہے۔

[لیکن حقیقت یہ ہے کہ مالیاتی معاملات میں ہاؤس آف کامنز کا اختیار اب برائے نام رہ گیا ہے۔ ہاؤس میں مالیاتی تجاویز صرف حکومت پیش کرسکتی ہے۔ چونکہ کابینہ کا تعلق اس سیاسی فریق سے ہوتا ہے جسے ہاؤس آف کامنز میں اکثریت حاصل ہے اسواسطے سوائے بعض ضمنی تبدیلیوں کے جو محصولوں کے عائد ہونے کے متعلق ہوتی ہیں بجٹ بلا کسی دشواری اور تبدیلی کے منظور کر لیا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات حکومت کو باوجود ہاؤس میں اکثریت رکھنے کے بعض محصولات بدلنے پڑتے ہیں اور بجائے کسی ایک طبقہ کے کسی دوسرے طبقہ پر محصول کا بار عائد کرنا ہوتا ہے اور اس طرح تخمینہ کی مقررہ رقم کو پورا کیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں مسٹر (لارڈ) بالڈون کی کابینہ کو ہاؤس آف کامنز کی اکثریت حاصل تھی۔ اس کابینہ کی طرف سے اس سال جو بجٹ پیش کیا گیا اس میں مٹی کے تیل پر محصول کی تجویز تھی جس کا اثر زیادہ تر غریب طبقہ پر پڑتا تھا۔ چنانچہ ہاؤس کا رجحان اس محصول کے خلاف دیکھ کر کابینہ نے اس تجویز کو واپس لے لیا اور دوسرے محصولوں سے اس کی کمی کو

پورا کیا جن کا بار متوسط اور اعلیٰ طبقہ پر پڑتا تھا۔

وضع قانون اور ملکی نظم و نسق کے مالیاتی انصرام کی تجاویز منظور کرنے کے علاوہ ہاؤس آف کامنز کا ایک اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ حکومت کے مختلف شعبوں کے متعلق واقفیت حاصل کرے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہاؤس کے ارکان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ متعلقہ وزیروں سے سوالات کرسکیں۔ سوالوں کے ذریعہ ارکان نہ صرف صحیح حالات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں بلکہ اپنی شکایات کا بھی اظہار کرسکتے ہیں اور اس طرح عام مفاد کے ان مسائل کو ملک و قوم کی توجہ کا مرکز بنا سکتے ہیں جنھیں ان کے خیال میں حکومت پوری توجہ کے ساتھ جیسا چاہیئے انجام نہیں دے رہی ہے بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ وزارت کے حامی وزیر متعلقہ سے کسی خاص مسئلہ کے متعلق اس لئے سوال کرتے ہیں تاکہ وزیر متعلقہ کو اپنی عام حکمت عملی کا اس طرح اظہار کا موقع حاصل ہو اور ملک میں جو غلط فہمی پیدا ہورہی ہے اس کا سدّ باب ہوسکے۔ حکومت کے مخالف اکثر اوقات حکومت کو دِق کرنے کے لئے مختلف قسم کے سوالوں کی بھرمار کرتے ہیں بعض ارکان کو سوال کرنے کا شوق اس لئے ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے منتخب کرنے والوں کو بتا سکیں کہ ملکی معاملات سے ان کی دلچسپی برقرار ہے اور وہ پارلیمنٹ کے اونگھتے ہوئے رکن نہیں ہیں۔ سوالوں کے ذریعہ حکومت کے مختلف محکموں پر تنقید ممکن ہے اور محکموں کی فروگزاشتوں کو پبلک کے سامنے لانے کا یہ نہایت موثر ذریعہ ہے۔ دفتر شاہی پارلیمنٹ میں سوالوں کے ڈر سے ہر وقت چوکنّی اور اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری میں مستعد رہتی ہے۔ سوال کرنے کی آزادی کے حق کو جو پالیمانی حکومت کا نہایت اہم حق ہے، اگر ٹھیک طور پر استعمال نہ کیا جائے تو اس سے بجائے فائدہ کے اُلٹا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس پارلیمانی حق کو اور دوسرے دستوری حقوق کی طرح ضابطوں کا پابند کردیا گیا ہے۔ مثلاً ہر سوال صرف اس وزیر سے کیا جاسکتا ہے جس کے دائرۂ عمل کے تحت متعلقہ محکمہ کا تعلق ہے۔ سوال کرنے والے کو کم سے کم ایک روز کا نوٹس دینا ہوتا ہے تاکہ اس کے متعلق وزیر کا عملہ محکمہ سے معلومات فراہم

کر سکے ۔ یہ بھی لازمی ہے کہ سوال کے ضمن میں کسی قسم کی کوئی ایسی بات نہ کہی جائے جس سے ظاہر ہو کہ سوال کرنے والا اس بہانہ سے اپنی حجت پیش کرنا چاہتا ہے یا خاص مسلک یا خیال کا پرچار کرنا چاہتا ہے ۔ سوال سے کسی کی بُرائی یا تعریف کا پہلو نکلتا ہو تو اسپیکر اس کی اجازت نہ دے گا ۔ سوال میں کسی ایسے بیان کی نسبت اشارہ یا حوالہ نہ ہونا چاہیئے جو کسی وزیر یا ہاؤس کے کسی رکن نے ہاؤس سے باہر دیا ہو ۔ کسی رکن کو ایک وقت میں چار سوال سے زیادہ کی اجازت نہ ہوگی ۔ کسی جواب کے غیر تشفی بخش ہونے کی صورت میں اسپیکر کی اجازت سے ضمنی سوال دریافت کئے جا سکتے ہیں ۔ ہاؤس آف کامنز کی ہر روز کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے کچھ وقت کی نشان دہی کر دی جاتی ہے جس میں حکومت کے وزیر ارکان کے سوالوں کے جواب دیتے ہیں ۔ سوال کے ضمن میں کسی قسم کی ہاؤس میں بحث نہیں کی جا سکتی ۔ وزیر متعلقہ جب کسی سوال کا جواب دے چکے تو اس کے بعد ہاؤس میں جیسا کہ فرانس کے چیمبر آف ڈیپیٹیز میں دستور ہے ، اس موضوع کو طول نہیں دیا جا سکتا اور اس کو بنائے بحث و حجت نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ اس بات کا کوئی تعین ممکن نہیں کہ وزیر متعلقہ نے کسی سوال کا جو جواب ہاؤس کے سامنے دیا وہ قابلِ اطمینان تھا یا نہیں ۔ وزیر کے جواب کے بعد چاہے وہ جواب تشفی بخش ہو یا نہ ہو ہاؤس اپنے مقررہ پروگرام کے مطابق جسے "آرڈرز آف دی ڈے" کہتے ہیں ، عمل کرتا ہے ۔ ہاؤس آف کامنز میں روزانہ تقریباً ڈیڑھ سو سوال کئے جاتے ہیں جن کے جواب متعلقہ وزیروں کو اپنے اپنے محکموں سے مواد فراہم کرنے کے بعد دینے ہوتے ہیں ۔ کچھ عرصہ ہوا حکومت کے اخراجات میں تخفیف کرنے کی سفارش کرنے کی غرض سے ہاؤس آف کامنز نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی ۔ اس کمیٹی نے اپنی تحقیقات کے دوران میں اس مسئلہ پر بھی غور کیا کہ ہاؤس آف کامنز میں روزانہ جو سوالات کئے جاتے ہیں اور ان کے جو جواب دیئے جاتے ہیں ان پر کتنا خرچ ہوتا ہے ۔ چنانچہ کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی کہ انگلستان کے خزانہ کو ہر سوال کے جواب پر تقریباً ۳۰ شلنگ (۲۰ روپئے) خرچ کرنا پڑتے ہیں ۔ لیکن باوجود اس خرچ کے پارلیمنٹ میں سوال کرنے کا حق ایک نہایت اہم دستوری حق ہے جس کو انگریز قوم اپنی

آزادی کے اصول میں شمار کرتی ہے۔

یہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ سوالات کے ضمن میں بحث نہیں ہوسکتی اور نہ رائے طلب کی جاسکتی ہے لیکن ہر رکن اس کا مجاز ہوتا ہے کہ کسی ایسے اہم مسئلہ کی طرف متوجہ کرنے کے لئے جس کا تعلق مفاد عامہ سے ہے، ہاؤس کی کارروائی کو ملتوی کرانے (اڈجورن منٹ) کی تحریک پیش کرے۔ اس قسم کی تجاویز بالعموم اس وقت کی جاتی ہیں جب متعلقہ وزیر کسی سوال کا تشفی بخش جواب نہ دے یا اپنے جواب سے اصل مسئلہ کو ٹالنے کی کوشش کرے۔ اجلاس ملتوی کرنے کی تحریک معمولاً آرڈرز آف دی ڈے سے قبل نہیں پیش کی جاسکتی لیکن اس وقت اس کو پیش کیا جاسکتا ہے جبکہ ہاؤس کے چالیس ارکان کھڑے ہوکر ایسا کرنے کی تائید کریں۔ ایسی صورت میں اس روز کا پارلیمانی پروگرام شروع کرنے سے قبل تحریک التوا پر غور کیا جائیگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہاؤس کے دس ارکان کھڑے ہوکر اسپیکر سے درخواست کریں کہ اس روز کا پروگرام شروع ہونے سے پہلے تحریکِ التوا کو پہلے پیش ہونا چاہیئے۔ ایسی حالت میں اسپیکر کل ہاؤس سے اس کی نسبت رائے دریافت کرے گا اور اگر کثرت رائے تحریکِ التوا کو پہلے پیش کرنے کی موافقت میں ہوگی تو اس پر عمل کیا جائے گا۔ تحریک التوا کسی ایسے اہم مسئلہ کے متعلق ہوتی ہے جس کا تعلق مفاد عامہ سے ہو۔ لیکن اس بات کا تعین بڑا مشکل ہے کہ آیا کسی مسئلہ کا تعلق مفاد عامہ کے اہم مسئلہ سے ہے یا نہیں۔ کابینہ کے ارکان تحریک التوا کو پسند نہیں کرتے اس واسطے کہ بعض اوقات یہ تحریک کسی ایسے مسئلہ کے ضمن میں پیش کی جاسکتی ہے جس کے متعلق حکومت اپنی رائے ظاہر کرنا اور متعلقہ واقعات کو پیش نہیں کرنا چاہتی۔

بالعموم تحریک التوا کابینہ سے اہم معاملات کے متعلق مزید اطلاع اور واقفیت حاصل کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہے دور بعض اوقات اس کا مقصد کابینہ پر اظہارِ ملامت کرنا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ تحریکِ التوا اس لئے پیش کی جاتی ہے کہ کسی فوری پبلک اہمیت رکھنے والے صریح اور معینہ معاملے کی طرف مقننہ کی توجہ مرکوز کی جاسکے اور اس کے ضمن میں جو بحث و تنقید ہو اس سے متعلقہ تنقیحات واضح ہو جائیں۔ لیکن جب سے انگلستان کی سیاست میں

پارٹی بندی کے اصول پر سختی کے ساتھ عمل ہو رہا ہے اس وقت سے مخالف جماعت کے لئے اس کا بہت کم امکان باقی ہے کہ وہ کابینہ کی مرضی کے خلاف اپنی تحریک التوا کو کامیاب بنا سکے۔

بعض اوقات حکومت جب کسی مسئلہ کے متعلق تشفی بخش جواب نہیں دیتی تو تحریک التوا ہاؤس میں پیش کی جاتی ہے تاکہ متعلقہ مسئلہ پر بحث و تنقید ہو اور رائے لی جائے ورنہ ویسے معمولی سوالات پر بحث نہیں ہوسکتی اور نہ رائے لی جاتی ہے بلکہ وزیر متعلقہ جو کچھ جواب دیتا ہے اسی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ ہاؤس آف کامنز میں تحریک التوا فرانسیسی دار الوکلا[1] کے ان تفصیل طلب سوالات[2] سے ملتی جلتی ہے جو حکومتوں کو بنانے بگاڑنے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ فرانس میں وزراء سے سوال کرنا ایک مستقل فن لطیف بن گیا ہے بعض دفعہ یہ سوال اس طور پر اور ایسی عبارت میں ہوتے ہیں کہ حکومت کے حامی بھی اگر ذرا بھی اپنے ضمیر کا خیال کریں تو ان کی مخالفت کرتے ہوئے ہچکچائیں۔ لیکن چونکہ ان کی تہ میں حکومت وقت کی ملامت کا خیال کار فرما ہوتا ہے اس لئے حکومت کے حامیوں کے سامنے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ وہ کابینہ کی تائید کرنے کی غرض سے ان کی مخالفت کریں۔ لیکن پھر بھی انگلستان کے مقابلہ میں فرانس میں ان تفصیل طلب سوالات سے حکومتیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ چنانچہ اگر کسی سوال کے ضمن میں حکومت کو دار الوکلاء کی اکثریت حاصل نہ رہے تو اس کو مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ ہاؤس آف کامنز میں بھی تحریک التوا جب پیش کی جاتی ہے تو اس پر بحث و تنقید ہوتی اور رائے لی جاتی ہے اور حکومت کی طرف سے متعلقہ مسئلہ کے ضمن میں جو جواب دیا جاتا ہے وہ معرض بحث میں آتا ہے۔ چنانچہ اگر مخالف جماعت کے معمولی سوال کا حکومت کی طرف سے تشفی بخش جواب نہیں دیا جاتا یا اس کو ٹالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو تحریک التوا کا حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ بالعموم اگر کسی تحریک التوا کے ضمن میں حکومت کو شکست ہو جائے تو اس کو مستعفی ہونا چاہیئے

---

[1] Chamber of Deputies

[2] Interpellations

لیکن انگلستان میں فرانس کی طرح ایسی نوبت نہیں آتی اس واسطے کہ کابینہ کو پچھلے پچاس برس میں بہت قوت حاصل ہوگئی ہے اور وہ من مانے طور پر ہاؤس آف کامنز سے جو چاہتی ہے فیصلہ کرالیتی ہے۔ جو جماعت کابینہ بنانے کی اہل ہوتی ہے وہ اس کی بدرجۂ اتم اہل ہوتی ہے کہ ہاؤس آف کامنز میں تحریک التوا یا تحریک ملامت کو شکست دے سکے۔ اگر ہاؤس کابینہ کی تائید نہیں کرے گا تو خود اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارے گا کیونکہ کابینہ کی شکست کے معنی ہوں گے ہاؤس کا برخاست ہو جانا جو کابینہ کے حامی ہرگز نہیں چاہیں گے۔

اٹھارویں صدی میں ہاؤس آف کامنز اپنی قوت کے شباب پر تھا۔ اس کے بڑھتے ہوئے اثر و اقتدار سے لوگ خائف ہوگئے۔ چنانچہ کابینی طریق حکومت کو اسی غرض کے لئے ترقی دی گئی کہ اس طرح ہاؤس آف کامنز کی روک تھام ممکن ہوگی۔ انیسویں صدی میں کابینی طریق حکومت کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ پچھلے دنوں انگلستان کی سیاسی زندگی میں یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ہاؤس آف کامنز کا اثر دن بدن گھٹتا جارہا ہے اور کابینہ کا اثر بڑھتا جاتا ہے۔ چنانچہ آج اصل آقا کابینہ ہے نہ کہ ہاؤس آف کامنز بالکل اسی طرح جیسے انیسویں صدی میں ہاؤس آف کامنز اصل آقا تھا اور کابینہ اس کی خادم۔ ہاؤس آف کامنز کا کام زیادہ تر یہ رہ گیا ہے کہ وہ کابینہ کے فیصلوں کی توثیق کرتا رہے۔

پارٹی بندی کی ترقی کا یہ لازمی نتیجہ نکلا کہ ہاؤس آف کامنز میں پرائیویٹ ممبر کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہی۔ ہاؤس خود وضع قانون نہیں کرتا بلکہ وزیر وضع قانون کی جو تجاویز پیش کرتے ہیں ان کی توثیق کرتا ہے۔ وہ جماعت جو برسر اقتدار ہوتی ہے اس کے ارکان کو مجوزہ مسودات قانون کے متعلق اتنی ہی واقفیت ہوتی ہے جتنی مخالف جماعت کے ارکان کو۔ جب یہ مسودے چھپ کر ارکان کے غور کے لئے پیش ہوتے ہیں تو ان کو ان کی نسبت اطلاع ہوتی ہے بالکل اسی طرح جیسے مخالف جماعت کے ارکان کو ان کی آواز بھی مخالف جماعت کے ارکان کی طرح معاملات اور مسائل کو خاص شکل دینے میں غیر موثر رہتی ہے۔ لیکن برسر اقتدار جماعت کے حامی ہونے کے سبب سے ان کا کام یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی جماعت کی

تیج کریں اور اس کے ساتھ رائے دیں۔ بعض اوقات بالکل مشینی طور پر اپنے ضمیر کے خلاف رائے دینا پڑتی ہے۔ کابینہ اس وقت ہاؤس آف کامنز پر اس طرح حاوی ہے کہ اس کے افعال کی بازپرس بہت دشوار ہوگئی ہے۔ اس کے افعال پر اگر کوئی روک ہے تو وہ ہاؤس آف کامنز نہیں ہے بلکہ رائے دینے والی عام پبلک ہے جس کے سامنے پھر کچھ سال بعد ارکان کابینہ کو ووٹوں کے لئے ہاتھ پھیلانا پڑے گا۔ لیکن جہاں تک ہاؤس آف کامنز کا تعلق ہے اس کا اثر برابر کم ہو رہا ہے اور بغیر کابینہ کے ایما کے کچھ نہیں کرسکتا۔ ہاؤس آف کامنز کا اہم تاریخی فریضہ یہ تھا کہ وہ حکومت کی نگرانی اور روک تھام کرتا رہے لیکن اب بہت دنوں سے وہ اپنے اس فرض کی بجاآوری میں قاصر نظر آتا ہے۔

سو سال قبل ہاؤس آف کامنز زیادہ تر وضع قانون کے فرائض انجام دیتا لیکن آج یہ کام کابینہ کے ذمہ ہے۔ کابینہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اپنی ضروریات کے لئے ہاؤس کے وقت میں سے بیشتر اپنے لئے مخصوص کرائے تاکہ وہ مسودات قانون منظور ہوسکیں جنھیں وہ ملک و قوم کے لئے ضروری خیال کرتی ہے۔ ہاؤس آف کامنز صرف اس وقت اپنی آواز بلند کرسکتا ہے جبکہ کسی مسودۂ قانون کے ضمن میں ملک کی عام حکمت عملی متاثر ہوتی ہو۔ لیکن اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ حکومت وقت کسی خاص حکمت عملی کے متعلق اس قدر اقدام کرچکی ہوتی ہے کہ ہاؤس آف کامنز سوائے اس کے کہ اُس حکمت عملی کو کلیتاً باطل قرار دے اس میں کوئی نمایاں تغیر و تبدل نہیں کراسکتا اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب حکومت وقت کو بیدخل کرنا مقصود ہو۔ اور ظاہر ہے کہ حکومت کی پارٹی کے ارکان چاہے وہ اس کی کسی خاص حکمت عملی کو کتنا ہی ناپسند کیوں نہ کرتے ہوں یہ گوارا نہ کریں گے کہ اس کو شکست ہوجائے اور مخالف پارٹی اپنی حکومت قایم کرے۔ غرضکہ وضع قانون اور عام حکمت عملی کی تشکیل کے باب میں ہاؤس آف کامنز کا کوئی خاص حصہ نہیں ہوتا بلکہ اکثر اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ جب کابینہ اہم فیصلے اور حکمت عملی کی تشکیل کرچکتی ہے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں تو ہاؤس آف کامنز کو اس کی نسبت واقف کرایا جاتا ہے۔

کابینہ کے اس بڑھتے ہوئے اثر کی حمایت انگلستان کے بعض اُن اہل فکر نے بھی کی جن کی نظر فلسفۂ سیاست پر گہری تھی۔ جان اسٹورٹ مل نے ۱۸۶۳ء میں پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے انگلستان کے اس جدید سیاسی رجحان کی تائید کی اور کہا:۔ "ایک عام نمائندہ جماعت جانتی ہے کہ وہ کس کام کے لئے موزوں ہے اور کس کام کے لئے موزوں نہیں ہے۔ دن بدن یہ بات واضح ہوتی جارہی ہے کہ اُس کا (ہاؤس آف کامنز) کام نظم و نسق کو چلانا نہیں ہے بلکہ اس کا اصلی کام یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ آیا نظم و نسق کا کام موزوں لوگوں کے ہاتھ سے انجام پا رہا ہے یا نہیں اور وہ لوگ اپنے فرائض جیسے چاہیئے ویسے پورے کر رہے ہیں یا نہیں۔ مجھے پوری توقع ہے کہ یہ احساس بڑھتا جائیگا کہ اس ہاؤس (ہاؤس آف کامنز) کا فرض یہ ہے کہ وہ ٹرنیرری بنچ پر موزوں اشخاص کو بٹھائے اور جب وہ وہاں ہوں تو انھیں اپنے کام میں لگا رکھے جتنا زیادہ لوگوں کا تجربہ وسیع ہوتا جائیگا اتنا ہی زیادہ وہ اس اصول کی قدر کریں گے"۔[۱]

پچھلی صدی میں ہاؤس آف کامنز کی قوت کا راز اس امر میں پوشیدہ تھا کہ ملکی مالیات کے متعلق اس کو مکمل اختیارات حاصل تھے اور بجٹ کے بنانے، بدلنے میں اس کو موثر دخل حاصل تھا۔ لیکن بیسویں صدی کے شروع سے یہ رجحان دن بدن بڑھ رہا ہے کہ مالیاتی حکمت عملی کی تشکیل بھی پورے طور پر کابینہ کے ہاتھ میں چھوڑ دی جائے اب انگلستان کے خزانے کی کنجی ہاؤس آف کامنز کے ہاتھ سے نکل کر کابینہ کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔ خاص طور پر جنگ عظیم کے بعد سے حکومت کی پیش کی ہوئی مالیاتی تجاویز میں شاذ ہی ردوبدل کیا جاتا ہے اور حکومت کی طرف سے قومی آمدنی اور خرچ کے تخمینے پیش ہوتے ہیں انھیں بلاچون وچرا تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ وزیر یہ پسند نہیں کرتے کہ ہاؤس ان کی تجاویز میں کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم کرے چاہے وہ کتنی ہی ناقابل قبول کیوں نہ ہوں۔ ہاؤس آف کامنز سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ حکومت کی پیش کی ہوئی مالیاتی تجاویز کو جیسے کا تیسا تسلیم کرے گا۔

---

[۱] سڈنی لو۔ دی گورنمنس آف انگلینڈ۔ ص ۶۸۔

[سرارسکن مے نے پارلیمنٹ کے تینوں اجزا یعنی تاج، ہاؤس آف لارڈز اور ہاؤس آف کامنز کے مالیاتی حق کا اپنی مشہور تصنیف میں اس طرح ذکر کیا ہے:۔ "تاج رقم کا مطالبہ کرتا ہے، کامنز اس رقم کو منظور کرتے ہیں اور لارڈز اس کی منظوری کی تائید کرتے ہیں۔ ہاؤس آف کامنز اس وقت تک رقم منظور نہیں کرتا جب تک کہ تاج کی طرف سے مطالبہ نہ پیش کیا جائے۔ اور نہ وہ نئے ٹکس عائد کرتا جب تک کہ تاج کی طرف سے مطالبہ نہ پیش کیا جائے۔ اور نہ وہ نئے ٹکس عائد کرتا یا ان میں اضافہ کر سکتا ہے جب تک کہ پبلک سروس کے لئے ایسا کرنا ضروری نہ ہو جس کی نسبت تاج نے اپنے دستوری مشیروں کے ذریعہ اعلان کر دیا ہو"[1] لیکن سرارسکن مے نے جس پارلیمانی طریق کار کی طرف اشارہ کیا ہے وہ دستوری حیثیت سے چاہے کتنا درست کیوں نہ ہو لیکن عملی طور پر اس کے نتائج کا رُخ بالکل دوسری طرف ہے۔ اب ہاؤس آف لارڈز کو ۱۹۱۱ء کے ریفارم ایکٹ کی رو سے مالیاتی معاملات میں دخل دینے کا حق باقی نہیں رہا۔ آمد و خرچ پر کامنز کی نگرانی بھی اب برائے نام رہ گئی ہے۔ بادشاہ کو ذاتی طور پر بہت عرصے سے ملک کی مالیات سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ ہاں اگر تاج سے مراد کابینہ لی جائے تو اس ضمن میں جو دستوری اُلجھاؤ پیدا ہوتا ہے وہ سُلجھ جاتا ہے۔ ہاؤس آف کامنز کسی مالیاتی تجویز کو از خود نہیں پیش کر سکتا جب تک کہ کابینہ کی طرف سے اس کا مطالبہ نہ کیا گیا ہو۔ جب کابینہ مطالبہ کرتی ہے تو اس وقت ہاؤس آف کامنز رقوم کی معینہ مقاصد کے لئے نشاندہی کرتا ہے[2] اس تمام اہم کارروائی کے متعلق پارلیمنٹ کا کوئی منظور کیا ہوا قانون موجود نہیں بلکہ صرف ایک منظورہ قاعدہ (اسٹنڈنگ آڈر) کے ذریعہ مالیاتی انصرام کے متعلق دستوری روایات پیدا ہو گئی ہیں جو لکھے ہوئے قانون کی طرح موثر ہیں۔

ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ کروڑوں پونڈ کی رقموں کے متعلق جانچ پڑتال کرنے کے لئے ہاؤس کو صرف ۲۰ دن دیئے جاتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مالیاتی مسائل اس قدر پیچیدہ ہوتے

---

[1] Parliamentary Practice ص ۵۴۵

ہیں کہ جب تک کوئی شخص اس فن کی مہارت نہ رکھتا ہو کسی مقننہ کے معمولی ارکان کے لیئے ناممکن ہوتا ہے کہ وہ کوئی معقول رائے دے سکیں جو فنی اعتبار سے درست اور صائب کہی جا سکے حکومت کی مخالف پارٹی بھی بڑی مشکل سے مالیاتی تجاویز میں کوئی فنی کوتاہی نکال سکتی ہے اس لئے کہ ہر مد بڑی دیدہ ریزی اور محنت کے بعد ماہروں کے مشورہ سے تیار کی جاتی ہے لیکن مخالف پارٹی بالعموم ایسے موقع پر یہ کرتی ہے کہ حکومت کی عام حکمت عملی کو معرض بحث میں لاتی ہے بجائے اس کے کہ پیش کردہ تخمینوں پر فنی نقطۂ نظر سے بحث کرے ۔ چنانچہ سیاسی تنقیحات اُٹھائی جاتی ہیں اور متعلقہ وزیروں کی تنخواہوں میں تخفیف کرنے کی تجاویز پیش کی جاتی ہیں ۔

۱۹۱۸ء میں انگلستان کی قومی آمدنی کے وسائل پر تفتیش کرنے کی غرض سے پارلیمنٹ نے ایک سیلکٹ کمیٹی مقرر کی تھی جس نے اس پر تعجب ظاہر کیا ہے کہ ”پچھلے پچیس سال میں ایسی کوئی ایک مثال بھی موجود نہیں کہ ہاؤس آف کامنز نے اپنے براہ راست عمل سے مالیاتی وجوہ کی بنا پر کسی تخمینے میں جو اس کے سامنے پیش کیا گیا ہو کمی کی ہو کمیٹی آف سپلائی میں جو مباحثہ ہوتا ہے وہ حکومت کی حکمت عملی اور نظم و نسق کی تنقید کے لئے ناگزیر ہے لیکن حکومتی اخراجات کی تجاویز پر براہ راست موثر طور پر روک یا قابو رکھنے کا جہاں تک تعلق ہے، یہ کہنا درست ہوگا کہ اگر تخمینے ہاؤس کے سامنے پیش نہ بھی ہوتے اور کمیٹی آف سپلائی اپنے اجلاس منعقد نہ بھی کرتے تو بھی کوئی خاص فرق پیدا نہ ہوتا[۱]!“

دراصل ضرورت اس کی ہے کہ امریکہ اور فرانس کی طرح انگلستان میں بھی کمیٹیوں کا طریقہ رائج کیا جائے جو ایک طرف تو ہاؤس آف کامنز کے کھوئے ہوئے اختیارات کی حفاظت کرے اور دوسری طرف کابینہ کے بڑھتے ہوئے اثر میں کمی کرے ۔ اس وقت

لہ ۔ Ninth Report of the Select Committee on National Expenditure p. 121, 1918.

لہ ۔ دیکھو ایف ۔ اوگ کی کتاب ”European Governments and Polities“ ص ۲۸۷ ۔

انگلستان میں حالت یہ ہے کہ محکمۂ مالیات یہ نہیں چاہتا کہ اس کے راز ہائے سربستہ ہر کس و ناکس کے سامنے تفصیل سے پیش ہوں اور ہاؤس آف کامنز کے ارکان کو اس باب میں عمل دخل حاصل ہو۔ امریکہ میں حکومت کے پیش کئے ہوئے تخمینوں کی جانچ پڑتال کے لئے نو کمیٹیاں ہوتی ہیں جن کے سپرد خاص خاص محکموں کے تخمینے ہوتے ہیں۔ ان کمیٹیوں کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں۔ چنانچہ وزیر متعلقہ اور سرکاری عہدہ داروں کو وہ اپنے سامنے کسی خاص مد کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے طلب کرسکتی ہیں۔ ان کمیٹیوں کے صدر بڑے باا ثر لوگ ہوتے ہیں اور کسی طرح بھی ان کی حیثیت وزیروں سے کم نہیں ہوتی۔ فرانس میں بھی اس قسم کی کمیٹیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ فنانس کمیٹی کے سب ارکان دارالوکلا کے ارکان ہوتے ہیں لیکن وزیر مالیات اس کا رکن نہیں ہوتا۔ اگر کمیٹی چاہے تو اس کو اپنے سامنے طلب کرسکتی ہے۔ اس کمیٹی کی نظرثانی کے بعد بجٹ کا مسودہ دارالوکلا میں پیش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اور دوسرے شعبوں کے متعلق امریکہ اور فرانس میں جو کمیٹیاں مقرر ہوتی ہیں ان کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں اور ان کی بدولت ان ملکوں کی عاملہ پر براہ راست روک رہتی ہے۔ فرانس میں باوجود وزارتوں کی آئے دن کی تبدیلیوں کے ان کمیٹیوں کے سبب سے نظم و نسق کی بنیادی حکمت عملی میں بہت کم فرق پیدا ہوتا ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ فرانس میں دارالوکلا کابینہ پر پورا قابو رکھتا ہے بالکل اسی طرح جیسے انگلستان میں کابینہ ہاؤس آف کامنز کی نکیل کابینہ کے ہاتھ میں رہتی ہے کہ من مانے طور پر اسے جدھر چاہے لے جائے۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ان کمیٹیوں کی بدولت فرانس کی دفتر شاہی حکومت پر عوام کا زیادہ اثر ہے بہ نسبت انگلستان کے، جہاں دفتر شاہی حکومت کابینہ کی آڑ میں پوری طرح پارلیمنٹ پر حاوی ہے[1]۔

[یہ سوال اگرچہ مختلف فیہ ہے کہ آیا کابینہ اور پارٹی بندی کے طریقے کو کمزور کرنے

---

[1] ۔ ریمزے میور How Britain is Governed. ص ۲۳۰۔

اور پرائیویٹ ممبر کے عمل دخل کو بڑھانے سے جو وضع قانون ہوگا وہ ملک و قوم کے لئے زیادہ مفید ہوگا یا وہ قوانین جو کسی خاص حکمت عملی کے تحت کابینہ کے اقدام پر ہاؤس آف کامنز میں وضع کئے جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ چونکہ کابینہ نے وضع قانون کے تقریباً تمام اختیارات اپنی ذات میں مرکوز کر لئے ہیں اس لئے پرائیویٹ ممبر کی اہمیت بالکل ختم ہوگئی ہے اور اس کو اپنی بے لاگ رائے اور صلاحیت سے ہاؤس کو مستفید کرنے کے برائے نام مواقع باقی رہ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کابینہ اور محکمے نظم و نسق کے علاوہ وضع قانون کے متعلق بھی پورے طور پر حاوی نظر آ رہے ہیں جو درحقیقت عمومیت کے اصول کی نفی ہے۔ یہ سچ ہے کہ کابینہ خود کوئی ایسا کام کرتے ہوئے بیحد پس و پیش کرتی ہے جس سے عوام الناس میں اس کے خلاف ناراضگی کے جذبات پھیلنے کا احتمال ہو۔ شلاً حبشہ کے معاملہ میں ۱۹۳۵ء میں جب سر سموئیل ہور، وزیر خارجہ کی پالیسی پر عام طور پر ناراضگی کا اظہار کیا گیا تو مسٹر بالڈون نے مجبوراً اپنی حکومت کو اس پالیسی سے بے تعلقی ظاہر کی اور سر سموئیل ہور کو مستعفی ہونا پڑا ورنہ اندیشہ تھا کہ کہیں حکومت کو مزید مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن عام طور پر ایسی مثالیں آج کل کی پارلیمانی زندگی میں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔ پارٹی بندی کے بندھن ایسے سخت ہیں کہ انفرادی ضمیر کی آزادیاں اس پر قربان کر دی گئی ہیں۔ ہاؤس آف کامنز میں مختلف سیاسی پارٹیوں کی طرف سے جو فصاحت و خطابت صرف کی جاتی ہے وہ اکثر و بیشتر بے اثر رہتی ہے۔ اگرچہ ایک پارٹی کا رکن محسوس کرتا ہے کہ مخالفوں کے دلائل قوی ہیں لیکن وہ اپنا ووٹ اپنی پارٹی ہی کو دیتا ہے چاہے اس کے لیڈر کی حجت کتنی ہی غیر تشفی بخش اور پھس پھسی کیوں نہ رہی ہو۔

آج کل ہاؤس آف کامنز میں رائے بالکل میکانکی طور پر دی جاتی ہے نہ کہ دلائل و براہین کے اثر سے۔ پارٹی بندی کا گر یہی ہے ورنہ ایک پارٹی کے رکن دوسری پارٹی کے ساتھ ووٹ دیا کریں جیسا کہ انیسویں صدی کے آخر تک دیا کرتے تھے۔ لیکن اب اس کا مطلق امکان باقی نہیں رہا۔ اب اگر ایسا ہو تو سارا پارلیمانی نظام درہم برہم ہو جائے۔

ہاؤس آف کامنز کے وقار کو برقرار رکھنے اور پرائیویٹ ممبر کی اُپج کو بالکل ختم ہونے سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ کابینہ اور ہاؤس آف کامنز کے اختیارات کے باہمی توازن پر نظرثانی کی جائے تاکہ انگلستان کی روایتی آزادئی تنقید متاثر نہ ہو لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ تنقید کا کام بڑی حد تک اخبارات نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اکثر اوقات ہاؤس آف کامنز کے رکن کو اس کا علم تک نہیں ہوتا کہ ایوان میں کیا ہو رہا ہے۔ صبح اٹھ کر ناشتہ کے وقت جب وہ اخبار پڑھتا ہے تو حال معلوم ہوتا ہے جس طرح پبلک کو اخباروں کے ذریعہ پارلیمنٹ کی کارروائیاں تفصیل سے معلوم ہوتی ہیں اسی طرح پارلیمنٹ کے بیشتر ارکان کو اخباروں ہی سے اپنے ایوان کی کارروائیوں کے متعلق واقفیت ہوتی ہے۔ اب ہاؤس آف کامنز کے حق تنقید پر پریس قابض ہے اس لئے کہ ہاؤس کے ارکان کی تنقید موجودہ پارٹی بندی کے طریق کار کے مطابق پارلیمانی امور میں دراصل ایک قسم کی رکاوٹ ہوگی۔ ہاؤس آف کامنز کا سوائے اس کے کوئی فرض باقی نہیں رہا کہ وہ حکومت وقت کو برقرار رکھے اور اس پر کسی طرح کی آنچ نہ آنے دے۔ حالانکہ اس کا فرض یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ حکومت کو ٹھیک ٹھیک مشورہ دے اور اس کو بے راہ روی سے بچائے۔ لیکن چونکہ کابینہ اس پارٹی کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے جس کو ہاؤس آف کامنز میں اکثریت حاصل ہے اس لئے بالعموم ایسا ہوتا ہے کہ وہ ارکان جن کی پارٹی برسراقتدار ہے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ کابینہ جو کچھ کر رہی ہے وہ درست ہے۔ پھر چونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے حکومت کی مخالفت کی اور اس کو کسی اہم تجویز پر ہاؤس میں شکست ہوگئی تو انتخاب کے جھمیلے میں پڑنا پڑے گا اور ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ پارٹی کبھی بھی ان کی تائید نہیں کرے گی اور نجی حیثیت سے ان کا منتخب ہونا محال ہوگا اس لئے بہترین صورت یہی ہے کہ اپنی تنقید کی قابلیت کو معطل ہو جانے دو اور حکومت ہی کے ساتھ ووٹ دو۔

موجودہ ہاؤس آف کامنز کی ساخت کے متعلق بعض اہل فکر نے یہ اعتراض عاید کیا ہے کہ اس کا طریق انتخاب اس قسم کا ہے کہ قوم کی صحیح نمائندگی اس کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔

بالخصوص ریمزے میور نے اس باب میں جو تحقیق کی ہے وہ قابل غور ہے[1]۔ ریمزے میور اور ان کے ہم خیال لوگوں کا کہنا ہے کہ موجودہ طریق انتخاب سے قوم کے صرف ایک حصے کی نمائندگی ممکن ہے۔ رائے دینے والوں کو اس کا موقع حاصل نہیں ہے کہ وہ قابل اور اعلیٰ سیرت رکھنے والے افراد کو اپنی نمائندگی کے لئے منتخب کر کے بھیجیں۔ موجودہ انتخاب کا طریقہ یہ ہے کہ ملک کو ۵۹۵ حلقہ ہائے انتخاب میں تقسیم کر دیا گیا ہے جن میں صرف ۱۸ حلقے ایسے ہیں جن سے دو دو نمائندے منتخب ہو کر آتے ہیں۔ باقی سب حلقوں سے ایک ایک نمائندہ منتخب ہوتا ہے۔ اگرچہ حلقہ ہائے انتخاب میں رقبہ اور آبادی کا کہیں کہیں تھوڑا بہت فرق پایا جاتا ہے لیکن حتی المقدور سب حلقوں کو دونوں اعتبار سے برابر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ معمولاً ہر حلقہ میں ۵۰ ہزار رائے دینے والے ہوتے ہیں۔ ہر حلقے سے جتنے امیدوار چاہیں انتخاب کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنے کے مجاز ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ اس حلقہ کے باشندے ہوں۔ صرف یہ لازمی ہے کہ ان کے نام کو اس حلقہ کے دس رائے دینے والے اپنے دستخط سے پیش کر دیں۔ موجودہ طریق انتخاب کے مطابق یہ ممکن ہے کہ اگر تین پارٹیاں ہاؤس آف کامنز کے انتخاب میں حصہ لے رہی ہوں تو ایک پارٹی جس نے مجموعی طور پر دوسری پارٹیوں کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں ووٹ حاصل کئے ہوں ایک نشست بھی حاصل نہ کر سکے۔ اسی طرح ہر حلقہ کے انتخاب میں مجموعی طور پر کم ووٹ حاصل کرنے والا منتخب ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک رکن کو ۱۵۰۰۰ ووٹ حاصل ہوئے، دوسرے کو ۱۴۹۹۹، تیسرے کو ۱۴۵۰۰ اور چوتھے کو ۵۰۰۱ تو پہلا امیدوار کثرت رائے سے منتخب سمجھا جائیگا اور اس حلقہ کے تمام رائے دینے والوں کا نمائندہ تصور کیا جائیگا۔ وہ ان کا بھی نمائندہ تصور ہوگا جنھوں نے اس کے خلاف رائے دی ہوگی جن کی تعداد ان سے زیادہ ہے جنھوں نے اس کی تائید

---

[1] دیکھو تفصیل کے لئے ریمزے میور کی کتاب How Britain is Governed ص ۱۶۲ تا ۱۸۴۔

کی ہے۔ انتخاب کے اس طریق کار کی تنظیم پارٹی بندی کے اصول پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ جس پارٹی کو ملک میں نسبتاً کم ووٹ ملے وہ ہاؤس آف کامنز میں اکثریت حاصل کرلیتی ہے اور حکومت قایم کرتی ہے۔ جنگ عظیم کے بعد اس کی دو مثالیں ملتی ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں اتحادی پارٹی (کولیشن کیبنٹ) نے ہاؤس آف کامنز میں ۴۷۲ نشستیں حاصل کی تھیں اور ان کے مخالفوں نے ۱۳۰ نشستیں حاصل کیں یعنی ہاؤس میں ۳۴ اور ۱۰ کا تناسب رہا حالانکہ اتحادی پارٹی نے ملک کے تمام انتخاب کرنے والوں کے ۵۲ فی صدی ووٹ حاصل کئے تھے اور ان کے مخالفوں نے ۴۸ فی صدی۔ اگر کل رائے دینے والوں کے تناسب سے دونوں پارٹیوں کو ہاؤس میں نشستیں ملتیں تو اکثریت رکھنے والی پارٹی کو ۳۴۲ نشستیں حاصل ہوتیں اور اس کو ۳۰ کی اکثریت حاصل ہوتی۔ لیکن کولیشن پارٹی نے ہاؤس آف کامنز جتنی نشستیں حاصل کیں ان کی بدولت اس کو سیاہ و سفید کا اختیار حاصل ہوگیا۔ ۱۹۲۲ء کے انتخاب میں قدامت پسندوں کو ملک کے مجموعی ووٹوں کے ۳۸ فی صدی ووٹ ملے لیکن ہاؤس میں ان کے ارکان نے ۳۴۷ نشستیں حاصل کیں اور انھیں دوسری پارٹیوں کے مقابلے میں ۷۹ کی اکثریت حاصل رہی۔ ۱۹۲۳ء کے انتخاب میں اگرچہ قدامت پسندوں نے ملک کے مجموعی ووٹوں کے ۳۸ فی صدی پھر حاصل کئے لیکن اس دفعہ ان کی نشستیں گزشتہ انتخاب کے مقابلے میں ۹۰ کم ہوگئیں۔ اس دفعہ ہاؤس میں انھیں اکثریت نہیں حاصل رہی اور لیبر پارٹی نے اپنی حکومت قایم کی۔ ۱۹۲۴ء کے انتخاب میں لیبر پارٹی نے ۱۵۱ نشستیں حاصل کیں حالانکہ ان کے امیدواروں کو مجموعی طور پر جو ووٹ ملے ان کے حساب سے انھیں ۲۸۹ نشستیں ملنی چاہیئے تھیں۔ اسی طرح ۱۹۲۹ء کے انتخاب میں لیبر پارٹی نے ہاؤس میں ۲۸۸ نشستیں حاصل کیں حالانکہ کل ووٹوں کے ۳۶ فی صدی ووٹ اس کو ملے تھے اور قدامت پرستوں کو مجموعی ووٹوں کے ۳۸ فی صدی ووٹ ملے اِس طرح لیبر پارٹی ہاؤس آف کامنز کی سب سے بڑی پارٹی ہوگئی۔ برخلاف اس کے اسی انتخاب میں لبرل پارٹی نے کل ووٹوں کی تعداد کے ۲۳ فی صدی ووٹ حاصل کئے جس کے اعتبار سے ہاؤس میں

انھیں ۱۴۱ نشستیں ملنی چاہیئے تھیں لیکن انھیں صرف ۸۵ نشستیں ملیں۔اس انتخاب میں اگر مجموعی ووٹوں کی مناسبت سے مختلف پارٹیوں کو ہاؤس آف کامنز میں نشستیں ملتیں تو قدامت پسند ۲۳۱، لبرل ۱۴۱ اور لیبر پارٹی ۲۴۴ نشستیں حاصل کرتے۔غرضکہ لیبر پارٹی نے باوجود ملک میں کم ووٹ حاصل کرنے کے اپنی حکومت قایم کرلی[1]۔ان اعداد وشمار سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہر انتخاب ایک طرح کا جوا ہوتا ہے جس میں ہر قسم کے امکانات ہوتے ہیں۔کبھی پانسہ ایک پارٹی کے موافق پڑتا ہے اور کبھی دوسری کے۔قوم کی قسمت کا فیصلہ اکثر و بیشتر سوچنے سمجھنے والوں اور معاملات پر رائے رکھنے والوں کے ہاتھ میں نہیں ہوتا بلکہ ان ناسمجھ، جاہل اور متلون عوام کے ہاتھ میں ہوتا ہے بلند آہنگ دعوؤں اور ناقابل وعدوں سے متاثر ہوکر کبھی کسی پارٹی کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں اور کبھی کسی کے ساتھ۔

۱۹۱۷ء میں جبکہ حقوق رائے دہندگی کی توسیع کے متعلق تحقیق ہورہی تھی تو اس مسئلہ پر بھی اسپیکرس کانفرنس میں غور کیا گیا کہ انتخابات کی مذکورہ بالا خرابیوں کو کس طرح دور کیا جائے اور کیا تدابیر اختیار کی جائیں کہ ہاؤس آف کامنز صحیح معنوں میں قوم کا نمائندہ بن سکے۔ اس کانفرنس نے اس ضمن میں جو تجاویز پیش کیں وہ تناسبی انتخاب[2] سے ملتی جلتی تھیں جس کی وجہ سے انگلستان کے طریق انتخاب میں دوررس تبدیلی پیدا ہوتی۔لیکن چونکہ ملک دونوں اہم اور بڑی سیاسی پارٹیاں یعنی کنزرویٹو اور لیبر ان تجاویز کے خلاف تھیں اس لئے ان پر عمل نہیں کیا گیا۔یہ دونوں پارٹیاں یہ چاہتی ہیں کہ انتخاب کے موجودہ طریق کار کو برقرار رکھا جائے اور اسے چھوا چھیڑا نہ جائے اسواسطے کہ اس سے بڑی پارٹیوں کو فائدہ ہے۔اگر نقصان ہے تو لبرل پارٹی کو ہے۔تناسبی انتخاب میں بڑی پارٹیاں نقصان میں رہیں گی اور لبرل پارٹی فائدہ میں رہے گی۔قدامت پسندوں اور لیبر پارٹی والوں کا خیال ہے کہ

---

[1] How Britain is Governed

[2] Proportional Representation

موجودہ طریق انتخاب کی بدولت لبرل پارٹی ختم ہو جائے گی اور اس کے ارکان ان دونوں میں اپنے اپنے رجحانات کے مطابق ضم ہو جائیں گے اور انگلستان کا دو پارٹی والا انتظام جو قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے وہ پھر قائم ہو جائے گا۔

اگرچہ یہ کہنا درست ہے کہ ہاؤس آف کامنز کی بحثیں اب محض دکھاوے کی رہ گئی ہیں۔ ان کا مقصد یہ نہیں رہا کہ مخالفوں کی رائے میں تبدیلی کی جائے لیکن تقریروں اور بحثوں سے یہ ضرور ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنے دل کے بخار نکالنے کا موقع مل جاتا ہے اور انتخاب کرنے والوں کے سامنے مختلف پارٹیوں کے ارکان کے دلائل اخبارات کے ذریعہ آجاتے ہیں اور وہ ان کے متعلق اپنی رائے قایم کر سکتے ہیں۔ بقول لاسکی "ان بحثوں کی بدولت اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ جب اہم مسائل معرض تنقید میں آئیں گے تو ہر موضوع کے متعلق جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ (ہاؤس آف کامنز میں) کوئی نہ کوئی شخص ضرور کہدے گا۔"[1]

انگریز قوم کا آج بھی اس بات پر ایقان ہے جبکہ دنیا میں ہر طرف عمومیت دھتکاری جا رہی ہے کہ لوگوں کی مرضی اور بحث و تنقید کے ذریعہ جو حکومت کی جاتی ہے وہ اس حکومت سے بدرجہا بہتر ہے جو اپنے مخالف کو حجت پیش کرنے کا موقع نہیں دیتی۔ انگریزوں کو اس کا قوی احساس ہے کہ آزادی رائے کو اپنے اظہار کے پورے مواقع حاصل ہونے چاہئیں اس لئے کہ اس کی بدولت امن عامہ مضبوط بنیادوں پر قایم رہ سکتا ہے۔ اس کے سبب سے ہر سیاسی پارٹی کو یہ حق حاصل رہتا ہے کہ وہ قوم کی اکثریت کو اپنے ساتھ کرلے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالے۔ چنانچہ ۱۸۳۲ء سے آج تک کوئی سیاسی پارٹی دس سال سے زائد بیک وقت اپنے ہاتھ میں اقتدار نہیں رکھ سکی اس طرح ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں کو اپنی مملکت کی خدمت کا موقع حاصل رہتا ہے اور خود

---

[1] پارلیمنٹری گورنمنٹ ان انگلینڈ۔ ص ۱۴۸۔

مملکت کی حیثیت ایک بے تعلق اور غیر جانبدار عنصر کی رہتی ہے[۱]۔ باوجود ان تمام رکاوٹوں کے جو پارٹی بندی کے سبب سے انفرادی اقدام پر عاید ہوگئی ہیں ہاؤس آف کامنز آج بھی دفتر شاہی حکومت کو غفلت سے بیدار کرنے اپنے فرائض منصبی کو بجالانے پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ ہاؤس آف کامنز چاہے حکومت کو انصاف کرنے اور ٹھیک بات کرنے پر مجبور نہ کرسکے لیکن اس کا اطمینان ضرور رہتا ہے کہ اس کے خلاف جو الزام لگائے جائیں گے ان کی صفائی پیش کی جائیگی اور معاملات کی پوری طرح چھان بین ہوگی جس کا نتیجہ مفاد عامہ کے لئے ہمیشہ مفید ہوتا ہے۔

---

[۱]۔ پارلیمنٹری گورنمنٹ ان انگلینڈ ص ۱۸۱۔

جدید چین

از
عبداللطیف اعظمی، بی اے (جامعہ)

آج سے ۳۲ سال قبل ۱۹۱۱ء میں چالیس صدیوں کی شہنشاہیت کے بعد، بالآخر چین میں جمہوری نظام کی داغ بیل ڈالی گئی۔ جمہوریت کے قیام کے مختلف اسباب تھے، جن کو سمجھنے کے لئے، چین کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ مگر چین کی تاریخ اس قدر طویل اور وسیع ہے کہ اس پر یہاں بحث و تنقید کرنا ممکن نہیں، اس لئے ابتدائی ۲۷۰۰ سال کو نظر انداز کرتے ہوئے، ۱۶۴۴ء سے ہم ابتداء کرتے ہیں، جبکہ مانچو خاندان شمال کی طرف حملہ آور ہو کر تخت پر قابض ہوا۔

منچو خاندان چینی نہیں تھا، مگر اس کے شہنشاہ بہت جلد چینیوں میں گھل مل گئے اور ان کی بہت سی خصوصیات اختیار کر لیں، مگر لباس اور طور طریق کا امتیاز پھر بھی باقی رہا اور چینیوں کی نفرت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ۱۸۴۰ء سے ۱۹۰۰ء تک کی تباہ کن جنگوں نے زمانۂ باکسر کی ذلتوں میں اور اضافہ کر دیا اور شاہی خاندان کے وقار کو بالکل ختم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تہذیب و تمدن کا رعب لوگوں کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ تائی پنگ کی بغاوت جو پندرہ سال (۶۴ - ۱۸۴۹ء) تک قائم رہی

جنگ عظیم سے بھی زیادہ مصیبت خیز اور المناک ثابت ہوئی ۔ اس میں Putnan weale کے تخمینے کے مطابق تقریباً ڈیڑھ سو ملین آبادی کام آئی ۔ ایک عرصہ تک منچو شہنشاہ اس پر قابو حاصل نہ کر سکے، آخر میں گارڈن کی مدد سے اسے دبانے میں کامیاب تو ہو گئے، مگر اس میں ان کی طاقت بالکل ختم ہو گئی ۔ اس کے بعد جاپان سے چین کی شکست (۱۸۹۴ء ۔ ۵) اور باکسر کی پیدا شدہ طاقتوں (۱۹۰۰ء) نے چینیوں کی آنکھیں کھول دیں اور ملک کے مفکرین کو شاہی نظام حکومت سے زیادہ بہتر اور مستحکم نظام حکومت بنانے کی دعوت دی ۔ لیکن ترقی کی رفتار پھر بھی بہت سست رہی، یہاں تک کہ تحریک باکسر کے گیارہ سال کے بعد یکایک انقلاب پھوٹ پڑا ۔

۱۹۱۱ء کا چینی انقلاب، انگلستان کے ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے، مگر روس اور فرانس کے انقلاب سے بالکل مختلف ہے، یہ انقلاب بر ژدآزی یا صاحب جائداد طبقہ کے خلاف نہیں تھا، بلکہ ایک مخصوص سیاسی نظام کے خلاف تھا جو چار ہزار سال سے چین میں قایم تھا ۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ملکیت جنگ اور فساد کا باعث ہوتی ہے اور عوام کو جب زندگی کو قایم رکھنے کے لئے روٹی اور تن ڈھکنے کے لئے کپڑا نہیں ملتا، تو ملک داخلی بدنظمی اور فساد کا شکار ہو جاتا ہے اور جب تک کوئی ایسا نظام قایم نہ ہو جائے جس میں پس ماندہ طبقہ کو زندگی کا حق حاصل ہو، یہ بے چینی اور اضطراب برابر قایم اور بڑھتا رہتا ہے ۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انقلاب چین میں یہ اسباب بھی بہت حد تک کام کر رہے تھے مگر ان کی حیثیت محض ثانوی تھی ۔ انقلاب کے بانی عوام نہیں تھے، بلکہ ملک کے سر بر آوردہ سیاست داں، جو ایک مخصوص سیاسی نظام کی جگہ ایک ایسے نظام حکومت کی طرح ڈالنا چاہتے تھے، جو محض چینیوں ہی کے لئے نیا نہیں تھا، بلکہ دوسری نسلوں کے لئے بھی ۔

اس انقلاب میں داخلی اور خارجی دونوں اسباب کام کر رہے تھے ۔ داخلی وجوہ دو تھے، ایک منچو کی غلط حکمرانی تھی ۔ چینی عوام کی یہ ممتاز خصوصیت رہی ہے کہ انھوں نے جابر حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا ۔ چی ان لن (۱۷۳۶ء ۔ ۹۶) کے

تمام جانشین شہنشاہ معمولی قابلیت کے تھے، اس لئے ٹھیک طور پر حکومت نہ کرسکے اور ٹیپنگ کی مشہور بغاوت ہوئی جس میں دس صوبے تباہ ہوئے اور تقریباً بیس ملین آدمی[1] کام آئے۔ اسی طرح باکسر تاریخ چین کی نہایت مشہور بغاوت ہے، جس میں چین کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ چینیوں کے دل میں خارجی طاقتوں کے خلاف سخت نفرت اور عداوت پیدا ہوگئی تھی، جس میں امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا۔

خارجی اسباب میں، اہم سبب یہ تھا کہ منچو حکومت، دوسرے ممالک سے اچھے تعلقات قایم رکھنے میں انتہائی نااہل ثابت ہوئی، جنگ کی شکستیں اور مصائب، سلطنت کی وسعت میں برابر کمی، خارجی طاقتوں کے امتیازی حقوق، یہ تمام چیزیں، چین کی آزادی کے لئے عظیم خطرہ تھیں اور چینی مفکرین کو منچو حکومت کی اصلاح پر مجبور کرتی تھیں، علاوہ ازیں جاپان کی بڑھتی ہوئی ترقی اور روس پر اس کی فتح سے چینیوں کے دل ودماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر وہ ملک کو جدید طریقوں سے منظم کریں تو وہ خارجی دباؤ کا مقابلہ کرسکتے ہیں انھوں نے محسوس کیا کہ اس طرح نہ صرف یہ کہ ایک آزاد قوم کی انھیں حیثیت حاصل ہو جائے گی، بلکہ جدید اور ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش وہ کھڑے ہوسکیں گے۔ اس احساس کے پیدا ہوتے ہی انھوں نے حکومت سے داخلی اصلاحات کا مطالبہ کیا، لیکن جب حکومت نے ان کے مطالبہ کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا تو انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے، بغاوت کے علاوہ اور کوئی راہ نظر نہیں آئی۔

سن یات سین پہلا شخص تھا جس نے منچو خاندان کو ختم کرنے اور جمہوری طرز حکومت قایم کرنے کے لئے انقلابی جماعتیں منظم کیں اور انقلاب کے لئے باقاعدہ اسکیم تیار کی۔ انھوں نے کینٹن پر قبضہ کرنے کی بارہا کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوسکی، اس جرم میں اسے بارہا جلاوطنی کی سزا ملی، اس سے ایک فائدہ ہوا، وہ یہ کہ ان چینیوں میں ان کے بہت سے

---

[1] Modern china by Sih-Gungcheng مطبوعہ ۱۹۱۹ء صفحہ ۱۴۔

ہم خیال پیدا ہو گئے، جو غیر ممالک خصوصاً امریکہ اور جاپان میں تھے اور یہ واقعہ ہے کہ انقلاب چین میں ان کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔

۹/ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو ووچنگ (صوبہ ہوپے) میں وائسرائے کے قتل کی ایک سازش کا انکشاف ہوا۔ سازش کرنے والوں نے عجلت اور مایوسی کے عالم میں بغاوت کردی۔ اس کارروائی کے چند ہی گھنٹے کے اندر شہر پر ان کا پورا قبضہ ہوگیا، وائسرائے بھاگ گیا اور صوبہ جاتی فوج کا بڑا حصہ غدر میں شریک ہوگیا، اس کی اطلاع پاتے ہی، شاہی حکومت نے جنرل ین چانگ اور وزیر جنگ کو شمالی فوج کے چند ڈیویژن کے ساتھ جس میں تقریباً ...۳۰ سپاہی تھے، باغیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا، لیکن ان کے پہنچنے سے قبل صوبے کے بہت سے شہروں پر باغیوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور دوسرے صوبوں نے شاہی حکومت سے تعلقات منقطع کر کے بغاوت میں شریک ہو گئے تھے۔

حالات اس قدر نازک ہو گئے تھے کہ ان پر قابو حاصل کرنا، ناممکن ہوگیا، اس لئے پرنس ریجنٹ نے نامزد نیشنل کونسل کو بہت سے حقوق دیئے، دستور کا اعلان کیا، جس میں شہنشاہ کے اختیارات کو کم کر کے، اسے محض برائے نام باقی رکھا اور حکومت کے تمام اختیارات منتخب لیجسلیچر کو دیئے۔ یان شی کائی کو، جسے اسی سال وزارت امور خارجہ سے علٰحدہ کیا گیا تھا، دوبارہ بلا کر وزیر اعظم مقرر کیا اور خود حکمرانی سے علٰحدہ ہوگیا۔ یان شی کائی چین کی جدید فوج کا بانی تھا، اس لئے کمانڈر اور فوج سب کے سب اس کا بہت احترام کرتے تھے اس کے علاوہ متعدد صوبوں میں وہ وائسرائے کے منصب پر بھی فائز رہ چکا تھا، اس لئے توقع تھی کہ جدید وزیر اعظم کے ان اثرات کی وجہ سے عوام کے اس بڑھتے ہوئے جوش و خروش کے باوجود ایک بڑی تعداد شاہی حکومت کی حامی ہو جائے گی۔

یان شی کائی اپنے وطن ہونان سے پیکنگ جس وقت پہنچا، تو انقلاب نہایت نازک حد تک پہنچ چکا تھا۔ تقریباً تیرہ صوبے بغاوت میں شریک ہو چکے تھے اور قریب قریب نصف سلطنت متاثر ہو چکی تھی۔ دریائے یانگسی سے کے جنوب میں انقلاب بے قابو آگ کی طرح ایک

ضلع سے دوسرے ضلع میں نہایت تیزی سے پھیل رہا تھا شنگھائی اور بہت سے شہروں کی عمارتوں اور دفتروں پر جمہوریت پسندوں کا جھنڈا لہرا رہا تھا، جن پر لکھا ہوا تھا کہ "منچو شہنشاہوں کو نکال باہر کرو۔"

اگرچہ انقلابیوں نے شاہ پسندوں کو پریشان کر دیا تھا اور بہت سے صوبوں کی انھیں حمایت حاصل ہو گئی تھی، مگر وہ فوجی اور مالی دونوں حیثیتوں سے شاہ پسندوں کے مقابل میں کمتر تھے۔ شمالی فوج، جو اب بھی شہنشاہ ـــــ یا جدید وزیر اعظم ـــــ کی وفادار تھی، انقلابی رنگ روٹوں یا جنوبی فوج کے مقابل میں زیادہ منظم اور بہتر تربیت یافتہ تھی، چنانچہ جب ہانکو کے قریب ان دونوں فوجوں میں تصادم ہوا، تو شاہی فوجوں نے ہانکو اور ہین یانگ پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور اس کا سب کو یقین ہو گیا تھا کہ ووچنگ پر بھی قبضہ ہو گیا ہے اور انقلابیوں کی کمر بہت ٹوٹ چکی ہے، مگر اسی درمیان میں دونوں جانب سے صلح کی خواہش ظاہر کی گئی (دسمبر ۱۹۱۱ء) چنانچہ جانبین سے نمایندے بھیجے گئے اور شرائط صلح پر غور کرنے کے لئے شنگھائی میں صلح کانفرنس منعقد ہوئی۔ انقلابیوں کا، شہنشاہ کی تخت سے دست برداری اور جمہوریہ کے قیام پر اصرار تھا اور شاہ پسندوں کا اس پر اصرار تھا کہ طرز حکومت، ایک نیشنل کنونشن کے ذریعہ طے کیا جائے ـــــ اور یہ واقعہ ہے کہ یہ نیشنل کنونشن کبھی بھی منعقد نہیں ہوا۔

یکم جنوری ۱۹۱۲ء کو نانکنگ میں جمہوری حکومت قایم کر دی گئی۔ ڈاکٹر سن یات سین کو صدر بنایا گیا۔ باغی صوبوں کے نمایندوں کی ایک اسمبلی بنائی گئی، جسے جمہوریہ کی پارلیمنٹ کی حیثیت حاصل تھی اور ایک عارضی دستور کا مسودہ تیار کیا گیا، جس کا اسمبلی کی منظوری کے لئے اعلان کر دیا گیا۔ اس موقع پر یان شی کائی نے، شاہی حکومت کی طرف سے حسب ذیل اعلان کیا،

> "مجھے شبہہ ہے کہ چین کے عوام فی الحال جمہوریہ کے لئے موزوں ہیں یا موجودہ حالات میں چینی عوام کے لئے جمہوری طرز حکومت منظور کرنا مناسب ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ محدود شاہی حکومت کی منظوری سے حالات معمول پر آجائیں گے

اور حکومت کو کم سے کم وقت میں استحکام حاصل ہو جائے گا۔ بہ نسبت ایسے طرز حکومت کے، جسے ابھی تجربہ کی منزلوں سے گذرنا ہے اور جو کم از کم موجودہ حالات میں چین جیسے ملک کے لئے بالکل ناموزوں ہے ..... موجودہ شہنشاہ کو باقی رکھنے کی حمایت، محض اس لئے کر رہا ہوں کہ میں دستوری شہنشاہی کا قائل ہوں۔ اگر ہم نے اس طرز حکومت کو اختیار کر لیا تو شہنشاہ کے علاوہ اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے، جس پر قوم اتفاق کرے گی .... میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اس نازک موقع پر چین کو فنا ہونے سے بچا لیا جائے اور ان تمام خرابیوں سے جو اس کے بعد آنے والی ہیں۔"

مگر جمہوریت پسند کسی حالت میں بھی اپنے مطالبہ سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھے، خصوصاً ایسی حالت میں، جبکہ تیرہ صوبوں نے جمہوریہ کو قبول کر لیا تھا اور جمہوریہ کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا جا چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہن یانگ پر قبضہ کرنے کے بعد، یان شی کائی نے انقلابیوں کو دبانے کی کوشش نہیں کی، اس لئے کہ شاہی حکومت سے زیادہ اسے اپنے شہنشاہ بننے کی فکر تھی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جمہوریت پسندوں کو اپنے مطالبہ پر اصرار تھا اور یان کی فوج میں اتنی قوت نہیں تھی کہ مخالف طاقت کو دبا سکے۔ اگرچہ یان شی کائی نے ان خیالات کو بے بنیاد قرار دیا ہے، لیکن جمہوریہ کے چوتھے سال (۱۹۱۵ء) اس نے اپنی شہنشاہیت کے لئے جو کوششیں کیں، اس سے اس خیال کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے۔

بہر حال صلح اور شہنشاہ کی پنشن وغیرہ کی گفت و شنید میں جنوری (۱۹۱۲ء) کا پورا مہینہ ختم ہو گیا۔ بالآخر یان اور جمہوریہ کے درمیان طے پایا کہ شاہی خاندان کو ۴۰۰۰۰۰۰ سالانہ پنشن ملا کرے گی اور شہنشاہ کو پیکنگ کے شاہی محل میں رہنے کی اجازت ہوگی اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا۔

اس انقلاب کے بعد، جمہوریت پسندوں کے رہنما اور انقلاب کے اہم بانی سن یات سین چین کے عارضی صدر منتخب ہوئے لیکن شمالی فوج ابھی تک شاہی خاندان کی وفادار

تھی، اس لئے انقلابیوں کی ان کے سامنے کوئی پیش نہیں گئی۔ ان کے کمانڈر انچیف یان شی کائی نے اس نازک موقع پر نہایت چالاکی اور تدبر سے کام لیا۔ اس نے اس شرط پر جمہوریت کو تسلیم کرکے، انقلابیوں سے صلح کرلی کہ سن یات سین کی بجائے اسے صدر بنایا جائے چنانچہ ۱۰ مارچ ۱۹۱۲ء کو اسے صدر منتخب کرلیا گیا۔ جنوبی چین کے مقابلے میں شمالی چین کی آبادی کا بیشتر حصہ فوجی تھا اور شی کائی نے جدید طریقے پر تربیت دی تھی، اس لئے قدرتی طور پر شمالی چین کا اسے پورا اعتماد حاصل تھا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اس اعتماد کے حصول میں ملک کے مفاد سے زیادہ اس کی خود غرضی کو دخل تھا، لیکن اس کے مرنے کے بعد، ملک میں جو انتشار اور افراتفری پھیلی، اس کے پیش نظر، اس کی پالیسی اور طریق عمل کی حمایت میں بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔

جمہوریہ کا کام چلانے کے لئے، ایک عارضی دستور بنانے کے لئے دستور ساز مجلس کا تقرر عمل میں آیا، جس نے اپنا کام کرنے کے بعد، باقاعدہ منتخب شدہ پارلیمنٹ کے لئے جگہ خالی کردی، جو اپریل ۱۹۱۳ء میں مستقل دستور وضع کرنے کے لئے منعقد ہونے والی تھی۔

پارلیمنٹ کا اولین فرض یہ تھا کہ وہ عارضی دستور کی جگہ ایک مستقل دستور وضع کرے۔ پارلیمنٹ میں انقلاب پسندوں کی اکثریت تھی، جن کا خیال تھا کہ صدر، دل سے جمہوریت کا حامی نہیں ہے بلکہ محض حالات نے اسے حمایت پر مجبور کیا ہے، اس لئے انھوں نے دستور میں ایسی قیود اور پابندیاں رکھنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے حکومت کے جملہ اختیارات پارلیمنٹ کو حاصل ہوں اور صدر اور اس کی کابینہ پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہو۔ یان شی کائی ملک پر حقیقی حکومت کرنا چاہتا تھا، نہ کہ ایسا عہدہ دار بننا جس کے اختیارات محض برائے نام ہوں، اس لئے اس نے مجوزہ دستور کی انقلابیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو اپنی رائے سے آگاہ کرنے کے لئے ان کے پاس نمایندے بھیجے، مگر پارلیمنٹ نے اس کے احتجاج کی مطلق پروا نہیں کی اور اس کے نمایندوں کی اس مداخلت کو پارلیمنٹ نے خلاف دستور تصور کیا۔

یان شی کائی کے لئے یہ مرحلہ بہت ہی مشکل تھا، مگر اسے اپنے مقصد میں کسی نہ کسی طرح

کامیابی حاصل کرنی تھی، اس لئے وہ نہایت خوشگوار کام کرنے کے لئے بھی تیار ہوگیا حکومت کو مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قایم کرنا اور خالی خزانے کو پر کرنا، اس کے لئے نہایت ضروری تھا اور اس کی آیندہ کامیابیوں کا تمام تر دارومدار محض انھی دو امور پر تھا۔ پہلے مقصد کے لئے اس نے تربیت یافتہ اور قابل اعتماد دوستوں کو کابینہ میں جگہ دی، مگر عارضی دستور کے مطابق کابینہ کے ممبروں کی نامزدگی کے لئے پارلیمنٹ کے ایوان کی منظوری ضروری تھی اور پارلیمنٹ کی اکثریت اس کی مخالف تھی، اس لئے مجوزہ فہرست میں سے بہت سے نام خارج کر دیئے گئے۔ دوسرے مقصد کے سلسلہ میں اس نے پیکنگ کے خارجی بینکوں سے گفت وشنید شروع کی، مگر یہاں بھی پارلیمنٹ راہ میں حائل تھی۔ عارضی دستور کی رو سے یا انقلابیوں کی تاویل کے مطابق وہ پارلیمنٹ کی اجازت کے بغیر کوئی قرضہ نہیں لے سکتا تھا، مخالفت کے ڈر سے اس نے پارلیمنٹ کی اجازت کے بغیر ہی قرضے کے معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ پارلیمنٹ کے انقلاب پسند ممبروں نے اسے دستور کی مخالفت تصور کیا اور انقلابی جماعت کے ممتاز ممبروں نے یان کی مخالفت میں باقاعدہ تحریک شروع کر دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شنگھائی میں بغاوت یا بہ الفاظ دیگر دوسرا انقلاب پھوٹ پڑا اور ایک دو ہفتہ میں یانگ ٹسی کے پانچ صوبے اس میں شریک ہو گئے۔

باغیوں کے ساتھ جنوب کی بہت سی فوجیں شریک ہوگئی تھیں اور انھوں نے ملک کے خاصے حصہ پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن صدر نے شمالی فوج کی مدد سے، تین مہینے کے اندر بغاوت کو ختم کر دیا۔ اس غیر معمولی کامیابی سے اس کے وقار اور رعب کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گیا اور پارلیمنٹ کے بہت سے ممبروں کو، جو جنوبی چین چلے گئے تھے، پیکنگ واپس آنے کی جرأت نہیں ہوئی اور جو واپس آئے یا جنھوں نے بغاوت میں کھلم کھلا حصہ نہیں لیا تھا، ان کا رویہ بہت صلح جویانہ اور معتدل ہوگیا۔ دستور کا مسودہ اب بھی نا تمام تھا۔ ملک میں امن پیدا کرنے اور جمہوریت کو خارجی طاقتوں سے منظور کرانے کے لئے جدید انتخاب اور مستقل صدر کی مسند نشینی نہایت ضروری تھی۔ مستقل دستور کے مسودہ کو مکمل کرنے

اور پورے دستور کو قانونی حیثیت دینے کے لئے کافی وقت کی ضرورت تھی، اس لئے طے کیا گیا کہ وہ حصہ، جس کا تعلق صدر کے انتخاب سے ہے، اسے پہلے منظور کرا کر شائع کر دیا جائے، چنانچہ ۴ر اکتوبر ۱۹۱۳ء شائع کر دیا گیا اور انتخاب کا کام پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کے سپرد کر دیا گیا۔ ۸ر اکتوبر کو یان شائی کائی جمہوریہ کا پہلا صدر منتخب ہوا۔

اپنی پوزیشن کو محفوظ اور مضبوط کرنے کے لئے صدر نے پارلیمنٹ کے ان تمام ممبروں کو، جو انقلابی جماعت کومن تانگ سے تعلق رکھتے تھے، علٰحدہ کر دیا اور ان کی خالی نشستوں کے لئے جدید انتخاب کا اعلان کیا، مگر یہ انتخاب کبھی بھی عمل میں نہیں لایا۔ اس کے بعد عارضی دستور کی نظر ثانی کے لئے ایک کونسل نامزد کی گئی۔ ذمہ دار کابینہ ختم کر دی گئی اور صدر، پالیمنٹ کی بجائے قوم کے سامنے جواب دہ سمجھا گیا، وزیر اعظم، سکریٹری آف اسٹیٹ ہوگیا اور کابینہ کے تمام ممبر اس کے ماتحت کر دیئے گئے۔ سینٹ کے ممبر، جنھیں صوبجاتی اسمبلیوں نے منتخب کیا تھا، نامزد کئے جانے لگے اور ایوان ادنیٰ کے اختیارات بہت زیادہ محدود کر دیئے گئے۔

ایوان نمایندگان کا اجتماع چونکہ ابھی زیر غور تھا، اس لئے انتخاب کے جدید قانون کی رو سے، سینٹ کو پارلیمنٹ کے فرائض انجام دینے کا حق دیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں صدارتی انتخاب کا جو قانون شائع کیا گیا تھا، اسے منسوخ قرار دیا گیا اور اس کی بجائے، دوسرا قانون منظور ہوا، جس میں صدر کو تین جانشین نامزد کرنے کا حق دیا گیا، جن میں سے کسی ایک کو پارلیمنٹ منتخب کر سکتی تھی۔

مطلق العنانی کا یہ دور ۱۹۱۵ء تک قایم رہا۔ طرز حکومت اگرچہ جمہوری نہیں تھا، مگر امن و امان قایم کرنے میں بہت مفید ثابت ہوا، صدر نے اپنی پوری طاقت، مخالفت کو ختم کرنے میں صرف کر دی اور ملک کو طاقت یا رشوت کے ذریعہ متحد کر دیا۔ ۱۹۱۵ء کے موسم خزاں میں ایک جماعت "امن کا منصوبہ" (جسے انگریزی میں Peace Plawning کہتے ہیں) کے نام سے قایم ہوئی، جس کا شروع شروع میں مقصد یہ تھا کہ جمہوری اور شاہی طرز حکومت کے نقائص اور اس کی خوبیوں پر محض علمی طور پر بحث و تنقید کی جائے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں،

کلمبیا یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اور اب صدر کے دستوری مشیر کار پروفیسر گڈنو نے ایک کتابچہ شائع کیا، جس میں دکھلایا گیا تھا کہ چین کے لئے جمہوری سے زیادہ شاہی طرز حکومت زیادہ موزوں ہے۔ اس جماعت نے اس رسالہ کے نظریوں کو بلا پس و پیش منظور کر لیا اور عوام میں اس خیال کی تلقین و اشاعت شروع کر دی۔ اس زمانہ میں یان شی کائی کے حکم سے، سیاسی کام کرنے والوں کی بہت بڑی تعداد، نقض امن کے بہانے سے، قید اور جلاوطن کی جا چکی تھی، مگر اس جماعت کی کوششوں پر کسی قسم کی پابندی عاید نہیں کی گئی، یہی نہیں بلکہ خفیہ ذریعوں سے اس کی پوری طرح ہمت افزائی اور سرپرستی کی گئی اور سرکاری ملازموں اور فوجیوں نے کھلم کھلا یان شی کائی کی شہنشاہیت کے قیام کے لئے جد و جہد شروع کر دی۔ صدر کی درخواست پر سینٹ نے ایک بل پاس کیا، جس میں اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کہ آیا طرز حکومت شہنشاہیت میں تبدیل کر دیا جائے، تمام صوبوں کو ایسے ممبر منتخب کرنے کی ہدایت کی گئی، جس میں مختلف خیالات کے لوگ شامل ہوں، مگر ہوں سب کے سب سرکاری اثر و اقتدار میں۔ بیس مختلف مرکزوں سے دو ہزار ممبروں نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ صدر کو شہنشاہ بنایا جائے۔ ابتدا میں صدر نے اس پیش کش کے قبول کرنے میں بہت تامل سے کام لیا، مگر بالآخر قوم کے "مفاد" کی خاطر تخت قبول کر کے، رات کا چین اور دن کا آرام حرام کرنا ہی پڑا (۱۹۱۵ء)۔

اس فیصلہ پر صوبہ یونان میں بغاوت پھوٹ پڑی اور چند مہینوں میں آس پاس کے متعدد صوبوں نے مرکزی حکومت سے تعلقات منقطع کر لئے اور بہت سے وہ لوگ بھی، جو یان شی کائی کی شہنشاہیت کے لئے کوشش کر رہے تھے، اس بغاوت میں شامل ہو گئے۔ اس کامیاب بغاوت کا وہ مقابلہ نہ کر سکا اور اس کی کمر ہمت ٹوٹ گئی۔ کہتے ہیں اسی صدمے سے وہ ۱۹۱۶ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

یان شی کائی کے انتقال کے بعد، دستور کے مطابق جنرل لی یان ہنگ جمہوریہ کا صدر منتخب ہوا۔ مگر اس وقت ملک میں عجیب ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ یان کے مضبوط ہاتھوں کے اٹھتے ہی فوجی گورنروں کو کھیل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے مرکزی حکومت کی اطاعت سے

انکار کر دیا اور اپنے اپنے صوبوں کی آبادی کو تخویفی طریقوں سے مرعوب کرنے کی کوشش کرنے لگے۔
جب کبھی کوئی خانہ جنگی ہوتی ہے تو کسی اصول کے لئے اور اس کا کوئی نہ کوئی مقصد اور نصب العین ہوتا ہے، مگر اس خانہ جنگی کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ مختلف گورنر مختلف صوبوں میں اپنی مرضی اور منشا کے مطابق حکومت کرنا چاہتے تھے اور بس۔ شمال اور جنوب کے اختلافات بھی کچھ نہ کچھ کام کر رہے تھے۔ مگر دستور کے وقار اور اہمیت کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔

صوبوں کے فوجی گورنر جنہیں Tuchun کہا جاتا تھا، پیکنگ کی مدافعت میں نہایت جبر و تشدد سے کام لے رہے تھے اور جن اضلاع پر ان کی حکومت تھی، ان میں پوری آزادی سے لوٹ اور غارت گری کر رہے تھے۔ انھوں نے ان محاصل کے علاوہ جنھیں خارجی ممالک وصول کرتے تھے، جیسے نمک کا ٹکس، بقیہ تمام مالیہ روک لیا، وہ محض برائے نام پیکنگ کے متعین کردہ تھے، ورنہ عملی طور پر ان کا وجود محض ان کے صوبوں کی فوج کی حمایت کی وجہ سے قایم تھا۔ مرکزی حکومت تقریباً دیوالیہ ہو چکی تھی اور عام طور پر وہ فوج کی تنخواہیں نہیں دے سکتی تھی، اس لئے وہ لوٹ کھسوٹ سے کام لیتے تھے اور Tuchun کی ناجائز وصول شدہ رقم سے اپنا کام چلاتے تھے، یہ افراتفری ممکن ہے جلد ختم ہو جاتی ہے، مگر جاپان کا مفاد اس میں تھا کہ یہ زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قایم رہے، اس لئے جب کبھی کوئی جماعت کامیاب ہوتی نظر آتی تو جاپان اس کے مخالفوں کی مدد پر آ کھڑا ہوتا۔ ایک مرتبہ پیکنگ میں تین نہایت اہم Tuchun کی ملک کی تقسیم کے لئے کانفرنس منعقد ہوئی، وہ، صدر اور وزیراعظم کے ساتھ، جو خارجی طاقتوں کی نگاہ میں اب بھی چین کے نمایندے تھے، بہت ہی معمولی اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔ ان تینوں "معزز حضرات" کو دارالسلطنت سے رخصت کرنے کے لئے نام نہاد حکومت کو اپنے دیوالیہ خزانہ سے ایک خطیر رقم دینی پڑی، جس کے متعلق اخبارات کا بیان ہے کہ ۱۱ ملین ڈالر تھی۔ اس رقم کا بڑا حصہ چانگ سولن وائسرائے منچوریا کو دیا گیا اور تقریباً اتنی ہی رقم جاپان کے ایک آلۂ کار کو دی گئی، جس نے اسے منگو لیا بھجدیا، جو اس وقت بغاوت میں نہایت سرگرمی سے حصہ لے رہا تھا۔

بہرحال انتہائی جنوب میں ایک مختلف قسم کی حکومت قایم ہوگئی تھی، کینٹن جو چینی انتہا پسندوں کا ہمیشہ مرکز رہا ہے، شمالی فوج کی جابرانہ حکومت کا جوا اُتارنے میں کامیاب ہوگیا اور سن یات سین کی صدارت میں ۱۹۲۰ء کے موسم خزاں میں ایک ترقی پسند اور نمایندہ حکومت قایم کی۔ یہ حکومت محض دو صوبوں پر مشتمل تھی ایک Kwangting پر جس کا دارالسلطنت کینٹن تھا دوسرے Kwangsi. پر۔ شروع شروع میں تو معلوم ہوتا تھا کہ یہ پورے جنوب پر حاوی ہو جائے گی، مگر صوبۂ ہونان کے قریب شمالی جنرل او پائی فو نے اسے آگے بڑھنے سے بالکل روک دیا۔

غرض کہ چین ادھر اندرونی اختلافات اور داخلی نزاعات میں مبتلا تھا، ادھر خارجی مسائل، خصوصاً جنگ کے پیدا شدہ حالات پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے جا رہے تھے۔ چین جنگ عظیم میں اتحادیوں کی طرف سے محض اس لئے شامل ہوا تھا کہ جنگ کے بعد اسے اچھے دن نصیب ہوں گے، مگر طاقت، طاقت کے سامنے جھکتی ہے، کمزور، چاہے کتنا ہی مظلوم اور حق پر کیوں نہ ہو، اس کا دنیا میں کوئی حامی اور مددگار نہیں۔ چنانچہ لائڈ جارج، وزیر اعظم برطانیہ، مسٹر ولسن صدر امریکہ اور کلے مان شیو، وزیر اعظم فرانس نے مشرق میں جاپان کے اقتدار کو تسلیم کرلیا اور چین کو جاپان کے رحم و کرم اور نالہ و شیون کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

ظاہر ہے ان عظیم طاقتوں کے فیصلے کے سامنے چین جیسی کمزور اور غیر منظم حکومت کو سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا، مگر اپنے گریبان پر، بہرحال اس کا "زور" تھا چنانچہ جاپان کے خلاف چینی عوام کے دلوں میں سخت نفرت پیدا ہوگئی اور انھوں نے جاپان کی جملہ مصنوعات کا نہایت کامیاب بائیکاٹ کیا۔ ملک میں ایک طرف جاپان کے خلاف یہ کوششیں جاری تھیں، دوسری طرف شمال میں فوجی عہدہ دار ذاتی مفاد کے لئے خانہ جنگیوں میں مشغول تھے، اس سے بین الاقوامی حالات متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ امریکہ اور جاپان کے تعلقات اس قدر خراب ہوگئے تھے کہ کھلم کھلا جنگ کی گفتگو شروع ہوگئی تھی، برطانیہ، جاپان کا اتحادی تھا اس لئے اب اس کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ ان دونوں میں سے کس کا ساتھ دے۔ ان حالات میں صدر ہارڈنگ نے

عظیم طاقتوں کی واشنگٹن میں کانفرنس بلائی۔ واشنگٹن کانفرنس (۱۲ نومبر ۱۹۲۱ء تا ۶ فروری ۱۹۲۲ء) میں سات معاہدے مرتب ہوئے، مگر اب ان میں سے محض دو کو اہمیت حاصل ہے، پہلے معاہدہ کی رو سے برطانیہ، امریکہ، جاپان، فرانس اور اٹلی، حسب ترتیب ۷، ۱ء۷، ۱۔۳۔۵۔۵ کے تناسب سے اپنے تجارتی یا جنگی جہازوں اور طیارہ بردار جہازوں میں کمی کریں گے۔

اگرچہ اس معاہدہ میں محض جنگی جہازوں اور طیارہ بردار جہازوں پر پابندی عاید کی گئی تھی اور کروزر، ڈسٹرائر، آبدوز کشتیاں اور دوسرے معمولی ہتھیار وغیرہ اس سے مستثنیٰ تھے، مگر اس معاہدہ نے تقریباً پندرہ سال کے لئے بحری جنگ کی تیاری کو روک دیا۔ ۱۹۳۰ء میں لندن میں ایک اور معاہدہ ہوا، جس میں چھوٹے جہاز بھی شامل کر دیئے گئے، ان دونوں معاہدوں کی مدت ۱۹۳۶ء تک تھی۔

دوسرا معاہدہ نو طاقتوں کا معاہدہ کہلاتا ہے، اس پر برطانیہ، امریکہ، فرانس، اٹلی، بلجیم، ہالینڈ، پرتگال، جاپان اور چین کے نمایندوں نے دستخط کئے۔ اس کی رو سے چین کی انتظامی اور ملکی سالمیت کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان تمام ملکوں کے لئے مساوی طور پر چین میں دروازہ کھلا رہے گا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ عالمی طاقتوں نے "کھلے دروازہ" کی پالیسی کو تسلیم کیا۔

ان دو معاہدوں کے علاوہ واشنگٹن کانفرنس نے جاپان کو مجبور کیا کہ وہ سائبیریا سے اپنی فوجیں واپس بلائے، جرمن اجاروں کو چین کو واپس کردے اور شانٹنگ میں چین کو مراعات دے۔ اسی کے ساتھ اینگلو جاپانی اتحاد کو مسترد کر دیا گیا، نیز عظیم طاقتوں نے وعدہ کیا کہ بحرالکاہل کے اپنے جزیروں میں، دوسرے جزیروں کی خاطر، بحری طاقت میں مزید اضافہ نہیں کریں گے۔

واشنگٹن کے معاہدوں کے بعد، چین کو اندرونی اصلاحات اور باہمی اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا کرنے کا موقع ملا۔ مگر جن کا مفاد ہی اس میں ہو کہ چین میں کبھی امن و امان اور اتفاق و اتحاد پیدا نہ ہو، وہ اس کا موقع کب دیتے، چنانچہ ان کی دعا اور کوشش سے ۱۹۲۴ء میں پھر شمال میں خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں۔ مارچ ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر سن یات سین اختلافات کو دور

کرنے کے لئے پیکن گئے، مگر ۱۵ر مارچ کو انتقال ہوگیا۔ ان کے بے وقت انتقال سے چین کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور چین ایک مخلص رہنما اور بے لوث خادم سے محروم ہوگیا۔ مگر قوم نے جس گرویدگی اور جوش وخروش سے ان کی تعلیمات اور اصول پر عمل کیا، اس سے ملک کو غیر معمولی فائدہ پہنچا۔

ڈاکٹر سن کے انتقال کے بعد، کچھ عرصہ تک کومن تانگ میں یکجہتی اور شیرازہ بندی رہی، مگر یہ حالت زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہ سکی۔ بہت جلد پھوٹ پڑ گئی اور دو جماعتیں پیدا ہوگئیں۔ ایک "دایاں بازو" کے نام سے مشہور ہوئی اور دوسری "بایاں بازو"۔ بیگم ڈاکٹر سن، سونگ چنگ لنگ کا بیان ہے کہ "اگر ڈاکٹر سن یات سین اس وقت زندہ ہوتے تو بائیں بازو کا ساتھ دیتے"۔[1] عام طور پر حکومت کے عہدہ دار دائیں بازو کے حامی تھے، کچھ اس لئے وہ اصلاحات کے حامی نہیں تھے اور کچھ اس لئے کہ مستحکم حکومت اور مضبوط فوج کے قیام کو وہ ملک کی اصلاحات پر مقدم تصور کرتے تھے۔ بائیں بازو میں کمیونسٹ تھے جنھیں، جنوری ۱۹۲۴ء میں ڈاکٹر سن نے کومن ٹانگ میں شامل کر لیا تھا۔ یہ چین کی اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں یکسر انقلاب چاہتے تھے، ان کا خیال تھا کہ چینی انقلاب سے اس وقت تک کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا، جب تک کہ فوجی نظام کے حامیوں کو قومی تحریک کے ماتحت نہ کیا جائے اور جدید چین کو خارجی کنٹرول سے نجات نہ دی گئی۔ چانگ کائی شک کو، جو دائیں بازو کے حامیوں میں تھے، سب سے زیادہ سیاسی اتحاد کی فکر تھی، ان کا خیال تھا کہ اب روسیوں کی مدد کی ملک کو چنداں ضرورت نہیں۔ اس پالیسی کی وجہ سے انھیں برطانیہ اور امریکہ وغیرہ کی حمایت حاصل تھی۔ انگلستان، واشنگٹن اور پیرس انھیں دوسرا کمال اتاترک بننے کی اجازت دے سکتے تھے، مگر دوسرا ٹراٹسکی یا لینن بننے سے ہر قیمت پر روکنے کے لئے تیار تھے۔

بائیں بازو کے لیڈر رانگ چنگ وی اور دائیں بازو کے ہوہان من۔ ہوہان من کچھ

---

[1] Pringle. China Struggles for Unity. صفحہ ۴۹۔

عرصے کے بعد انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ چانگ کائی شک نے لی اور بعد میں وانگ کو شکست دے کر خود کومن تانگ کے صدر بن گئے۔ چانگ کائی شک نے اس کامیابی کے بعد کومن تانگ کی تنظیم کی طرف توجہ کی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک بائیں بازو کے اثر کو بالکل زائل نہیں کیا جائے گا، مقصد میں کسی قسم کی کامیابی حاصل کرنا ناممکن ہے، اس لئے ۱۹۲۷ء میں قومی حکومت کو نانکن میں منتقل کیا، کمیونسٹوں کو ہانکاؤ سے نکالا اور کمیونسٹ جماعت کو خلاف قانون قرار دیا۔ ان کارروائیوں سے فارغ ہونے کے بعد سن یات سین کی جانشینی کا اعلان کیا اور اس کے تینوں اصولوں کو اپنی حکومت کا نصب العین قرار دیا۔ چانگ کائی شک کی ان کارروائیوں سے، اس میں شبہہ نہیں کہ کمیونسٹ جماعت کو بہت زیادہ نقصان پہنچا، ان کو غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور کائی شک کی حکومت میں ان کا وجود ختم ہو گیا، مگر وہ ان نامساعد حالات سے دل برداشتہ ہونے کے بجائے، اپنی تنظیم میں پہلے سے زیادہ سرگرم ہو گئے چنانچہ کچھ ہی عرصے کے بعد کمیونسٹ جماعت پھر منظر عام پر آگئی۔ چانگ کائی شک کو ان کی قوت توڑنے کے لئے متعدد جنگیں لڑنی پڑیں۔ مگر چین کی سویٹ حکومتیں ۱۹۳۴ء تک باقاعدہ مقابلہ کرتی رہیں، یہ سلسلہ جب کسی طرح ختم ہوتا نظر آیا اور دوسری طرف جاپان کی دست و برد کا سلسلہ چین میں برابر بڑھتا جا رہا تھا، تو ملک کے چند بہی خواہوں نے دسمبر ۱۹۳۶ء میں چانگ کائی شک کو گرفتار کر کے کسی نامعلوم مقام پر نظر بند کر دیا، بالآخر مادام چانگ کائی شک کے تدبر اور ان کی کوششوں سے چانگ کائی شک کمیونسٹ جماعت میں صلح ہوئی اور ۲۵ دسمبر کو کائی شک رہا کئے گئے۔ اس صلح کے بعد چین کی خانہ جنگیاں ختم ہو گئیں اور پورا چین ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو گیا۔ اسی سال (۱۹۳۶ء) جمہوریہ چین کا مکمل دستور شائع کیا گیا اور عوام کی اصلاح و ترقی اور ملک کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے نہایت تیزی سے کام شروع ہوا۔ ۷ جولائی ۱۹۳۷ء کو جاپان نے چین پر بغیر کسی وجہ کے حملہ کر دیا۔ اس حملہ سے چین کے رہے سہے اختلافات بھی جاتے رہے اور پوری قوم، نہایت یکجہتی اور اتفاق و اتحاد کے ساتھ

حملہ آور کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ ڈاکٹر سن کے بعد چین کا کوئی مسلمہ لیڈر نہیں تھا، قوم نے چیانگ کائی شک کو اپنا واحد قائد تسلیم کیا اور ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دے دی۔ اس جنگ کو سات سال سے زیادہ ہو چکے ہیں، اگر جاپان جیسی عظیم طاقت، چین جیسے غیر مسلح اور کمزور ملک کو ابھی تک شکست نہ دے سکی، صرف اس لئے کہ چین کی جنگ صحیح معنی میں عوام کی جنگ ہے اور عوام کو شکست دینا آسان نہیں۔

ہندستان کی شماریات آبادی

اور

عمرانیاتی تشریح

ڈاکٹر جعفر حسن، صدر شعبۂ عمرانیات، جامعہ عثمانیہ

گنادے کا مفہوم

انسانی آبادی کی گنتی، مختلف معاشی اور سماجی حیثیتوں کی کیفیت، آبادی کی جنسی، عمرداری، پیشہ ورانہ تقسیم، مختلف طبقوں، فرقوں، قوموں، نسلوں، جماعتوں کی تعلیمی و تمدنی کیفیت، بیاہوں اور بن بیاہوں کی تعداد، بیاہ کے وقت ان کی عمریں، بچوں کی تعداد، پہلی اولاد کی پیدائش کے وقت والدین کی عمریں آخری اولاد کی پیدائش کے وقت والدین کی عمریں، شرح پیدائش، شرح بقا، شدید بیماریوں اور وباؤں میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد اور مرنے والوں کی شرح، کل اموات کی تعداد اور شرح، رنڈووں اور بیواؤں کی تعداد اور شرح، کمانے اور کھانے والوں کی تعداد، ذرایع معاش، اوسط فی کس آمدنی، سرمایہ یا مقروضیت کی کیفیت، زیر کاشت اور افتادہ زمینوں کا رقبہ، پیداوار فی مربع میل، زرعی جانوروں، غذائی جانوروں اور استعمالی جانوروں کی تعداد اور ان کے باہمی

تقابل کو سنسس کہتے ہیں۔ یہ جدید زمانے ہی کی خصوصیت ہے کہ ہر دہائی (دس برسوں کی مدت) کے بعد تمام ترقی پذیر ملکوں میں باضابطہ طور پر آبادی کی تعدادی نوعیت معلوم کی جاتی ہے اور مختلف معاشی، سماجی، سیاسی، تعلیمی، اخلاقی اور صحت عامہ سے متعلق حقایق کو اعداد و شمار میں واضح کیا جاتا ہے۔ غرض تہذیب و تمدن کے بہتیرے امور پر اعداد و شمار اکٹھا کئے جاتے ہیں اور بسا اوقات صرف اعداد کو دیکھنے اور دوسرے ملکوں کے اعداد سے ان کا مقابلہ کرنے سے بڑی دل چسپ، حیرت انگیز اور بشرط بصیرت، سبق آموز باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

یہ اعداد سبق سکھانے اور اچنبھے میں ڈالنے والے ہوں یا نہ ہوں، مگر وہ دل چسپ ضرور ہیں، کم سے کم ان لوگوں کے لئے جو اپنی تہذیب و تمدن کی اصلیت معلوم کرنا چاہتے ہوں اور جہاں تک ہو سکے حقایق کی روشنی میں اپنی رائے اور فیصلے قائم کرنا چاہتے ہوں۔

سب سے پہلے یہی ذہن نشیں کرنا چاہیئے کہ سنسس کو مردم شماری کہنا ٹھیک نہیں! کیوں ٹھیک نہیں؟ اس کے بارے میں سب سے پہلے ایک لطیفہ سنئے!

مردم شماری یا گنا وا؟

کسی ضلع کی خبر تھی:

"According to the latest census there are 25,000 buffaloes in our district."

دفتر کے سرکاری مترجم نے لکھ دیا:

"حالیہ مردم شماری کے مطابق ہمارے ضلع میں
پچیس ہزار بھینسیں ہیں!"

انسانوں کی گنتی سے بھینسوں کی تعداد معلوم کرنا، کیا خوب! اس لطیفے سے ہم یہ سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ مترجم سے زیادہ یہ ہماری زبان کا قصور ہے جس میں Census کے لئے صرف مردم شماری کا لفظ ہے۔ اور یہ لفظ Census کے پورے مفہوم پر حاوی نہیں۔

آپ جانتے ہیں ہندی میں اسے کیا کہتے ہیں؟ **मनुष्य गणना**

یعنی (منشیہ گنڑنا) کیسا ثقیل لفظ ہے! سنسکرتیت میں ڈوبا ہوا۔ بوجھل اور معنے وہی مردم شماری

لہذا ناقص اور نامکمل! جس طرح ہمارے لئے مَنشیہ گنُرنا کی ترکیب ناقابل قبول، ویسی ہی مردم شماری کی اصطلاح ہندی دانوں کے لئے ناقابل فہم! کیونکہ صرف "مردم" کا لفظ اردو میں استعمال نہیں ہوتا۔ انسان شماری یا آدمی شماری ہوتا تو بھی غنیمت تھا کیونکہ اردو میں کہتے ہی ہیں کہ "دس آدمی آچکے ہیں!" "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا!" مگر یہ کوئی نہیں کہتا کہ "دو مردم آچکے ہیں" اس گانو میں ۔۔۔ ۲ مردم ہیں!" چونکہ ہم مردم کا لفظ نہیں بولتے لہذا اس کے سمجھنے میں ہندی دانوں کو دقت ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ بدرجہا بہتر ہوگا کہ سنس کو گنا وا کہا جائے جو نہ صرف جامع اصطلاح ہے بلکہ ہندی دانوں اور اردو دانوں کے لئے یکساں آسان۔ بہرحال آپ مانیں یا نہ مانیں، ایک تجویز تو میں نے پیش کردی۔ ایسے ہی لفظ ہندی اور اردو کا مشترک سرمایہ ہوسکتے ہیں بشرطیکہ ہم بے تعصبی سے ان کا استعمال کریں اور اردو داں فارسیت زدگی سے بچ کر ہندی اردو میں مستعمل لفظوں سے بنائی ہوئی اصطلاحوں کی مخالفت نہ کریں، مردم شماری اور منشیہ گنرنا بوجھل اور کٹھن ہونے کے علاوہ سنس کے پورے مفہوم کو ادا نہیں کرسکتے، اس لئے ایک نیا لفظ ضروری تھا اور میرا خیال ہے کہ اس مفہوم کو گنا وا واضح کرتا ہے جو ہندی اور اردو دانوں کے لئے آسان ہوگا۔

کیا اعداد صحیح ہوتے ہیں اعداد و شمار کے متعلق یہ طنزیہ فقرہ مغربی ملکوں کے علمی حلقوں میں بہت مشہور ہے کہ

"جھوٹ کی تین قسمیں ہیں: ایک تو معمولی جھوٹ،
دوسری مہا جھوٹ اور تیسری اعداد و شمار!"

یہ طنزیہ فقرہ بالکل بے بنیاد نہیں کیونکہ نااہلی، مطلب پرستی یا نادانی کی وجہ سے غلط سلط اعداد جمع کرلئے جاتے ہیں یا ان میں عمداً کمی بیشی کی جاتی ہے یا ان کو "توڑ مروڑ" کر پیش کیا جاتا ہے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ غلط، متاثرہ اور تبدیل شدہ اعداد کے ذریعہ "استدلال" کرنا صرف اعداد تک مخصوص نہیں ہے، اکثر بیانات، گواہیاں، تحریریں اور نام نہاد علمی مقالے اور تحقیقی کتابیں بھی اسی قسم کی ہوتی ہیں: کچھ باتیں نااہل لوگ سچ مان کر لکھ دیتے ہیں،

کچھ باتیں غرض مند، متعصب یا فتنہ انگیز لوگ جان بوجھ کر یا نیم شعوری طور پر بدل کر پیش کرتے ہیں اور کچھ نادان لوگ اپنی عقل کے زعم میں ناقص یا ناکافی تحقیق سے سچ مان لیتے ہیں۔

بہر حال اعداد و شمار کی حد تک یہ سچ ہے اور ہمیں اعتراف ہے کہ وہ بعض مرتبہ محض فرضی، اکثر "رنگین" اور صرف چند صورتوں میں غیر جانب دارانہ ہوتے ہیں اور شاذ و نادر ہی قابل بھروسہ اہل افراد کے ذریعہ جمع کئے جاتے ہیں۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ سب اعداد و شمار یکلخت غلط ہوتے ہیں، نیز ہوشیار واقف کاروں یا تجربہ کار ماہروں کے لئے بلکہ ذہین نقادوں کے لئے ناممکن ہے کہ وہ ان مختلف قسم کے اعداد و شمار میں فرق پیدا کر سکیں علمیات اور منطق کے اصولوں کو منطبق کر کے یا محض عام معلومات اور فہم عامہ کی مدد سے ہم کھرے کھوٹے اعداد پرکھ سکتے ہیں۔

سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے اور سچ اور جھوٹ کی ملاوٹ کو تاڑنے کے لئے جو معیار منطق اور علمیات نے دریافت کئے ہیں ان ہی کی مدد سے اعداد کی درجہ بندی ہو سکتی ہے مثلاً ہمیں یہ خیال کرنا چاہئے کہ

"اعداد و شمار کا کیا ماخذ ہے؟"

"کیا یہ ماخذ ہر قسم کے اعداد و شمار کی صحت کا ضامن ہو سکتا ہے؟"

ہمیں معلوم ہے کہ ہندستان کی سروے کئی بار ہو چکی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس کا رقبہ ۱۵ لاکھ، ۸۱ ہزار پانسو دس مربع میل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ناپ یا حساب کی غلطیوں کی وجہ سے اس کا حقیقی رقبہ کچھ اور ہو یا سیاسی مقبوضات میں تبدیلی یا انتظامی تبدیلیوں کی وجہ سے اس کا صحیح رقبہ یہ نہ ہو مگر اتنا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ رقبہ پندرہ لاکھ سے زیادہ اور ساڑھے سولہ لاکھ چوکور میل سے کم ہے۔ اور یہ غلطی بھی ناپ اور حساب کی وجہ سے ہوی ہوگی۔ ہم فہم عامہ کی مدد سے کوئی وجہ نہیں سوچ سکتے کہ ان اعداد کے غلط کرنے میں کسی فریق کی بھی کیا غرض ہو سکتی ہے لہذا رقبوں کی وسعت، ندیوں کی لمبائی، پہاڑی چوٹیوں کی اونچائی، سمندر کی گہرائی وغیرہ کی

حد تک تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نہ صرف ہندستان بلکہ تمام دنیا کے اعداد تقریباً صحیح ہیں۔ البتہ جب ہم ہندستان کے معاشی، سیاسی اور سماجی واقعات کو اعداد و شمار کی روشنی میں معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کئی دقتیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ

۱۔ توہم پرستی، یا لاپرواہی کی وجہ سے خود لوگ غلط بیانی کرتے ہیں اور صحیح واقعات بتانے سے انکار کرتے ہیں۔

۲۔ نا اہل، کم تجربہ کار اور سہل کار شمار کنندے انٹ شنٹ اندراج کرلیتے ہیں۔ ان کے علیحدہ کرنے اور جمع کرنے میں مزید غلطیاں ہوتی ہیں۔

۳۔ آخر میں غرض مند یا حاکم طبقہ اپنی سہولت اور فایدہ کی وجہ سے اس میں اور تبدیلیاں کرتا ہے یا من مانے طور پر کانٹ چھانٹ کرتا ہے۔

ہندستان اور ہندستان کی طرح تمام زوالی اور جمودی ملکوں میں لوگ گنا دے کی نوعیت اور اہمیت سے نا واقف ہیں۔ بہتیری مائیں اپنی اولاد کی صحیح تعداد بتانے کو بدشگونی تصور کرتی ہیں! ہزاروں لوگ ہیں جو خاص کر اپنی بیٹیوں کی تعداد بتانے میں "ایشیائی شرم و غیرت" (!) محسوس کرتے ہیں۔ بعض مشرق پرست یا مشرق پسند افراد ہیں جنھوں نے دو دو تین تین بیاہ کرلئے ہیں یا ایک باضابطہ بیوی کے علاوہ دوسرا نکاح چوری چھپی کرلیا ہے مگر یہ سب باتیں شمار کندہ کو بتاتے ہوئے انھیں "شرم" آتی ہے! بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنی بیاہتا بیوی کو "عالم برزخ" میں پہنچا دیا ہے اور کسی نئی نویلی کے ساتھ گذر بسر کر رہے ہیں۔ یہ لوگ بھی کثرت ازدواج کو ظاہر نہیں کرتے۔ غرض سیکڑوں مختلف وجہوں سے لوگ جانتے بوجھتے غلط بیانی کرتے ہیں یا سچ باتوں کو چھپاتے ہیں۔ غرض مندی، مطلب پرستی، نخوت اور شرم کے علاوہ محض شیخی سے غلط بیانی کرتے ہیں اور بوڑھے اپنی عمریں لکھانے میں، پڑھے لکھے اپنی زبان دانیاں جتانے میں ایسا مبالغہ کرتے ہیں کہ اسے سفید جھوٹ سے تعبیر کرنا صحیح ہوسکتا ہے۔ روگیوں اور معذوروں کی تعداد چھپانا اور پڑھے لکھوں کی تعداد بڑھانا ایک عام مرض ہے! خاندانی لاج!

ہندستان میں بہتیرے شمار کنندے گنا دے کا کام اعزازی طور پر انجام دیتے ہیں، مرکزی دفتروں میں کئی لوگ ہوتے ہیں جو شماریات کے فن اور اصول سے نا واقف یا برائے نام واقف ہوتے ہیں، اکثریت میں تساہل اور سہل کاری پائی جاتی ہے۔ بعض شمار کنندے، خاص کر دیہات میں، خود نیم تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور نا تو شماریاتی محکموں کی ہدایتوں کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان کی پروا کرتے ہیں۔ میں نے گنتیاں دیکھی ہیں جو ایسی پیچیدہ زبان میں لکھی تھیں کہ ان کا سمجھنا رازدار تحریر کی تحقیق کرنے کے برابر تھا!

عام طور پر عمر وار تقسیم کے اعداد بڑے غلط ہوتے ہیں کیونکہ خود لوگوں کو اپنی عمریں نہ تو معلوم ہوتی ہیں اور نہ یاد رہتی ہیں! شمار کنندہ صاحب کسی تاریخی واقعہ یا فطری سانحہ کی مدد سے عمر معلوم کر لیتے ہیں اور اٹکل سے لکھ ڈالتے ہیں۔ ایک بوڑھے اور بچہ میں تو فرق کرنا آسان ہے مگر بیس سے پچاس برس تک کی عمر والوں میں درجہ بندی کرنا آسان نہیں، خاص کر جب کہ عورتیں پردے میں ہوں اور ——— مردوں کے ڈاڑھی ہو!

یہاں مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ ۱۹۴۱ء کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اصحاب کے سامنے میں ان ہی خیالوں کو بیان کر چکا تھا۔ آخر ایک دن جب کہ ہمارے گھر ایک سکھ مہمان آئے ہوئے تھے میں نے ایک دوست سے جنھیں عمر شناسی کا بڑا دعوے تھا، اپنے سکھ مہمان کی عمر دریافت کی۔ ان کی والدہ بھی ساتھ تھیں، جن کے چہرے پر غروب حسن کا آخری نور تھا۔ میرے دوست نے بیٹے کی عمر ۴۰ اور ماں کی عمر ۳۵ بتائی! انھیں معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی کہ وہ بھائی بہن نہیں، بلکہ ماں بیٹے ہیں جن کی صحیح عمریں ۲۷ اور ۴۲ ہیں!

عمروں سے زیادہ وجہ موت متعین کرنا بہت دشوار ہے۔ سانپ کے کاٹے اور طاعون میں فرق کرنا یا ہیضے یا چیچک سے ہونے والی اموات میں فرق کرنا نسبتاً آسان ہے مگر "بخار" سے واقع ہونے والی موتوں میں فرق کرنا کیوں کر ممکن ہے؟ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ملیریا، ٹائیفائیڈ، دق اور گردن توڑ بخار کے مختلف اعداد نہیں ملتے اور اعداد کے نہ ہونے کو اچھے اچھے لوگ بیماری کا نہ ہونا تصور کر لیتے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، چند سال پیشتر ہمارے ملک کے ایک بڑے ادیب نے، جو خو فلسفہ اور منطق کے عالم ہیں اور سچائی کے مبلغ اور دعوے دار بھی، دق سے مرنے والوں کی تعداد کا حوالہ دے کر، یہ ثابت کیا تھا کہ ہمارے ملک میں دق کم ہے، اور امریکہ میں زیادہ اور اپنے بیان کے ثبوت میں انھوں نے سرکاری اعداد پیش کئے تھے! ان کے ادیبانہ شذرے کا لب لباب یہ تھا: یورپ اور امریکہ کی تہذیب و ترقی کے باوجود وہاں دق پھیل رہا ہے اور کتنے ہزاروں آدمی، صحت گاہوں اور ماہروں، ہسپتالوں اور دق کے انسدادی اداروں کے ہوتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہیں مگر ہمارے ہاں نسبتاً اور مقابلتاً مشرقیت، خاندانی طریق زندگی کے باوجود بفضلہ خیریت ہے! ایک اور موقع پر موصوف ہی نے امریکہ کے مجرموں، ملزموں اور مجرمانہ مقدموں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا حوالہ دے کر ان کا تقابل ہندستان کے اعداد سے کرتے ہوئے مغربیت کی زوال پذیری اور مشرقیت کی برتری، اخلاقی عظمت اور روحانی استحکام کا ثبوت دینا چاہا تھا۔ اعداد سرکاری ماخذوں سے لئے گئے تھے اور بالکل ٹھیک تھے اور اس تقابل سے یقیناً پڑھنے والوں کی عظیم ترین اکثریت کو دھوکہ ہوا ہوگا اور وہ اعداد و شمار سے واضح کردہ بلندی و پستی کے قایل ہو گئے ہوں گے۔ اس شذرے کے جواب میں مَیں نے ایک معروضہ لکھا اور توقع کی تھی کہ صداقت کی خاطر اس کو بھی شایع کر دیا جائیگا کہ امریکہ کے جرمیاتی اعداد کے بڑھنے کے کئی سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ آبادی بڑھ رہی ہے اور ظاہر ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے تناسب سے اگر مجرموں، ملزموں اور مجرمانہ مقدموں میں اضافہ ہو تو یہ مطلق معنے میں اضافہ نہیں، صرف اضافی معنے میں اضافہ ہے! بلا شبہہ ہندستان کی آبادی میں بھی اضافہ ہوا لہٰذا غیر جانب دارانہ تقابل کے لئے لازمی تھے کہ خود ہندستان کے دس بیس اور تیس سال پہلے کے اعداد دئے جاتے۔ امریکہ کے جرمیاتی اعداد کے زیادہ ہونے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ امریکہ ایک ترقی پذیر ملک ہونے کی حیثیت سے اپنی تنظیم کو بڑھا رہا ہے، اس کا جرم تفتیشی محکمہ بلند تر معیار پر پہنچ گیا ہے۔ امریکہ میں سختی سے قوانین کی پابندی کرائی جاتی ہے۔ بڑا چھوٹا امیر غریب، صدر کا بیٹا اور قلی کا بیٹا، عالم کا لڑکا اور کسان کا لڑکا، سب ایک ہیں، عدالت عاملہ سے بے نیاز

ہے۔ بلاشبہہ ناانصافیاں ہوتی ہیں، رعایتیں ہوتی ہیں، مہربانیاں کی جاتی ہیں معصوموں کو پھانسا جاتا ہے مگر نسبتاً بہت کم کیونکہ عدالت اور عاملے کی تفریق سے مرعوبیت کا امکان نہیں، علانیہ اطاعت گذاری اور فرماں برداری قطعی طور پر ناممکن! اسی طرح رشوت ستانی کی وہ گرم بازاری نہیں جو مشرقی ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ ان حقیقتوں کے برعکس ہمارے ہاں مجرموں کی تحقیق و تفتیش کرنا تو بڑی بات ہے، جن جرموں اور مجرموں کا پتہ چلتا ہے وہ بھی گوناگوں اسباب کی بنا پر منظر عام پر نہیں آنے پاتے اور منظر عام پر آبھی جائیں تو انھیں رجسٹر پر نہیں چڑھایا جاتا اور نہ عدالت کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور رجسٹر پر چڑھا بھی دیا جائے تو بعد میں نظر انداز کیا جاتا ہے اور کارگذاری ثابت کرنے یا کسی اور غرض یا مصلحت سے چھپا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ سنی سنائی باتوں یا ناقابل بھروسہ حوالوں کی بنا پر نہیں بلکہ ذاتی معلومات سے میں کہہ سکتا ہوں کہ حادثے، قابل انسداد، حادثے، ہوتے ہیں جن کا ذکر سرکاری رپورٹ میں نہیں ہوتا، مشتبہ حالات کے تحت کوئی "غائب" ہو گیا مگر کھوج نہیں کیا گیا، ہٹا کٹا تن درست توانا لڑکا "سانپ کے کاٹے" سے مرگیا اور لاش بغیر تفتیش نذر آتش کردی گئی، لوگوں نے خودکشی کرلی مگر وجہ موت خاندان والوں نے چھپائی اور افسر معلومات کے باوجود انجان بن گئے وبا کے زمانے میں محلہ والے مرگئے تو تعداد کم ظاہر کی گئی یا بالکل چھپا کر لکھ دیا کہ "فلاں فلاں محلوں میں فضل رہا"! یہ ایک عام واقفیت ہے کہ یورپی اقوام سچائی کی قربانی صرف جنگ کے زمانے میں کرتے ہیں اور حقیقی نقصان بتانے سے گریز کرتے ہیں، ہمارا یہ وتیرہ امن میں بھی ہوتا ہے! پھر بھی اچھے اچھے واقف کار منطقی اور فلسفہ کے جانے پہچانے اصولوں سے مسلح، صداقت کے مبلغ یا تو دھوکہ کھاتے ہیں، یا دھوکہ دیتے ہیں! اور ایک نادان مبلغ کی حیثیت سے خود گمراہ ہو کر دوسروں کو مغالطے میں ڈالتے ہیں یا ایک تنگ نظر عقلیت زدہ محقق کی حیثیت سے اپنی اور دوسروں کی گمراہی کا باعث بنتے ہیں۔ امریکہ کے جرمیاتی اعداد کا مقابلہ تنظیمی نقطہ نظر سے امریکہ کے ہم درجہ اور امریکہ کی طرح آزاد ملک سے ہو سکتا ہے! ہندستان جیسے مفتوح، محکوم اور نا اہل ملک سے جرمیاتی اعداد کا مقابلہ کرنا اور اس تقابل سے اپنی برتری کا ثبوت اخذ کرنا تعلیم یافتہ

مشرقیوں کی بھولی غفلیت اور بر خود فریفتہ منطقیوں کی رعونت ہے!

اس امر کو معلوم کرنے کے لئے کہ "کیا اعداد صحیح ہوتے ہیں؟" ہمیں شماریات اور سیاست کے باہمی تعلق پر بھی غور کرنا چاہیئے۔ ہر حکومت اپنی پالیسی کو جائز اور مفید ظاہر کرنے کے لئے اپنے مطلب کی باتوں کی تشہیر کرتی ہے اور اپنے خلاف مواد کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ خاص کر آمریت اور سامراجیت میں دروغ بافی اور جھوٹے سچے اعداد کی ملمع سازی اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ انگریزی حکومت انگلستان میں اور ہے، ہندستان میں اور! جاپان میں جاپانیوں کی حکومت کے بارے میں جو کچھ جاپانی کہتے ہیں یا اپنی صنعت و حرفت، زراعت و تجارت کے بارے میں جو کچھ اعداد پیش کرتے ہیں، اسے خواہ مخواہ غلط تصور کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں، مگر یہی جاپانی جب کوریا کی صنعت و حرفت کی ترقی کے ابھارے ہوئے اعداد[1] پیش کرتے ہیں، اور شرح اموات کو گھٹا کر بیان کرتے ہیں تو ہمیں احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ حاکم و محکوم کے مفادوں میں تضاد ہوتا ہے اور تضاد کے باوجود ہم آہنگی ظاہر کرنے کی کوشش میں اعداد پر رنگ چڑھانا گویا لازمی ہو جاتا ہے، یہی حال، جزوی طور پر وہاں پایا جاتا ہے جہاں حکومت طبقہ واری یا فرقہ واری ہوتی ہے اور اس لئے ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیئے، اور رنگ آمیزی کے احتمال کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔

ہندستان میں گناوے کی اہمیت

اعداد و شمار تمدن فہمی کے لئے ضروری تو ہیں ہی، اس کے علاوہ وہ سرکاری پالیسی اور قومی سیاست کی تشکیل میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ قومی تعمیری تحریکوں اور قومی تعمیری محکموں میں اعداد و

---

[1] ابھارے ہوئے اعداد یا ابھرائے ہوئے Inflated figures

شمار کی اور زیادہ اہمیت ہے مستقبل کی تنظیم میں موجودہ زمانے کے اعداد و ست بڑی مدد مل سکتی ہے، بشرطیکہ اعداد صحیح ہوں! ورنہ گمراہی کا خطرہ ہوتا ہے۔ البتہ یہ سب خصوصیتیں ہر ملک کے گناوے میں ہوتی ہیں۔ ہندستان میں گناوے کی غیرمعمولی اہمیت کی دو اور وجہیں ہیں: سرکاری خدمتوں اور ملازمتوں کا ہندیانا اور قانون بنانے والی مجلسوں میں فرقہ واری نیابت!

ہندیانا یعنے INDIANIZATION دو سو سال پہلے تک تقریباً سارے ہندستان میں ہندستانیوں کا راج تھا۔ بڑے سے بڑے افسر سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے خدمتگار تک اور ملک التجار سے لے کر چلر فروش تک، بڑے بڑے ٹھیکہ داروں سے لے کر معمولی کسانوں، دہقانوں تک سب کے سب ہندستانی ہوتے تھے یا ہمیشہ کے لئے ہندستان آکر بس جانے والے ہوتے تھے۔

فرنگی حکومت کے استحکام کے ساتھ ہی ہندستان کی سیاست و معیشت میں ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی جس سے ہندستان کو اس سے قبل سابقہ نہیں ہوا تھا؛ وہ یہ کہ قدیم آریاؤں یا مسلمان حملہ آوروں کی طرح یہ فرنگی نہیں آرہے تھے اور نہ ہمیشہ کے لئے اپنا وطن چھوڑ کر ہندستان میں آبسنے کے لئے آتے تھے بلکہ ان کا مقصد تجارت، خدمت، ملازمت یا حکومت ہوتا تھا اور وہ تھوڑے عرصے میں جتنا ہو سکے کما کر اپنے وطن واپس چلے جاتے تھے اور کبھی مستقل طور پر وطن بسائی کی خاطر نہیں آتے تھے۔

تبدیل شدہ سیاست اور حکومت کا یہ نتیجہ ہوا کہ مختصر یا طویل عرصوں کے لئے یا فوجی یا سیول خدمتوں کو انجام دینے کی خاطر آنے جانے والوں کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ کوئی بھولا بھٹکا قسمت کا مارا ہندستان پر رہ پڑا تو رہ گیا ورنہ عام طور پر سب عہدہ دار اور تاجر، ٹھیکہ دار اور دوسرے پیشہ ور چند برسوں کے لئے قیام کرکے اور زیادہ سے زیادہ پچیس تیس سال بعد اپنے وطن واپس چلے گئے۔ اسی لئے ہندستان میں ایک ایسا حاکم طبقہ وجود میں آیا جس کے افراد مستقل طور پر ہندستان میں نہیں رہتے تھے اور ہندستانی تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھے، ہیں اور رہینگے!

جب تک انسان ہمیشہ کے لئے ترک وطن کرکے نئے وطن میں نہیں آبستا، وہ بیگانہ ہی رہتا ہے اور

اسے اپنے ہی ملک سے لگاؤ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے برخلاف پرتگالیوں، فرانسیسیوں اور ظاہر ہے سب سے بڑھ کر انگریزوں کی بدولت ہندستانیوں کو نقصان پہنچا اور ان کی تہذیب حکومت کی امداد اور سرکار کی سرپرستی سے محروم ہوگئی۔ سب سے بڑا نقصان تو یہی تھا کہ تمام بڑے بڑے عہدے غیر ہندستانیوں کے ہاتھوں میں تھے اور تمام بڑے بڑے ٹھیکے انگریزی کمپنیوں کو ملتے تھے صنعت وحرفت، تجارت، بنک کاری، وکالت، بیمہ تعلیم اور فن کاری کے توسط اور ــــــ بہانے سے ہزاروں نہیں لاکھوں انگریزوں کو براہ راست اور بالواسطہ فایدہ پہنچتا رہا، اب بھی پہنچ رہا ہے اور جب تک ان کی مطلق العنانی قائم رہے گی یہی من مانا فایدہ پہنچتا رہے گا۔ وہ زمانہ تو رہا نہیں کہ فوج کے تمام چھوٹے بڑے افسر، سپہ سالار، صناع، موسیقی اور مصوری کے ماہر، عہدہ دار، تاجر سب کے سب ہندستانی ہوں، تمام بڑے عہدے انگریزوں کے سپرد ہوئے، اور صرف ادنےٰ ملازمتیں ہندستانیوں کے لئے مختص ہوئیں۔

اب تو چند نیم اہم یا کم اہم محکموں کے اعلےٰ انتظامی افسر ہندستانی ہیں، اور تقریباً تمام محکموں اور سررشتوں میں ہندستانیوں کا تقرر کیا جاچکا ہے مگر پچاس ساٹھ سال قبل ہماری حالت اور بھی بدتر تھی کیوں کہ اس وقت بلا استثنا تمام اچھے عہدوں پر انگریز ہی انگریز ہوتے تھے۔ جیسے جیسے ہندستانی اپنے حقوق کے لئے لڑ رہے ہیں اور عزت وآزادی کے لئے قربانیاں کر رہے ہیں، اسی قدر ملک کے انتظامی عہدوں پر ہندستانیوں کا تقرر بڑھتی ہوئی تعداد اور تناسب سے کیا جارہا ہے اور گذشتہ جنگ عظیم کے بعد سب سے پہلے ایک ہندستانی کو ایک صوبے کا گورنر بنایا گیا تھا اور اس کے بعد کئی ہندستانیوں کو اس قابل تصور کیا گیا کہ منصرمانہ طور پر گورنری کریں! مگر اب تک فینانس، مالگزاری، فوج جیسے محکموں پر کسی ہندستانی کا تقرر محکمے کے اعلےٰ ترین افسر کی حیثیت سے نہیں کیا گیا اور نہ کسی اور محکمے میں تمام اختیار ہندستانیوں کے سپرد کر دئے گئے بلکہ ہر جگہ، حتیٰ کے تعلیم اور صفائی کے سررشتوں میں قواعد کی تبدیلی، نافذہ قانون کی تنسیخ، عہدہ داروں کی برطرفی یا معطلی گورنر کے ہاتھ میں، اور گورنر کو ہٹانے کا حق وائسرائے کو ہے اور وائسرائے سے استعفیٰ طلب کرنے کا مجاز وزیر ہند، وزیر ہند کا مختار وزیر اعظم ہے جو صرف اپنی پارٹی اور

برطانوی پارلیمان کے ماتحت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں تک نوبت نہیں آنے پاتی یا سب مخالفتیں ساتھ ساتھ یا وقت واحد میں نہیں ہوتیں مگر اصولی طور پر یہ کہنا صحیح ہے کہ تمام ملک کا سارا انتظام آج بھی دستوری طور پر انگریزوں کے ہاتھوں میں ہے مگر وہ لوگ زمانے کی ہوا کے ساتھ ساتھ اپنے اختیار خود ہی کم استعمال کرتے ہیں اور پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہندستانیوں کو مختلف عہدوں پر مقرر کرتے ہیں۔ اسی کو اصطلاحی زبان میں **Indianization** یعنے ہندیاؤ کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کے مختلف محکموں میں اور ہر محکمے کے مختلف درجے یا نوعیت کے عہدوں پر انگریزوں کی بجائے ہندستانیوں کا تقرر کرنا، ٹھیکوں کی تقسیم میں ہندستانی کاروباریوں کا لحاظ رکھنا، سرکاری وکیل یا ماہر مقرر کرتے وقت ہندستانیوں کو بھی مد نظر رکھنا، تحقیقاتی، تفتیشی، مشاورتی، قانونی، عدالتی کمیٹیوں، کمیشنوں، مجلسوں وغیرہ میں ہندستانیوں کی تعداد اور تناسب کو بڑھانا، ان میں اہم خدمتوں پر ہندستانیوں کا تقرر کرنا۔ ہندیاوی تحریک کا آغاز یوں تو گذشتہ صدی ہی میں ہوچکا تھا مگر تقسیم بنگالہ، روس، جاپانی جنگ، سودیشی تحریک، تحریک خودمختاری، پہلی جنگ عظیم جیسی اثر انگیز واقعات سے اس کو بے حد تقویت ہوئی اور ملک بھر میں مقبول ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں ہندستان کی دستوری اساس کا مشورہ دینے کے لئے سرجان سائمن کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا جس کے ارکان میں ایک بھی ہندستانی نہیں تھا۔ ایک اہم مشاورتی اور تفتیشی کمیشن میں ہندستانیوں کی عدم نمایندگی کو تمام جماعتوں، طبقوں، فرقوں اور ملتوں نے ذلت محسوس کی اور جنھوں نے اس کمیشن سے اشتراک عمل کیا، انھیں بھی ناگوار گذر رہا تھا۔ اسی قسم کا ناگوارا اور عام طور پر از حد ناپسندیدہ طریق عمل حیدرآباد نے ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ اختیار کیا تھا جب کہ لندن کی کمپنی سے حیدرآباد کی ریلیں خریدنے سے قبل ریلوے کی مالیت مشخص کرنے کے لئے دو ریلوے انجنیر ماہروں کی خدمتیں مستعار لی تھیں اور ان کو اپنے ماہرانہ مشوروں کے لئے فیاضانہ معاوضہ دیا تھا۔ حیدرآبادیوں کو یہ بات سخت ناگوار گذری تھی کہ کروڑوں روپئے کی مالیت حاصل کرتے وقت، قیمت کا تعین اور حکومت کو مشورہ دہی دے رہے ہیں جو کتنے ہی بڑے ماہر سہی مقامی حالات اور قیمتوں سے ناواقف یا کم واقف تھے اور جن کی ہمدردی انگریزوں کے موافق

اور جن کے غیر شعوری تعصب سے حیدرآباد کو نقصان ہونے کا سخت اندیشہ تھا! یہ بات بھی رائے عامہ اور سنجیدہ طبقوں کی فہم عامہ کو کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھی کہ ایک طرف محکمہ انجینیری کے مستعد عہدہ داروں کی مہارت کی تعریفیں کی جاتی تھیں اور دوسری طرف ریلوے کے خریدنے کے وقت ان کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ بہرحال یہ اور اسی قسم کے موقعوں پر لوگوں کو ہندستانیوں کی عدم موجودگی سخت ناگوار گذرتی تھی اور وہ اس بات کو بری طرح محسوس کرتے تھے کہ ملک ہمارا، دولت وجائداد ہماری، مگر قبضہ اور تصرف دوسروں کا، اور شان حکومت بھی نیم نادرشاہی جس میں ہمارا عمل دخل تو درکنار، مشاورتی تجویزیں پیش کرنے کا بھی حق نہیں! ٹیکس ہم دیں، روپیہ ہم ادا کریں مگر بڑے بڑے تنخواہ پانے والے افسر سب کے سب انگریز ہوں! محنت ومشقت ہم کریں، حکومت جتانے کے لئے فرنگی ہی فرنگی ہوں، جنھیں نہ ہم سے غرض اور نہ ہماری تہذیب سے کسی قسم کی ہمدردی! یہ خیال پھیلتا گیا کہ ہمارے ملک میں کروڑوں لوگ ہیں، ان میں لاکھوں پڑھے لکھے ہیں، ہزاروں عالم اور ماہر ہیں، یا کسی قدر کوشش سے بن سکتے ہیں، مگر پھر بھی بڑی خدمتوں پر یا اہم خدمتوں پر ان کا تقرر نہیں کیا جاتا؟ کیا کروڑوں میں ایک بھی اس قابل نہیں کہ کسی سررشتے یا محکمے یا تعلقے کی تنظیم ونگرانی کر سکے؟!

پبلک کے تقاضوں، مختلف اداروں کے مطالبوں اور ایک منظم جماعت کے بااثر ہنگاموں سے مجبور ہو کر حکومت نے ہندیاوے کے اصول کو مان لیا ہے اور بڑھتے ہوئے قومی شعور اور معیار ایثار کے مطابق مرکزی اور صوبائی حکومتیں مختلف خدمتیں ہندستانیوں کے لئے مختص کر رہی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مطالبے کرنے والے یا ان مطالبوں کی خاطر قربانیاں کرنے والے اور ہیں اور ان کے طفیل سے خدمتیں پانے والے اور! قربانیاں ایک کرے، عہدے اور ترقیاں دوسروں کو ملیں! بوتا کوئی ہے، کاٹتا کوئی ہے! اس کا بھی نام دنیا ہے۔ غرض بڑھتی ہوئی تعداد اور تناسب سے ہندستانیوں کا تقرر ہو رہا ہے اور مختلف سرکاری خدمتیں ہندیائی جا رہی ہیں۔

ہندیانے کی ایک حقیقی مثال ۱۹۳۰ء میں سرکاری ریلوں کی یورپی عہدہ داروں کی تعداد ۳,۷۷۴ تھی مگر ۱۹۳۸ء میں سرکاری ریلوں کے یورپی عہدہ داروں کی تعداد ۲,۵۰۸ ہوگئی تھی، گویا اس مدت میں جتنی جائیدادیں خالی ہوئی تھیں ان میں سے زیادہ تر جائیدادوں پر ہندستانیوں کا تقرر ہوا تھا۔ اسی کو ہندیانا کہتے ہیں۔ موجودہ جنگ کی وجہ سے چونکہ کئی انگریزوں کو اہم تر اور زیادہ بھروسے کی خدمتیں تفویض کی گئی ہیں، لہٰذا ان کی بجائے بہت سے ہندستانیوں کا تقرر ہوا ہو تو کچھ عجب نہیں۔

فرقہ واری نیابت یعنے Communal Representation سرکاری ریلوں میں عہدہ داروں کے اعداد سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیان میں کئی عہدے ہندستانیوں کو ملے مگر کن ہندستانیوں کو یہ عہدے ملے؟ ہندوؤں کو؟ عیسائیوں کو؟ مسلمانوں کو؟ سکھوں کو؟ اور ہندوؤں میں بھی برہمنوں کو یا ہریجنوں کو؟

ہمارا ملک محکوم ملک ہی نہیں بلکہ فرقہ واریت میں مبتلا ملک ہے! ہمیں صرف اس حقیقت سے تشفی نہیں ہوتی کہ ہمارے اپنے ملک کے انتظام میں اپنا ہی بڑھتا ہوا عمل دخل ہو، بلکہ آبادی کی مختلف جماعتوں خاص کر فرقوں میں سب کا حصہ ہو، اور یہ حصہ متعلقہ فرقے کی تعداد کے تناسب سے ہو۔ ظاہر ہے کہ کسی انتظامی سررشتے میں بھی یہ ناممکن ہے کہ عہدوں کی تقسیم اور ترقیوں میں محض فرقہ واری نمایندگی کے اصول پر عمل ہو مگر فرقہ واری نمایندگی کو یک لخت نظرانداز کرنا یا کسی خاص فرقے یا جماعت ہی سے زیادہ تر ہندستانیوں کا انتخاب کرنا، بقیہ فرقوں یا جماعتوں کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک کے انتظام میں سب کا حصہ ہو، ہندوؤں کا اور پارسیوں کا، عیسائیوں کا اور مسلمانوں کا، سکھوں کا اور ہریجنوں کا اور ہر ایک کو حصہ اس کی تعداد کے مطابق یا اہم آہنگ ملے۔ اسی طریق کو فرقہ واری نیابت یعنے Communal Representation کہتے ہیں۔

فرقہ واری نیابت کی دو حقیقی مثالیں لیجئے

۱۹۳۱-۳۲ء میں سرکاری ریلوں کی مختلف خدمتوں اور عہدوں پر ۱۴،۳۹۸ ہندستانی عیسائی تھے۔ ۱۹۳۹-۴۰ء تک ان کی تعداد میں ۳،۶۴۳ کا اضافہ ہوا اور ہندستانی عیسائیوں کی کل تعداد جو سرکاری ریلوں سے براہ راست مستفید ہو رہی تھی ۱۸،۰۴۱ ہوگئی۔[1]

۱۹۳۰-۳۱ء میں سرکاری ریلوں کی مختلف خدمتوں اور بعض عہدوں پر ۱،۷۲،۹۰۵ مسلمان مامور تھے۔ ۱۹۳۹-۴۰ء تک ان کی تعداد میں ۱۵،۴۴۵ کی کمی ہوئی۔ مسلمانوں کی یہ تعداد اور بھی کم ہوتی اگر ریلوں کو بعض علاقوں میں معمولی اور ادنےٰ خدمتوں پر مسلمان ہی مسلمان بھرتی کرنے کی مجبوری نہ ہوتی۔ مثلاً سرحدی صوبے میں، ریلوے کلرک، دفتری، چپراسی، پٹریاں بدلنے والے، پٹریاں درست کرنے والے، چوکی دار وغیرہ زیادہ تر مسلمان نہ ہونگے تو کیا عیسائی ہونگے؟ مگر جہاں مسلمانوں کی اقلیت ہے، مثلاً متوسط صوبے میں وہاں ان کو نظر انداز کر دیا جاسکتا ہے اور حقیقت میں نظر انداز کیا بھی جاتا ہے۔ چنانچہ وہاں کے مسلمانوں کی عام شکایت ہے جس صوبے میں پانچ فی صدی مسلمان ہوں سرکاری ریلوے میں نوکریاں حاصل کرنے والوں کی تعداد ایک فی صد سے کم ہے! چونکہ علاقہ واری یا صوبائی اعداد علحدہ علحدہ نہیں دئے جاتے اس لئے سرکاری اعداد کے حوالے سے سنی سنائی باتوں کی تصدیق کرنا ممکن نہیں مگر مختلف سمتوں، طبقوں اور فرقوں کی مسلسل اور دیرینہ شکایتوں سے یہ اندازہ لگانا غلط نہیں کہ شاکیوں کے گلے بیجا نہیں ہیں۔ اور جو نیکی یا انصاف ریلوے مجبوراً کرتی ہے وہ بھی نہ ہوتی تو مسلمانوں اور ہریجنوں کے حق میں ناانصافی اور بھی زیادہ ہوتی۔ کیونکہ خود سرکاری اعداد سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ سرکاری

---

[1] الجھاؤ کے خیال سے میں نے مختلف اعداد کے ماخذوں کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ صرف مثال کے طور پر یہاں حوالہ دیتا ہوں۔ یہ اعداد Statistical abstract for Br. India کی اٹھارویں اشاعت، مطبوعہ گورمنٹ پریس، کلکتہ ۱۹۴۲ء کے صفحہ نمبر ۶۴۴ سے حاصل کئے گئے ہیں۔

ریلوں میں جو ہند یادی طریق Indianizing process جاری ہے،
اس میں سراسر ناانصافی اور مصلحت کار فرما ہیں کیونکہ جس رفتار اور تناسب سے خدمتیں ہندیائی
جارہی ہیں، اسی رفتار یا تناسب سے ہندستان کے سب فرقے اور جماعتیں یا علاقے اور طبقے،
نسلیں اور ملتیں مستفید نہیں ہورہی ہیں۔

تفصیلی طور پر اعداد و شمار کا تقابل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریلوے کے اعلےٰ یورپین
عہدہ دار سب سے زیادہ ہندستانی نژاد یورپی لوگوں یعنے انگلو انڈین یا ہندستانی فرنگیوں پر،
اس کے بعد ہندستانی عیسائیوں پر اور آخر میں پارسیوں اور برہمنوں پر مہربانیاں کرتے ہیں
اور زیادہ تر ان ہی میں فیاضی سے خدمتیں تقسیم کرتے ہیں اور سب سے زیادہ گھاٹے میں
سکھ، مسلمان اور "نیچ" تصور کئے جانے والے اور "اچھوت" کہلانے والے ہندو ہوتے ہیں جنھیں
گاندھی جی نے ہریجن کا معزز نام بخشا ہے۔ جب مسلمانوں اور سکھوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی
تعداد مجموعی طور پر بڑھ رہی ہے، پھر بھی جو نوکریاں سرکاری ریلوں میں خالی ہوتی ہیں، ان
میں سے انھیں بہت کم ملتی ہیں تو یقینی طور پر انھیں بہت برا معلوم ہوتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ
حکومت یہ اصول اختیار کرے کہ جہاں کہیں ہوسکے اور جہاں تک ہوسکے فرقہ واری نیابت کا
انتظام کیا جائے۔

ہندستان میں گناوے کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہورہی ہے اس کی ایک وجہ یہی فرقہ واری
نیابت ہے جسے قانون ساز جماعتوں کی حد تک تسلیم کرلیا گیا ہے! قانون بنانے والی جتنی مجلسیں
ہیں ان کے لئے چناؤ فرقہ واری طریق پر ہوتا ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی اور فرنگی
سب الگ الگ اپنے نمایندوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ کہیں کہیں علاقہ واری انتخاب بھی ہوتا ہے
مگر عام طور پر فرقہ واری نمایندگی ہوتی ہے، زیادہ تر مذہب و ملت کے ماننے والوں کی تعداد
کی مناسبت سے قانون بنانے والی مجلسوں میں بیٹھکیں معین ہوتی ہیں، زائد نیابت یعنے
Weightage بھی بعض فرقوں کو حاصل ہے مگر یہ زائد نیابت بھی دوسروں
کی شکایتوں کا باعث بنتی ہے لہذا ہر مذہب و ملت کے لوگوں کی خواہش ہے کہ جتنی ان کی تعداد

بڑھیگی، اسی کی مناسبت سے وہ قانون ساز مجلسوں میں اپنے نمایندوں کے اضافہ کا مطالبہ کرسکیں گے اور آخرکار اپنے مطالبوں میں تمامتر یا جزوی طور پر کامیاب ہونگے اور جس قدر زیادہ ان کے نمایندے ہونگے اسی قدر زیادہ وہ توقع کرسکیں گے کہ صوبائی یا مرکزی حکومت کی تمدنی، سیاسی، معاشی اور سماجی پالیسی پر ان کا اثر پڑے گا۔ نیز یہ بھی کہ قانون ساز مجلسوں میں جتنے زیادہ کسی مذہب و ملت کے نمایندے ہوں گے وہ اپنے رسوخ اور اثر کی وجہ سے اپنے ہم فرقہ وکیلوں، ٹھیکہ داروں، ڈاکٹروں، تاجروں، سرمایہ داروں، فن کار ماہروں وغیرہ کو فایدہ پہنچا سکیں گے۔ ان ہی وجہوں کے تحت کئی لوگوں نے گذشتہ گنا وے میں اپنی اصلی تعداد بڑھا کر لکھوادی۔ اور اپنے حقیقی یا منصورہ مفاد کے تحت باضابطہ طور پر غلط بیانی کی اور منظم پروپگنڈے کے ذریعے غلط بیانی کرنے کا مشورہ دیا! اخباروں میں، رسالوں میں، تقریروں میں، انتہا یہ کہ پوسٹروں کے ذریعہ علانیہ مشورہ دیا گیا کہ "اپنی مادری زبان اردو لکھاؤ!" "تم ہندو ہو! تمہارا کرتویہ کہے کہ دھرم کا پالن کرو اور اپنی ماتر بھاشا — ہندی لکھواؤ!" بعضوں نے مشورہ دیا کہ اپنے آپ کو صرف مسلمان لکھواؤ! بعضوں نے کہا نہیں اپنا اصلی فرقہ لکھواؤ ورنہ تمہاری انفرادیت فنا ہو جائے گی! کسی نے کہا اپنے آپ کو سکھ بتلاؤ، کسی نے کہا نہیں ہندو لکھو، اور عیسائیوں کے سوا سب نے اشاروں میں یا علانیہ یہ کہا کہ اپنی تعداد بڑھاؤ۔ ایک صاحب نے مجھ سے فخریہ بیان کیا کہ انھوں نے گھروالوں کی تعداد سات کی بجائے سترہ بتائی تھی؛ شمارندہ Enumerator انہیں کا ہم مذہب تھا اس نے انہیں رائے دی کہ "سترہ تو ہیں ہی دو اور لکھوا دیجے!" غرض سات کے انیس ہو گئے! میں جانتا ہوں کہ ہر جگہ ایسا اندھیر نہیں ہوا مگر پھر بھی یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی تعداد بڑھا چڑھا کر لکھائی ضرور ہے۔ کیونکہ اپنی دانست میں وہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے اپنی تعداد بڑھا کر اپنے دین اور ہم مذہبوں کی بڑی خدمت کی ہے۔

غرض فرقہ واری نیابت اور ہندیانے کی پالیسی کی وجہ سے ہندستان میں گنا وے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی۔ ایسی اہمیت جس کی نظیر انگلستان یا امریکہ میں کہیں نہیں ملتی

اور جب تک ہمارے ملک میں فرقہ واریت کا بول بالا رہے گا، یہ اہمیت باقی رہے گی۔

اس غیر معمولی اہمیت کے علاوہ بھی گنادے کی عام اہمیت ہر ملک میں، خاص کر ترقی پذیر ملکوں میں، مانی ہوئی بات ہے، کیوں کہ گنادے سے ہمیں حقیقت کا علم ہوتا ہے اور خاص کر جب تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو اعداد کی روشنی میں ہم نہ صرف اپنی تہذیب و تمدن کی اساس معلوم کرسکتے ہیں بلکہ مستقبل کے لئے نظام عمل بنانے میں مدد دے سکتے ہیں!

سب سے پہلے تو ہم دنیا کے مختلف حصوں کے بڑے چھوٹے ملکوں اور ہندستان کے صوبوں اور بعض ریاستوں کے تعدادی حوالے دیتے ہیں، جن پر ایک نظر ڈالنے سے ہمیں آبادی کے چند اساسی اعداد کی سرسری واقفیت ہو جائے اور شماریات آبادی کی اضافی نوعیت معلوم ہو جائے کیونکہ ایک ملک جس کا شمار ایک لحاظ سے سب سے آخر ہوتا ہے دوسرے لحاظ سے سب سے اول ہوتا ہے، بڑا منجھلا، اور منجھلا چھوٹا اور چھوٹا بڑا، اول آخر یا آخر اوّل ہو جاتا ہے!

آبادی کا مسئلہ

چند اساسی اعداد

ملکوں، ریاستوں، صوبوں کے رقبے، آبادیاں اور گنجانی

آبادی اور شماریات کی اساس معلوم کرنے کے لئے آیندہ تین جدولوں میں ۲۵ مختلف علاقوں کے نام اور ان کے رقبے، کُل آبادی اور ہر چوکور میل پر آبادی کی تعداد وغیرہ دی گئی ہے۔ پہلی جدول میں ملکوں، صوبوں اور ریاستوں کی ترتیب رقبہ واری اہمیت کے لحاظ سے کی گئی ہے یعنے جو ملک وسعت میں سب سے بڑا تھا اس کو سب سے پہلے اور جو سب سے کم تھا

اسے سب سے آخر میں رکھا ہے۔

دوسری جدول میں اُن ہی ۲۵ علاقوں کی ترتیب آبادی کی کل تعداد کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنے جہاں سب سے زیادہ آبادی تھی اس ملک کا نام سب سے پہلے اور جہاں سب سے کم آبادی تھی اس کا نام سب سے آخر میں رکھا گیا۔

تیسری جدول میں جن ملکوں کے اعداد پہلی اور دوسری جدولوں میں دئے گئے تھے ان ہی کی ترتیب گنجانی کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ گنجانی سے مراد یہ ہے کہ اوسطاً ہر چوکور میل کے رقبہ پر کتنے لوگ آباد ہیں۔ ملکوں کی گنجانیت کا لحاظ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ رقبہ اور آبادی میں کیا تناسبی بندھن ہے۔

ان تینوں جدولوں پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہوگا کہ جو ملک آبادی کی کل تعداد کے لحاظ سے پہلے اور دوسرے ہیں، وہ بہت زیادہ گنجان طور پر آباد نہیں اور جو ملک وسعت میں سب سے بڑے ہیں وہ گنجانیت کے اعتبار سے کم ہیں۔ مثلاً ہندستان اور چین سب سے زیادہ آبادی والے ملکوں کی گنجانی متوسط ہے اور کنیڈا جو وسعت کے لحاظ سے بڑا ہے گنجانیت کے اعتبار تقریباً سب سے آخر ہے!

۱۔ رقبہ واری ترتیب

	چوکور میل
۱ کینیڈا	۳۴،۶۶،۵۵۶
۲۔ بریزل	۳۲،۷۵،۵۱۰
۳ متحدہ امریکی ریاستیں	۲۹،۷۷،۱۲۸
۴ آسٹریلیا	۲۹،۴۴،۵۸۱
۵ چین	۲۹،۰۳،۴۷۵
۶ ہندستان	۱۵،۸۱،۴۱۰
۷ ارجنٹائین	۱۰،۷۹،۹۶۵
۸ ایران	۶،۲۸،۰۰۰
۹ اتحاد دکنی افریقہ	۴،۷۲،۵۵۰
۱۰ مہاجاپان	۳،۷۰،۷۷۰
۱۱ افغانستان	۲،۵۰،۰۰۰
۱۲ مہاجرمنی	۲،۲۵،۱۹۹
۱۳ فرانس	۲،۱۲،۶۵۹
۱۴ سپین	۱،۹۶،۶۰۷
۱۵ جرمنی	۱،۸۱،۶۳۰
۱۶ سویڈن	۱،۷۳،۳۴۱
۱۷ حجاز	۱،۵۰،۰۰۰
۱۸ جاپان	۱،۴۷،۰۰۰
۱۹ مدراس	۱،۲۶،۱۶۶
۲۰ ناروے	۱،۲۴،۵۵۶
۲۱ اٹلی	۱،۱۹،۷۶۴
۲۲ عراق	۱،۱۷،۰۰۰
۲۳ متحدہ صوبے	۱،۰۶،۲۴۷
۲۴ نیوزی لینڈ	۱،۰۳،۴۴۰
۲۵ پنجاب	۱ ۹۹،۰۸۹
۲۶ متوسط صوبے	۹۸،۵۷۵

	چوکور میل
۲۷ حیدرآباد	۸۲،۳۱۳
۲۸ کشمیر	۸۴،۲۵۸
۲۹ بنگال	۷۷،۴۴۲
۳۰ بمبئی	۷۶،۴۴۳
۳۱ بہار	۶۹،۷۴۵
۳۲ بلوچستان	۵۴،۴۵۶
۳۳ انگلستان	۵۰،۸۷۴
۳۴ سندھ	۴۸،۱۳۶
۳۵ آسام	۴۵،۹۵۱
۳۶ پرتگال	۳۵،۴۹۰
۳۷ اڑیسہ	۳۲،۱۹۲
۳۸ سکاٹ لینڈ	۳۰،۴۰۵
۳۹ میسور	۲۹،۴۵۸
۴۰ گوالیر	۲۶،۰۰۸
۴۱ سوئٹزرلینڈ	۱۵،۹۴۴
۴۲ جیپور	۱۵،۶۱۰
۴۳ سرحدی صوبہ	۱۴،۲۶۳
۴۴ ہالینڈ	۱۲،۷۱۲
۴۵ بلجیم	۱۱،۷۷۵
۴۶ اندوار	۹،۹۳۴
۴۷ بروڈا	۸،۲۳۶
۴۸ ٹراونکور	۷،۶۶۲
۴۹ ویلز	۷،۴۶۶
۵۰ بھوپال	۶،۹۲۱
۵۱ ٹونک	۲،۵۴۳
۵۲ رامپور	۸۹۲

۲۔ آبادی کی تعداد کے لحاظ سے ترتیب

(تمام اعداد ۱۹۳۶-۴۱ء کے درمیانی مدت کے ہیں)

۱ چین	۴۲،۲۷،۰۰،۰۰۰	۲۷ ہالینڈ	۸۷،۲۸،۰۰۰
۲ ہندستان	۳۸،۸۹،۰۰،۰۰۰	۲۸ اڑیسہ	۸۷،۲۸،۰۰۰
۳ متحدہ امریکی ریاستیں	۱۳،۱۶،۶۹،۰۰۰	۲۹ بلجیم	۸۳،۲۸،۰۰۰
۴ مہاجاپان	۹،۷۶،۰۰،۰۰۰	۳۰ میسور	۷۳،۳۹،۰۰۰
۵ مہاجرمنی	۷،۹۵،۰۰،۰۰۰	۳۱ آسٹریلیا	۶۹،۹۷،۰۰۰
۶ جرمنی	۶،۹۶،۰۰،۰۰۰	۳۲ پرتگال	۶۸،۲۵،۰۰۰
۷ جاپان	۶،۹۲،۰۰،۰۰۰	۳۳ سویڈن	۶۳،۷۰،۰۰۰
۸ بنگال	۶،۰۳،۰۰،۰۰۰	۳۴ ٹراونکور	۶۰،۷۰،۰۰۰
۹ متحدہ صوبے	۵،۵۰،۰۰،۰۰۰	۳۵ سکاٹ لینڈ	۴۸،۴۲،۰۰۰
۱۰ مدراس	۴،۹۳،۰۰،۰۰۰	۳۶ سندھ	۴۵،۳۵،۰۰۰
۱۱ اٹلی	۴،۲۹،۰۰،۰۰۰	۳۷ سوئٹزرلینڈ	۴۲،۶۰،۰۰۰
۱۲ فرانس	۴،۱۹،۰۰،۰۰۰	۳۸ گوالیئر	۴۰،۴۲،۰۰۰
۱۳ برِیزل	۴،۱۳،۰۰،۰۰۰	۳۹ کشمیر	۴۰،۲۱،۰۰۰
۱۴ انگلستان	۳،۷۷،۰۰،۰۰۰	۴۰ عراق	۳۵،۰۰،۰۰۰
۱۵ بہار	۳،۶۳،۰۰،۰۰۰	۴۱ جیپور	۳۰،۴۸،۰۰۰
۱۶ پنجاب	۲،۸۴،۰۰،۰۰۰	۴۲ سرحدی صوبہ	۳۰،۳۸،۰۰۰
۱۷ سپین	۲،۵۸،۰۰،۰۰۰	۴۳ بڑودا	۲۸،۵۵،۰۰۰
۱۸ بمبئی	۲،۰۸،۰۰،۰۰۰	۴۴ ناروے	۲۸،۱۴،۰۰۰
۱۹ ایران	۱،۸۰،۰۰،۰۰۰	۴۵ ویلز	۲۱،۵۸،۰۰۰
۲۰ متوسط صوبے	۱،۶۸،۰۰،۰۰۰	۴۶ نیوزی لینڈ	۱۵،۷۳،۰۰۰
۲۱ حیدرآباد	۱،۶۳،۰۰،۰۰۰	۴۷ اندور	۱۵،۱۳،۰۰۰
۲۲ آرجنٹائین	۱،۳۳،۰۰،۰۰۰	۴۸ حجاز	۱۵،۰۰،۰۰۰
۲۳ افغانستان	۱،۲۰،۰۰،۰۰۰	۴۹ بھوپال	۷،۸۵،۰۰۰
۲۴ کینیڈا	۱،۱۴،۰۰،۰۰۰	۵۰ بلوچستان	۵،۰۱،۰۰۰
۲۵ آسام	۱،۰۲،۰۰،۰۰۰	۵۱ رامپور	۴،۷۷،۰۰۰
۲۶ اتحاد دکنی افریقہ	۹۵،۸۹،۰۰۰	۵۲ ٹونک	۳،۵۳،۰۰۰

۳۔ ہر چوکور میل کی آبادیت کے لحاظ سے ترتیب

نمبر	نام	آبادیت
۱	ٹراونکور	۷۹۲
۲	بنگال	۷۷۹
۳	بلجیم	۷۱۲
۴	ہالینڈ	۶۸۶
۵	انگلستان	۶۸۵
۶	رامپور	۵۲۸
۷	بہار	۵۲۱
۸	متحدہ صوبے	۵۱۸
۹	جاپان	۴۶۹
۱۰	مدراس	۳۹۱
۱۱	جرمنی	۳۸۲
۱۲	مہاجاپان	۳۷۵
۱۳	اٹلی	۳۵۹
۱۴	بڑودا	۳۴۹
۱۵	مہاجرمنی	۳۰۸
۱۶	ویلز	۲۸۸
۱۷	پنجاب	۲۸۷
۱۸	بمبئی	۲۷۲
۱۹	اڑیسہ	۲۷۱
۲۰	سوئٹزرلینڈ	۲۵۵
۲۱	میسور	۲۴۹
۲۲	ہندستان	۲۴۶
۲۳	سرحدی صوبہ	۲۱۳
۲۴	حیدرآباد	۱۹۸
۲۵	فرانس	۱۹۷
۲۶	جےپور	۱۹۵
۲۷	پرتگال	۱۹۲
۲۸	آسام	۱۸۲
۲۹	متوسط صوبے	۱۷۰
۳۰	گوالیر	۱۵۴
۳۱	اندور	۱۵۲
۳۲	چین	۱۴۵
۳۳	ٹونک	۱۳۹
۳۴	سکاٹ لینڈ	۱۳۳
۳۵	سپین	۱۳۱
۳۶	بھوپال	۱۱۳
۳۷	سندھ	۹۴
۳۸	کشمیر	۴۹
۳۹	افغانستان	۴۸
۴۰	متحدہ امریکی ریاستیں	۴۴
۴۱	سویڈن	۴۰
۴۲	عراق	۳۰
۴۳	ناروے	۲۲
۴۴	اتحادۂ دکنی افریقہ	۲۰
۴۵	ایران	۱۹
۴۶	نیوزی لینڈ	۱۵
۴۷	برزیل	۱۲
۴۸	آرجنٹائین	۱۲
۴۹	حجاز	۱۰
۵۰	بلوچستان	۹
۵۱	کینیڈا	۳
۵۲	آسٹریلیا	۲

آبادی کی گنجانی

ہندستان کا مقابلہ یورپی ملکوں سے کرنا ٹھیک نہیں کیوں کہ ہندستان جغرافی اور معاشی اعتبار سے آدھا براعظم ہے۔ ہندستان کے صوبوں اور بعض بڑی بڑی دیسی ریاستوں کا مقابلہ یورپی ملکوں سے کرنا ٹھیک ہوگا کیوں کہ یہ ان کے ہم پلہ ہیں۔

اس جدول میں ہم ہندستان کی گنجانی کا مطالعہ کریں گے تاکہ معلوم ہو کہ بڑے بڑے علاقوں کے ملکوں میں آبادی کتنی ہے اور ہندستان میں کتنی۔

ملک کا نام	جس سال کے اعداد ہیں	رقبہ (چوکور میلوں میں)	کل آبادی	گنجانی (ہر چوکور میل پر لوگوں کی تعداد)
آسٹریلیا	۱۹۳۹ء	۲۹،۷۴،۰۰۰	۷۰،۰۰،۰۰۰	۲
کینیڈا	۱۹۴۱ء	۳۴،۶۶،۰۰۰	۱،۱۴،۰۰،۰۰۰	۳
آرجنٹائین	۱۹۴۱ء	۱۰،۸۰،۰۰۰	۱،۳۳،۰۰،۰۰۰	۱۲
متحدہ امریکی ریاستیں	۱۹۴۰ء	۲۹،۷۷،۰۰۰	۱۳،۱۶،۰۰،۰۰۰	۴۴
چین	۱۹۳۶ء	۲۹،۰۳،۰۰۰	۴۲،۲۷،۰۰،۰۰۰	۱۴۸
ہندستان	۱۹۴۱ء	۱۵،۸۱،۰۰۰	۳۸،۸۹،۰۰،۰۰۰	۲۴۶

یہ اعداد شاہد ہیں کہ بڑے بڑے علاقوں کو ملحوظ رکھا جائے تو ہندستان بہت کافی آباد ہے اور جو لوگ ہندستان کی "قلت آبادی" کو ظاہر کرنے کے لئے ہندستان کا مقابلہ بلجیم، ہالینڈ یا انگلستان سے کرتے ہیں وہ کیسی دھاندلی کرتے ہیں کیونکہ رقبائی وسعت کے اعتبار سے انگلستان ریاست حیدرآباد کا دو تہائی، صوبۂ آسام سے بھی چھوٹا اور صوبۂ سندھ سے کچھ بڑا ہے۔ کُل کو جزو کے مقابلے میں برابری سے پیش کرنا، اساسی بھول ہے۔

دنیا کی سطح زمین کا مجموعی رقبہ ۵½ کروڑ چوکور میل ہے اور دنیا کی مجموعی آبادی کا اندازہ

دوارب سے زیادہ تقریباً ۲۱۸ کروڑ کیا جاتا ہے۔ اس کے یہ معنے ہوئے کہ مجموعی اعتبار سے دنیا کی گنجانی ۴۰ افراد فی چوکور میل ہے اور ہندستان کی گنجانی تقریباً ۲۵۰!

جنوبی امریکہ کا ایک اور بڑا ملک برزل ہے جس کا رقبہ ہندستان کے رقبے سے دوناہے مگر وہاں کی آبادی صرف ۴۴،۱۶،۰۰،۰۰۰ ہے۔ اس لحاظ سے وہاں کی گنجانی ۱۲ ہے اور ہندستان کی ۲۴۶۔ ان اعداد سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ ہماری آبادی کس قدر گھنی ہے؛ اور یہ غور طلب بات ہے کہ جہاں آبادی پہلے ہی سے کافی گھنی ہوگی وہاں آبادی کے بڑھنے اور پھیلنے کی گنجائش کہاں سے آئے گی ؟!

متحدہ امریکی ریاستوں کے صنعتی، کاروباری، تجارتی، زراعتی، فنی اور پیشہ وری بلند معیار کو پیش نظر رکھئے اور خیال کیجئے کہ ایسے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملک میں تو ہر چوکور میل پر ۴۴ لوگ آباد ہیں مگر ہندستان میں محکومیت، غفلت اور جہالت کے ہوتے ہوئے ۲۴۶۔

ان اعداد سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کرسکتے ہیں کہ امریکہ کے تمام ملکوں میں نیز آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ میں آبادی کے بڑھنے کی بہت گنجائش ہے؛ اس کے برعکس یورپ اور ایشیا کے اکثر ملک "لب ریز" یا "بھرپور" نہ سہی تو اپنی موجودہ سکت سے زیادہ آباد ہوچکے ہیں۔ اکثر ایشیائی ملکوں کی طرح ہندستان بھی اپنی خام کاری، محکومیت اور محدود ذرائع آمدنی اور زیادہ تعداد آبادی کی وجہ سے اضافی طور پر کثیر الآباد ہے۔ ہندستان کی اضافی کثرت آبادی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کیوں کہ ہمارے موجودہ ذرائع معاش، پیداوار، معمولی بلکہ ادنے معیار معیشت کے لئے موجودہ آبادی بہت زیادہ ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ہندستان نہایت سست رفتار پر ترقی کررہا ہے اور اس کی عظیم ترین اکثریت صدیوں پہلے کی طرح کمل پوش، فاقہ کش، مصیبت زدہ، غافل اور ان پڑھ ہے۔

ہندستان کے مختلف حصوں میں آبادی
کی
گنجانی

ہندستان نہ صرف مجموعی حیثیت سے کافی آباد ہے بلکہ آبادی کی غیر موافقانہ تقسیم کی وجہ سے بعض حصے بہت زیادہ گنجان طور پر آباد ہیں۔ مختلف صوبوں اور ریاستوں میں آبادی کی گنجانی دکھانے کے لئے ہم ان صوبوں اور ریاستوں کی رقبہ واری اور کل تعدادی جدولیں پیش کرتے ہیں تاکہ ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے کہ کون کون سے صوبے بڑے یا چھوٹے ہیں ؛ کہاں کہاں آبادی سب سے زیادہ یا سب سے کم ہے۔

۱) ہندستانی صوبوں اور بعض ریاستوں کی رقبہ واری ترتیب

صوبے یا ریاست کا نام	رقبہ ، چوکور میلوں میں	تقابلی کیفیت
مدراس	۱،۲۶،۱۶۶	مدراس کے ہم وسیع ملک جاپان ، ناروے اور اٹلی ہیں
متحدہ صوبے	۱،۰۶،۲۴۷	اس کا رقبہ نیوزی لینڈ کے برابر ہے۔
پنجاب	۹۹،۰۸۹	آدھے جرمنی کے برابر۔
متوسط صوبے	۹۸،۵۷۸	رقبہ آدھے جرمنی کے برابر ہے۔ مگر پیداوار ؟
حیدرآباد ریاست	۸۲،۳۱۳	انگلستان اور سکاٹ لینڈ کے مجموعی رقبہ کے برابر۔

صوبے یا ریاست کا نام	رقبہ، چوکور میلوں میں	تقابلی کیفیت
کشمیر ریاست	۸۲،۳۱۳	انگلستان اور سکاٹ لینڈ کے مجموعی رقبہ کے برابر۔
بنگال	۷۷،۴۴۲	آدھے جاپان کے برابر۔
بمبئی	۷۶،۴۴۳	جاپان کے آدھے رقبے کے برابر۔
بہار	۶۹،۷۵۴	انگلستان اور ویلز کے رقبوں سے زیادہ۔
سندھ	۴۸،۱۳۶	انگلستان سے کچھ کم، تقریباً برابر!
آسام	۴۵،۹۵۱	ہالینڈ، بلجیم اور سوئٹزرلینڈ سے بڑا!
اڑیسہ	۳۲،۱۹۲	سکاٹ لینڈ کے برابر۔
میسور ریاست	۲۹،۴۵۸	سکاٹ لینڈ سے کچھ کم۔
گوالیر "	۲۶،۰۰۸	سکاٹ لینڈ سے کچھ کم
جیپور ریاست	۱۵،۶۱۰	اس ریاست کا ہم وسیع ملک سوئٹزرلینڈ ہے۔
سرحدی صوبہ	۱۴،۲۶۳	ہالینڈ سے کچھ بڑا۔
اندور ریاست	۹،۹۳۴	اس کا رقبہ بلجیم سے کم ہے۔
بروڈا	۸،۲۳۶	اس کا رقبہ بلجیم سے کم ہے۔
ٹراونکور	۷،۶۶۲	ٹراونکور کا ہم وسیع ملک ویلز ہے۔

یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ صوبائی رقبوں میں صرف ان ہی علاقوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو براہ راست انگریزوں کے ماتحت ہے۔ مثلاً پنجاب کا رقبہ ۹۹ ہزار واضح کیا گیا ہے، مگر پنجاب ہی میں بعض دیسی ریاستیں ہیں، جہاں کی آبادی، تہذیب و تمدن سب ہی بقیہ پنجاب کی طرح ہے، جنھیں رقبہ واری وسعت میں ملحوظ نہیں رکھا گیا کیونکہ یہ علاقے دیسی راجاؤں کے ماتحت اور بالواسطہ انگریزوں کے تحت ہیں۔ پنجاب کے صوبائی اعداد میں دیسی ریاستوں کے اعداد کو شامل نہیں کیا جانا چاہئے اور سنجیدہ علمی کتابوں میں یہ فرق ملحوظ رکھنا لازمی ہے۔ اگر دیسی ریاستوں کا رقبہ شامل کرلیا جائے تو کل پنجاب کا رقبہ ۱،۳۷،۲۳۵

کل سرحد کا ۳۹،۲۴۹ اور اڑیسہ کا ۵۰،۳۴۹ ہوتا ہے۔

(ب) ہندستان کے صوبوں اور بعض ریاستوں کی ترتیب

(آبادی کی تعداد کے لحاظ سے)

ان ہی صوبوں اور ریاستوں کی ترتیب کل آبادی کے لحاظ سے یہ ہے۔

		تقابلی کیفیت
کل بنگال	۶،۲۴،۵۰،۰۰۰	جاپان کی آبادی ۷ کروڑ سے کم ہے۔
صوبۂ بنگال	۶،۰۳،۰۰،۰۰۰	〃 〃 〃 〃 〃 〃
صوبۂ متحدہ	۵،۵۰،۰۰،۰۰۰	صرف دو آبے کی آبادی انگلستان، سکاٹلینڈ اور اور ویلز سے زیادہ ہے۔
کل مدراس	۵،۶۶،۰۰،۰۰۰	فرانسیسیوں کی تعداد سے ڈیڑھ کروڑ زیادہ۔
صوبۂ مدراس	۴،۹۲،۰۰،۰۰۰	اٹلی، فرانس یا برنرل کی آبادی سے ۱/۲ کروڑ زیادہ۔
بہار	۳،۶۳،۰۰،۰۰۰	انگلستان کی آبادی کے برابر۔
کل پنجاب	۳،۴۰،۰۰،۰۰۰	〃 〃 〃 〃
پنجاب صوبہ	۲،۸۴،۰۰،۰۰۰	سپین کی آبادی سے زیادہ
بمبئی	۲،۰۸،۰۰،۰۰۰	
متوسط صوبے	۱،۶۸،۰۰،۰۰۰	ایران کی آبادی کے برابر
حیدرآباد ریاست	۱،۶۳،۰۰،۰۰۰	〃 〃 〃 〃
آسام	۱،۰۶،۰۰،۰۰۰	
اڑیسہ	۸۷،۲۸،۰۰۰	ہالینڈ کی آبادی کے برابر
میسور ریاست	۷۳،۳۹،۰۰۰	بلجیم کی آبادی سے کچھ کم

تقابلی کیفیت

ٹراونکور ریاست	۶۰،۷۰،۰۰۰	
کُل سرحدی علاقہ	۵۴،۱۵،۰۰۰	
سندھ صوبہ	۴۵،۳۵،۰۰۰	سکاٹ لینڈ کی آبادی کے برابر
گوالئیر ریاست	۴۰،۴۶،۰۰۰	
کشمیر ریاست	۴۰،۲۱،۰۰۰	
سرحدی صوبہ	۳۰،۳۸،۰۰۰	
بروڈا ریاست	۲۸،۵۵،۰۰۰	ناروے کی آبادی کے برابر
اندور ریاست	۱۵،۱۳،۰۰۰	
کُل بلوچستان	۸،۵۷،۰۰۰	
بلوچستان	۵،۰۱،۰۰۰	

اسی جدول سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ محض تعداد کے زیادہ ہونے سے کیا حاصل! بھوکے، انپڑھ، جاہل اور نااہل لوگ کروڑوں کی تعداد میں ہوں تو بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے جو تعداد میں دس گنا کم مگر قابلیت، دولت مندی، کارگذاری، تنظیم، اہلیت اور تعلیم میں سوگنا بہتر ہوں۔ اگر ہماری قوم تاریخ، عمرانیات اور علم تمدن کی اس اٹل حقیقت کو محسوس کرے تو وہ اپنی تعداد بڑھانے کی بجائے (یا تبلیغ اور شدھی پر اپنی توتوں کو صرف کرنے سے قبل!) اپنے آپ کو اہل اور طاقت ور بنانے کی کوشش کرے گی اور کسی صورت میں بھی تحدید آبادی اور ضبط تولید کی مخالفت نہیں کرے گی۔

(پ) ہندستان کے مختلف سمتوں کی گنجانی

	رقبے کے حساب سے آبادی کی تعداد	تقابلی کیفیت
ٹراونکور	۷۹۲	دنیا کا سب سے زیادہ گنجان آباد رقبہ

	رقبے کے حساب سے آبادی کی تعداد	تقابلی کیفیت
بنگال	۷۷۹	ہندستان کا سب سے زیادہ گنجان صوبہ ہے۔ دنیا کا سب سے زیادہ گنجان ملک بلجیم ہے، بنگال کی گنجانی اس سے زیادہ ہے۔
بہار	۵۲۱	جاپان سے زیادہ بہار کی آبادی گھنی ہے۔
متحدہ صوبے	۵۱۸	جاپان سے زیادہ آگرہ و اودھ کی آبادی گھنی ہے۔
مدراس	۳۹۱	جرمنی کے برابر گنجان آباد ہے۔ جرمنی کے ذرایع معاش کتنے زیادہ اور اس صوبے کے کتنے کم ہیں۔ یہ بھی ایک اہم سبب ہمارے افلاس کا اور پست معیار زندگی کا ہے۔
بروڈا	۳۴۹	یہاں کی آبادی اٹلی کے برابر گھنی ہے۔
پنجاب	۲۸۷	پنجاب، بمبئی اور اڑیسہ ویلز کے برابر گھنے آباد ہیں۔ اگر ویلز کے باشندوں کی طرح یہاں والوں کو بھی مختلف قسم کے ذرایع معاش میسر ہوتے تو یہ لوگ بھی خوش حال ہوتے۔
بمبئی	۲۷۲	
اڑیسہ	۲۷۱	
میسور	۲۴۹	میسور سوئیٹزرلینڈ کے برابر گنجان ہے۔
سرحدی صوبہ	۲۱۳	
حیدرآباد	۱۹۸	فرانس کے برابر۔
آسام	۱۸۶	گنجانی پرتگال کی طرح ہے۔
متوسط صوبے	۱۷۰	
گوالیر	۱۵۴	
سندھ	۹۴	

	رقبے کے حساب سے آبادی کی تعداد	تقابلی کیفیت
کشمیر	۴۹	دنیا کی سب سے زیادہ ترقی پذیر ریاست امریکہ کے برابر !
بلوچستان	۹	کینیڈا اور آسٹریلیا کی گنجانی سے تگنی ! اتنا گھٹنے پر بھی اس قدر زیادہ !

اس جدول اور اس کی تقابلی کیفیت سے ہندستان کی نکبت اور مصیبت واضح ہے۔ میسور ہندستان کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ ریاست تو ہے مگر سوئٹزرلینڈ کے مقابلے میں میسور کی صنعت و حرفت ، زراعت ، تجارت ، فن کاری تعلیم دس گنی کم ہے ! پھر بھی دونوں یکساں گھنے آباد ہیں ۔ اگر ایک خاندان کی آمدنی دو ہزار ماہانہ ہو اور دوسرے خاندان کی صرف بیس بائیس گز کھانے والے دونوں خاندانوں میں بیس بیس ہوں تو ظاہر ہے کہ معیار زندگی اور معیار آرام میں کتنا فرق رہے گا اور لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم اور تربیت ہنرمندی اور اہلیت میں کتنا فرق نمودار ہوگا۔

جن غریب یا تنگ دست ماں باپ کو بہت بچے ہوتے ہیں وہ کبھی اپنی اولاد کو اچھی تعلیم نہیں دے سکتے اور ہونہار افراد مشق اور تربیت حاصل کرکے اپنی کارکردگی بڑھانے اور مستقبل کو سنوارنے کی بجائے کشمکش حیات میں مبتلا ہو کر خود کمانے کھانے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس طرح ایک اچھے شہری اور ہنرمند کاریگر یا اعلےٰ صناع بننے سے محروم رہتے ہیں ۔ بہتیرے متوسط الحال گھرانوں کے افراد ہیں جو محض اعلےٰ تعلیم یا فنی تعلیم نہیں حاصل کرسکنے کی وجہ سے ترقیوں سے محروم ہیں ۔ اکثر بڑے بھائی بہنوں پر چھوٹے بھائی بہنوں کا بار پڑتا ہے اور ایسے وقت جب کہ خود ان میں اپنے پانو پر کھڑے رہنے کی طاقت نہیں پیدا ہوتی یہ بار ان کی زندگی کو برباد کرتا ہے ۔ بچوں کو پالتے پالتے ماں باپ پریشان ہو جاتے ہیں اور جس قدر زیادہ وہ غیور اور سمجھ دار ہوتے ہیں ، اسی قدر وہ اپنی مصیبت کو محسوس کرتے ہیں اور اپنے چہیتوں کی مصیبتیں دیکھ دیکھ کر کڑھتے ہیں۔

ہندستان کو فیصلہ کرنا ہی ہوگا کہ وہ کب تک کچی جھونپڑیوں میں، کچے پکے کویلو کے مکانوں میں، کافی یا معقول غذا میسر نہیں کرسکنے والے گھرانوں میں، ناخواستہ اور بارِ خاطر اولاد پیدا کرتا رہے گا؟ متوسط طبقوں کو فیصلہ کرنا ہی ہوگا کہ وہ اپنے سے بہتر اپنی اولاد کے لئے تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا چاہتے ہیں یا خود مصیبتوں میں مبتلا رہ کر دوسروں کو مصیبتوں میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں؟ ہر غیور اور سمجھ دار آدمی کو فیصلہ کرنا ہی ہوگا کہ وہ اپنے معیارِ آرام کو بلند تر کرنا چاہتا ہے اور اپنے چہیتوں کے لئے اپنے سے بہتر ماحول پیدا کرنا چاہتا ہے یا بن چاہے بچوں کی وجہ سے سب کے معیار کو پست کرنا چاہتا ہے! اگر وہ بہت سوں کو مصیبت اور جہالت میں پالنے کی بجائے چند کو تہذیب اور آرام کے بلند معیار پر پالنا چاہتا ہے تو خاندان کی تحدید اور ضبطِ تولید لازمی ہیں۔ اگر آپ اپنی اولاد کو اپنے سے بہتر تعلیم دینا چاہتے ہیں، اگر آپ اپنی اولاد کو اعلےٰ تعلیم اور معقول تربیت دینا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ ضبطِ تولید کے موافق بنئے یا کم سے کم ان کی مخالفت نہ کیجئے جو جنسیاتی تعلیم دے کر اچھی فضا پیدا کر رہے ہیں یا ضبط گاہیں قائم کرکے ضرورت مندوں کو بر وقت جائز مدد پہنچانا چاہتے ہیں!

اس جدول کی تیاری میں فرض غرض سے مطلوبہ اعداد یا استدلال کے موافقانہ اعداد حاصل نہیں کئے گئے ہیں بلکہ ہندستان کے مسئلۂ آبادی کی نوعیت ظاہر کرنے کے لئے، جہاں تک بن پڑا ایمان داری اور غیر جانب داری سے اعداد پیش کئے گئے ہیں؛ کم سے کم اپنے مطلب کے اعداد پیش کرکے اپنے خلاف کے اعداد چھپائے نہیں ہیں۔ ان ہی اعداد کو غیر جانب دارانہ طور پر پیشِ نظر رکھنے سے ہم محسوس کرتے ہیں کہ وادیٔ گنگا اور اس کے ملحقہ علاقوں کے برابر یورپ کا کوئی ہم وسیع خطہ آباد نہیں! وادیٔ گنگا کے برابر گنجانی کہیں ملتی ہے تو وادیٔ نیل (مصر) اور وادیٔ یانگ تسی کیانگ (چین) میں! "یکساں حالات یکساں نتیجے پیدا کرتے ہیں"۔ اسی لئے ان وادیوں میں

رہنے والوں کی عظیم اکثریت جہالت اور غربت میں پیدا ہوتی ہے، جہالت اور غربت میں پلتی ہے، اور جہالت و غربت میں مرتی ہے! سیکڑوں برس سے یہی ہوتا چلا آیا ہے، کیا آپ چاہتے ہیں کہ آئندہ بھی یہی ہو؟!

بڑھتی آبادی کی رفتار

جہاں حالات موافق ہوتے ہیں اور کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑا، رہنے کو مکان نصیب ہوتا ہے وہاں آبادی جس تیز رفتار سے بڑھ سکتی ہے اس کا اندازہ انگلستان کی آبادی کے اعداد سے ہوسکتا ہے۔ تین چار صدیوں سے انگلستان کا شمار ترقی پذیر ملکوں میں ہوتا ہے، خاص کر ۱۹ صدی کی ابتدا سے وہ مسلسل ترقی کر رہا ہے، انگلستان کے ماتحت ملکوں اور علاقوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور اس وقت ساری دنیا کے ایک چوتھائی حصہ پر انگلستان کا پرچم لہرا رہا ہے۔

ایک طرف تعلیم اور میکانیت کے ساتھ ساتھ صنعت وحرفت، زراعت و تجارت میں اضافہ ہو رہا ہے اور ان کی وجہ سے دولت پیدا کرنے اور حاصل کرنے کے ذریعوں میں اضافہ ہو رہا ہے، مگر دوسری طرف عام تعلیم کی وجہ سے معیارِ زندگی کو بلند کرنے اور معیارِ آرام کو بڑھانے کا شوق بہت عام ہوگیا ہے، اس کی خاطر بچوں کی پیدائش پر بڑی روک تھام کی جاتی ہے، ایک بچے کے بعد دوسرے بچے کی پیدائش تک بہت مہلت دی جاتی ہے جسے اصطلاحی زبان میں Spacing of Children یعنے بچوں میں فاصلہ بندی کہتے ہیں۔ بار بار اور جلد جلد بچے پیدا ہونے سے نہ صرف ماؤں کی صحت بُری طرح متاثر ہوتی ہے بلکہ بچوں کی توانائی اور جانداری بھی گھٹ جاتی ہے۔ اس کے برعکس بچے موزوں وقتی فاصلوں سے پیدا ہوں تو ماں کی صحت بھی متاثر نہیں ہوتی اور بچوں کی قدرتی جانداری بھی زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے آئندہ نسل کا معیارِ صحت بھی بہتر اور بلند تر ہوتا ہے۔

غرض معیارِ زندگی اور معیارِ آرام کی خاطر ترقی پذیر یورپ کے ترقی پسند جوڑے "تین بچوں کے طریق" سے آگے نہیں بڑھتے! بہتیرے بے اولاد ہیں، بہت سوں کو ایک ہی بیٹا یا بیٹی یا ایک بیٹا اور ایک بیٹی یا صرف دو بچے ہیں اور عام طور پر زیادہ سے زیادہ تین یا چار!! اس سے زیادہ بچوں والے خاندان کشمکشِ حیات کی وجہ سے اپنے وقار اور رتبے کو سنبھال نہیں سکتے اور پست تر طبقے میں پہنچ جاتے ہیں لہٰذا ترقی پسندی کے لئے اولاد کی تعداد کو محدود رکھنا لازمی ہے جس کی خاطر حمل قائم ہونے میں نت نئے طریقوں سے روک تھام کی جاتی ہے اور حمل قائم ہو بھی جائے تو اسے جائز اور ــــ ناجائز طریقوں پر ضایع کیا جاتا ہے۔ ان کا فلسفۂ عمل یہ ہے کہ ناخواستہ اولاد نہیں ہونی چاہیئے خاص کر جب کہ ماں باپ کی مالی حالت اس قابل نہ ہو کہ وہ ہونے والے بچوں کی زندگی، تعلیم، تربیت اور معقول ذرایع ترقی کی ضمانت نہ لے سکیں یا اپنے بچوں کو تعلیم و تربیت دلانے کی معقول توقع نہ کر سکیں! ایسی اولاد سے کیا فایدہ جس کی وجہ سے ماں باپ پریشان ہوں، ان کی ذمہ داریوں میں ناقابلِ برداشت اضافہ ہو، کھانے کے لئے کافی غذا میسر نہ ہو اور رفتہ رفتہ سب کی صحت اور زندگی خطروں میں مبتلا ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ماں باپ کو اپنی اولاد سے اگر واقعی محبت ہے تو وہ بھی ایسی زائد اولاد ہونے نہیں دیں گے جس سے پہلی اور دوسری یا تیسری اولاد کی تعلیم اور تربیت یا صحت و زندگی مخدوش ہو جائیگی بلکہ سچ پوچھئے تو یہ ماں باپ کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے سے بہتر اپنی اولاد کے لئے ذرایع زندگی اور ذرایع ترقی پیدا کریں۔ اگر ان کے حاصل کرنے کی کوئی توقع نہیں تو پھر ماں باپ کو بھی اولاد پر اولاد پیدا کرنے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیئے، خاص کر جب کہ ماں باپ دماغی اور جسمانی اعتبار سے خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہوں۔ اسی لئے یورپ کی بعض ترقی پذیر ریاستوں میں لاعلاج اور خطرناک بیماریوں میں مبتلا لوگوں کو جبری طور پر "بانجھ دیا" جاتا ہے تاکہ ان کی وجہ سے خطرناک معذوروں کی

تعداد میں اضافہ نہ ہو سکے بعض لوگ اپنی رضامندی سے بانجھ ہو جاتے ہیں تاکہ کثرتِ اولاد کا کھٹکا ہی نہ رہے۔ مختصر یہ کہ ترقی پسند ملکوں کی طرح انگلستان میں بھی آبادی کو محدود کرنے والے بہت سے اسباب کارفرما ہیں۔ پھر بھی آبادی جس رفتار سے بڑھ رہی ہے اس کا اندازہ ان اعداد سے ہو سکتا ہے:

۱۹ صدی کی ابتدا سے انگلستان اور ویلز کی آبادی

	کُل تعداد	گنجانی یعنی ہر چوکور میل پر لوگوں کی تعداد
سنہ ۱۸۰۱ء میں انگلستان اور ویلز کی آبادی ...	۸۹،۰۰،۰۰۰	۱۵۲
سنہ ۱۸۳۱ء " " " " "	۱،۳۹،۰۰،۰۰۰	۲۳۸
سنہ ۱۸۵۱ء " " " " "	۱،۷۹،۰۰،۰۰۰	۳۰۷
سنہ ۱۸۶۱ء " " " " "	۲،۰۰،۰۰،۰۰۰	۳۴۴
سنہ ۱۸۹۱ء " " " " "	۲،۹۰،۰۰،۰۰۰	۴۹۷
سنہ ۱۹۰۱ء " " " " "	۳،۲۵،۰۰،۰۰۰	۵۵۸
سنہ ۱۹۱۱ء " " " " "	۳،۶۰،۰۰،۰۰۰	۶۱۸
سنہ ۱۹۲۱ء " " " " "	۳،۷۸،۰۰،۰۰۰	۶۴۹
سنہ ۱۹۳۱ء " " " " "	۴،۰۰،۰۰،۰۰۰	۶۸۸
سنہ ۱۹۴۱ء " " " " "	۴،۱۷،۰۰،۰۰۰	۷۱۷

ان اعداد پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ سنہ ۱۸۰۱ء اور سنہ ۱۸۵۱ء کی آدھ صدی میں انگلستان اور ویلز کی آبادی دونی ہو گئی اگر سنہ ۱۸۹۱ء سے سنہ ۱۹۴۱ء تک کی آدھ صدی میں اسی رفتار سے اضافہ ہوتا تو وہاں کی آبادی دونی ہو کر ۵،۸۰،۰۰،۰۰۰ یعنی تقریباً چھ کروڑ ہو گئی ہوتی مگر واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۴۱ء میں آبادی ۴½ بھی نہیں تھی۔ اس سے

ظاہر ہے کہ انگلستان میں اضافۂ آبادی کی رفتار کم ہوتی جارہی ہے۔

یورپ کے بعض ملکوں میں اضافۂ آبادی کی رفتار اتنی دھیمی ہوگئی تھی کہ آبادی تقریباً مساوی رہنے لگی تھی اور سیاسی اور فوجی نقطۂ نظر سے رہنماؤں کی تشویش کا باعث ہوگئی تھی۔

انگلستان اور ویلز میں تو ہمہ گیر ترقیوں کی وجہ سے آبادی میں اضافہ ہوا مگر جہاں ذاتی پرچم ہے نہ فوج، حکومت ہے نہ دولت، طاقت ہے نہ میکانیت، مقبوضے ہیں اور نہ نوآبادیاں وہاں بھی تیز رفتار سے آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ فاقوں، قحط یا طاعون، ہیضے، چیچک اور دوسری قابلِ انسداد بیماریوں کے باوجود ہندستانیوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے محض "روحانیت" کے برتے پر!

۱۸۹۱ء میں	ہندستان	کی	آبادی	۲۷،۹۴،۰۰،۰۰۰
۱۹۰۱ء	"	"	"	۲۸،۳۹،۰۰،۰۰۰
۱۹۱۱ء	"	"	"	۳۰،۳۰،۰۰،۰۰۰
۱۹۲۱ء	"	"	"	۳۰،۵۷،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۱ء	"	"	"	۳۳،۸۱،۰۰،۰۰۰
۱۹۴۱ء[۱]	"	"	"	۳۸،۹۰،۰۰،۰۰۰

دونوں جدولوں کا مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ

گذشتہ پچاس برس میں انگلستان اور ویلز کی آبادی میں خالص اضافہ

۱۔ ۱۹۳۷ء میں برما ہندستان سے علیحدہ کر دیا گیا تھا لہذا ۱۹۴۱ء میں برمی آبادی کا شمار یوں بھی نہیں کیا جاتا۔ چونکہ ۱۹۳۱ء تک برمی آبادی کا شمار ہندستان کی آبادی میں ہوتا تھا اس لئے ضروری تھا کہ ۱۸۹۱ء اور ۱۹۳۱ء تک کی تعداد سے برمی آبادی منہا کی جائے۔ چنانچہ پیش کردہ اعداد خالص ہندستان سے متعلق ہیں۔ اس کے برعکس پ

۱۰،۹۶،۰۰،۰۰۰ اور اسی مدت میں ہندستان کی آبادی میں خالص اضافہ ۱،۲۴،۰۰،۰۰۰ کا ہوا۔ انگلستان کی آبادی کو ہزاروں نئے ذرائع معاش، ملک کے باہر بھی نوکریاں، ٹھیکے نصیب ہوئے۔ اس لئے انگلستان نہ صرف زائد آبادی کو پال سکا بلکہ اپنا معیارِ آرام اور معیارِ زندگی بھی بہتر کر سکا۔ اس کے برعکس ہندستان نے جو معمولی ترقی کی وہ آبادی کی زائد تعداد کے نذر ہوگئی اور ملک نے مجموعی حیثیت سے کوئی ترقی نہیں کی جس بُری بھلی حالت میں ہم سو دو سو برس پہلے زندگی بسر کر رہے تھے اسی طرح اب زندگی بسر کر رہے ہیں۔ زائد پیداوار بڑھتی ہوئی آبادی کے نذر ہو جا رہی ہے۔

اگر ہم بھی دوسری ترقی یافتہ اور ترقی پذیر قوموں کی طرح ترقی کرنا چاہیں تو ہمارے لئے دو مسئلوں کا حل کرنا ضروری ہے: ایک تو یہ کہ زیادہ دولت حاصل کریں جس کے لئے زیادہ ذرائع معاش حاصل کرنا ضروری ہے اور پیدا کردہ اور حاصل شدہ دولت کو معقول طور پر تقسیم کریں جس کے لئے آبادی کو محدود کرنا لازمی ہے۔ اگر واقعی "ایک انار اور سو بیمار ہوں" یا پچاس روپے ماہانہ کمانے والے کے ہاں ایک درجن کھانے والے موجود ہوں تو ترقی کے لئے تعداد کا گھٹانا لازمی ہوگا۔ یہی صورتِ حال ہندستان میں پیدا ہو چکی ہے اور یہاں کی غربت

---

(۱) سیٹلمنٹس، برما وغیرہ میں برما کے اعداد شامل رکھے گئے ہیں۔ عامیانہ اور غیر ماہر واقف کاروں کے اندازوں میں اکثر غلطی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ ان اہم تغیرات سے ناواقف ہوتے ہیں۔

بعض کتابوں میں انگلستان کے تحت، انگلستان اور ویلز کے اعداد دیے جاتے ہیں اور بعض میں برطانیہ عظمٰی کے اعداد ہوتے ہیں حالانکہ انگلستان سے ویلز اور ان دونوں سے سکاٹ لینڈ اور ان تینوں سے شمالی آئرستان علیحدہ ہیں۔ ان جزوی باتوں پر خاص طور پر توجہ اس لئے دلائی جا رہی ہے تاکہ معترض بھی احتیاط کریں اور من مانے طور پر اعداد کو غلط نہ قرار دے دیں۔ احتیاط کی توقع غیر ماہروں سے ناممکن اور نام نہاد ماہروں سے بھی کم ہو سکتی ہے۔

اور مصیبت کی ایک وجہ ہمارے ملک کی اضافی کثرتِ آبادی ہے ۔

محدود ذرائع آمدنی اور سُست رفتارِ ترقی کے مقابلے میں آبادی کس قدر بڑھ رہی ہے اس کا اندازہ گذشتہ دہائیوں کی گنجانی سے ہوگا ۔

سنہ							
۱۹۰۱ء	میں	ہندستان میں	اوسطاً	۱۷۹	لوگ	ہر چوکور میل	پر تھے
۱۹۱۱ء	〃	〃	〃	۱۹۱	〃	〃	〃
۱۹۲۱ء	〃	〃	〃	۱۹۳	〃	〃	〃
۱۹۳۱ء	〃	〃	〃	۲۱۳	〃	〃	〃
۱۹۴۱ء	〃	〃	〃	۲۴۶	〃	〃	〃

گویا اس صدی کے شروع سے اب تک ۶۷ افراد کا بار فی چوکور میل بڑھ گیا ہے ! اور زمانے کی رفتار کے مطابق جتنی ترقی ہم نے کی تھی وہ بڑھتی آبادی کی وجہ سے فنا ہوگئی۔ اگر اسی مدت میں آبادی مساوی رہتی یا گھٹ جاتی تو بے شک جا بجا ترقی کے آثار دکھائی دیتے۔ شہروں اور قصبوں یا گاؤں کے مہاجنوں کے بہی کھاتوں سے زیادہ عوام کی ظاہرہ حالت میں ! شرح موت کے گھٹتے ہوئے اعداد میں ! بڑھتی ہوئی مدتِ حیات میں ! مگر آج حالت اتنی اچھی نہیں ہے ۔ ہم اُسی نقطے کے قریب ہیں جہاں اس صدی کی ابتدا میں تھے۔ ہماری قوم کی عظیم اکثریت بھوکی ہے ، ان پڑھ ہے ۔ چیتھڑوں اور کچی جھونپڑیوں پر قناعت کرنے پر مجبور ہے ۔ اور دین و دھرم کے نام سے قناعت کا بے موقع سبق دینے والے بہتیرے غرض مند ہیں جو قوم کو محکومیت اور غربت میں مبتلا رکھے ہوئے ہیں ۔

تنقید و تبصرہ

The Social Contract and the Islamic State

مصنفہ الیاس احمد، ام اے، لکچرار شعبۂ مدنیات و سیاسیات، جامعہ الہ آباد۔ مطبوعہ دی اردو پبلشنگ ہاؤس، گرانڈ ٹرنک روڈ، جمعہ مسجد، الہ آباد، ۱۹۴۴ء، قیمت ۸/ قسم اول، ۳ روپیہ قسم دوم۔

موجودہ حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ نہ صرف اسلامی سیاسی تخیل کی ایک مستند تاریخ لکھی جائے بلکہ خاص خاص اسلامی سیاسی نظریوں کا بھی تقابلی مطالعہ ہو۔ اس طرح ایک طرف ہمیں سیاسی تخیل کی تاریخ میں اسلام کے صحیح مقام سے واقفیت ہو جائے گی تو دوسری طرف ان سرچشموں کا بھی پتہ چلے گا جن کا بعض مغربی نظریوں کو سیراب کرنے میں نمایاں حصہ رہا ہے۔ سیاسی فلسفیوں نے مملکت کے آغاز کے متعلق متعدد نظریے پیش کئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک معرکۃ الآرا نظریہ "معاہدۂ معاشری" کے نام سے مشہور ہے۔ بیشتر منتقدین نے اسے ایک غیر تاریخی اور خیالی نظریہ قرار دیا ہے لیکن الیاس احمد صاحب نے زیر تبصرہ کتاب میں اس نظریہ کی تاریخی اور حقیقی حیثیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اس سلسلہ میں ہمیں عرب کی ماقبل اسلام اور آغاز اسلام سے متعلقہ تاریخ سے کافی مواد ملتا ہے۔

معاہدۂ معاشری کے مصنفین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سیاسی معاشرہ کے وجود میں آنے سے پہلے "حالتِ فطری" پائی جاتی تھی لیکن اس کے تحت جو ناخوشگوار کیفیات پائی

جاتی تھیں ان سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے لوگوں نے ایک باہمی سمجھوتہ کر لیا اور اپنے حقوق ایک شخص یا جماعت کے سپرد کر دیئے۔ اور یہاں سے سیاسی معاشرہ کا آغاز ہوتا ہے۔

الیاس احمد صاحب نے یہ واضح کیا ہے کہ فطری حالت کا جو خاکہ ہابس نے پیش کیا ہے وہ عرب کے ایام جاہلیت کے حالات کے مطابق ہے۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایام جاہلیت کے حالات حد درجہ غیر تشفی بخش تھے، جنگ وجدال کا بازار گرم تھا اور ہر طرف پراگندگی وانتشار کا دور دورہ تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس زمانے میں قبیلہ واری تنظیم پائی جاتی تھی۔ ہر قبیلہ کے افراد اپنے سردار سے وفاداری کو ضروری تصور کرتے تھے اور ان میں کافی سیاسی شعور موجود تھا۔ لہذا یہ سوال نہایت ہی اہم ہے کہ محض افراتفری، قبیلہ واری اختلاف اور اخلاقی پستی کو کس حد تک "حالتِ فطری" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

مذکورۂ بالا نزاعی بحث کے بعد لائق مصنف نے ان تمام اہم معاہدات کے تفصیلات پیش کئے ہیں جو بالخصوص آنحضرتؐ کے زمانہ میں طے پائے۔ اس سلسلہ میں آپ نے معاہدۂ عقبہ کے مضمرات اور خطبۂ حجۃ الوداع کی سیاسی و معاشرتی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ عہد نبوی میں نہ صرف اسلامی معاشرہ کے قیام بلکہ اس کے استحکام کے لئے بھی کئی معاہدات ہوئے شروع میں مدینہ کی شہری مملکت اور اس کے بعد سارے عرب کی مملکت کا قیام بھی اسی قسم کے معاہدات پر مبنی ہے۔ اسلامی ملّت کی شیرازہ بندی کے لئے جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ یہ تھا کہ نسلی یا جغرافی عناصر کے بجائے چند لازوال روحانی اقتدار کو سنگِ بنیاد قرار دیا گیا۔ الغرض جملہ معاہدات کا مقصد ایک ایسے معاشرہ کی داغ بیل ڈالنا تھا جو کہ نہ صرف انسان کی سیاسی زندگی بلکہ اس کے جملہ پہلوؤں پر حاوی ہو۔

کتاب کا اختتامی حصہ جس میں مصنف نے روسو کے تعلیمات کی اسلامی حیثیت اور خود اس مفکر کا مسلمان ہونا بیان کیا ہے دلچسپ ضرور ہے لیکن مزید شہادتوں کا محتاج ہے۔

ہم لائق مصنف کے مشکور ہیں کہ انھوں نے ایک پرانے موضوع کی نئی تعبیر پیش

کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اسلامی سیاسی تخیل پر کام کرنے والوں کے لئے یہ دلچسپ اور فکر انگیز کتاب ایک نشانِ راہ کا کام دے گی۔

محمد عبدالقادر

مشاہیر یونان و رومہ ـــــ پلوتارک کی کتاب المسیر کا اُردو ترجمہ جلد اول مترجمہ سید ہاشمی صاحب فرید آبادی۔ طبع دوم۔ شایع کردہ انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی۔ قیمت مجلد للعہ، غیر مجلد ہیر۔

'مشاہیر یونان و رومہ' نئی کتاب نہیں ہے۔ یہ آج سے بیس پچیس سال پہلے شایع ہو چکی تھی۔ چنانچہ اکثر اُردو حلقے اس کتاب سے ناواقف نہیں ہیں۔ اُردو دانوں کے لئے، جو مغربی کتابیں بالکل نہیں جانتے اس کتاب کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں ہے، اس سے یونان اور رومہ کی عظمت کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ یونان اور رومہ نے دنیا کی تاریخ و تمدن پر جو اثر ڈالا ہے وہ ظاہر ہے۔ ان قدیم ممالک سے بڑے مشاہیر پیدا ہوئے اور دنیائے علم و عمل میں بڑی ہلچل پیدا کر دی۔ ان ہستیوں کے حالات سے ہر شخص کو واقف ہونا چاہیئے۔ بعض ہستیاں ایسی بھی ہیں جن کے نام عام طور پر زباں زد نہیں، لیکن ان کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کو کوئی نہیں جانتا۔ مثال کے طور پر حکیم افلاطون اور ارسطاطالیس کو سب ہی جانتے ہیں لیکن ان کی حیات اور کارناموں کی کسی کو خبر نہیں کہ آخر ان لوگوں نے دنیا میں کیا کام کیا تھا۔ یورپ تو یونان اور رومہ کا بہت ممنون ہے۔ یورپ کی زبانوں میں اس موضوع کی بہتیری کتابیں مل جاتی ہیں جو ان قدیم مشاہیر کے حالات پر روشنی ڈالتی ہیں، لیکن اُردو میں کوئی مواد نہیں ہے۔ اسی وجہ سے انجمن ترقی اُردو نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے عوام کے سامنے پیش کیا تھا جس کو اُردو میں ایک بڑا اضافہ سمجھنا چاہیئے۔ اُردو زبان کی خدمت کا بڑا ذریعہ یہ بھی ہے کہ اس میں دوسری قوموں کی قدیم و جدید تاریخ، علوم و فنون اور سیاست و تمدن کے قیمتی معلومات منتقل کئے جائیں۔ جس مقصد کے لئے اس کتاب کا ترجمہ کیا گیا تھا وہ بہت کچھ پورا ہوا۔ جب یہ کتاب پہلی مرتبہ شایع ہوئی تھی اس کا اُردو حلقوں میں بہت خیر مقدم ہوا۔ اس وقت یہ کتاب اکثر پرانے کتب خانوں میں پائی جاتی ہے۔

یہ کتاب اصل میں ایک مشہور یونانی انشا پرداز پلوتارک کی تالیف ہے جو انگریزی توسط سے اردو میں پیش کی گئی تھی، یہی کتاب ترجمہ کے لئے موزوں ہوسکتی ہے، کیوں کہ رومی و یونانی ہی اپنے مشاہیر کی ذہنیت اچھی طرح سمجھ سکتے اور پیش کرسکتے ہیں۔ بہت دنوں سے یہ بات محسوس ہو رہی تھی کہ اس کتاب کی جدید اشاعت ہونی چاہیئے۔ اول تو اس کے نسخے کمیاب ہو گئے تھے، دوسرے ترجمے کی نظر ثانی بھی ضروری تھی تاکہ زبان زیادہ سے زیادہ سلیس ہو جائے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقی اردو نے یہ ضرورت محسوس کی اور زبان کی اصلاح کرکے اس کو دوبارہ شایع کیا۔ اس سے ایک بڑی کمی پوری ہوگئی۔ اس کی دوسری جلدیں بھی جلد شایع ہو جائیں تو اچھا ہے جس طرح مترجم نے امید دلائی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ ترجمے کی ایسی نظر ثانی نہیں ہوئی جس طرح ہونی چاہیئے۔ زبان میں زیادہ سلاست کی ضرورت ہے۔ کتاب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ہی ترجمہ ہے۔ ویسے بھی کتاب میں یونانیوں اور رومیوں کے جو نام ملتے ہیں وہ غیر مانوس ہیں۔ ناموں کے لئے تو مجبوری ہے، اس خصوص میں مترجم صاحب کیا کرتے لیکن ترجمے کی زبان زیادہ سلیس ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ حاشئے میں اشخاص اور مقامات کا تلفظ انگریزی میں بھی لکھ دیا جاتا تو ناظرین کو بڑی سہولت ہوتی۔ کیوں کہ جو لوگ انگریزی جانتے ہیں وہ انگریزی وضاحت بھی چاہتے ہیں۔

صدیقی

جنگ اور راشن بندی ـــــ از سعید احمد مینائی، بی۔ اے (عثمانیہ) چھوٹی تقطیع صفحات (۱۱۶) قیمت ندارد۔ شایع کردہ ادارۂ ادب جدید۔ حیدر آباد دکن۔

راشن بندی سے متعلق یوں تو اکثر اخبارات و رسائل میں مضامین شایع ہوچکے ہیں، لیکن اول تو یہ بہت کچھ انگریزی زبان میں ہیں اور دوسرے مخالف یا موافق جذبے کے تحت لکھے گئے ہیں اس لئے عوام خصوصاً انگریزی نہ جاننے والے حضرات،

کے لئے مسئلہ زیر بحث سے متعلق معلومات کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے اس کی اصولی ضرورت و اہمیت اور مختلف نوعیتوں کا اندازہ ہو سکے۔ راشن بندی پر اُردو زبان میں یہ بہت ہی پُر از معلومات کتاب ہے جس کے مطالعہ سے نہ صرف راشن بندی کی غرض و غایت اور اس کی اصولی ضرورت و اہمیت کا علم ہو سکتا ہے بلکہ مختلف ممالک میں جن طریقوں پر راشن بندی کا نفاذ عمل میں آتا رہا ہے اور اس سلسلے میں جن باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے ان سے واقفیت ہو جاتی ہے اور اس کے بعد ہندوستان اور خود حیدر آباد میں اس مسئلہ نے کیا صورت اختیار کی اس کا بھی علم ہو جاتا ہے، اس لئے کہ لائق مصنف نے پہلے اصولی بحث کی ہے اور اس کے بعد مختلف مغربی ممالک کے طریقِ کار کا ایک حد تک تفصیلی ذکر کرتے ہوئے ہندوستان میں باوجود اختلافات کے کیوں کر اور کس نوعیت پر اس کا نفاذ ہوا، اس پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس سلسلے میں عام طور پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کا جواب دینے کی بھی کوشش کی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ راشن بندی کا منصفانہ اصول اور نقطۂ نظر کیا ہونا چاہیئے۔ غرض بہ حیثیت مجموعی بہت بہتر اور جامع ہے جس کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے مفید ہو سکتا ہے جو جنگ کے پیدا کردہ دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ راشن بندی کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

س۔ ف۔ ح

گوتم بدھ ـــــ از ـــــ ڈاکٹر ام، حفیظ سید، ام۔ اے۔ پی ایچ، ڈی۔ ڈی لٹ

شایع کردہ ـــــ انجمن ترقی اردو ہند (دہلی)

قیمت مجلد عصا ۸ر بلا جلد عصم ۸ر

اس چھوٹی سی کتاب میں مہاتما بدھ کی زندگی کے حالات، بدھ مذہب کے اصول، اس کی تبلیغ اور بدھ ممالک میں اس کی موجودہ صورت کے واقعات کو مختصراً لیکن دلچسپ اور سیدھی سادی زبان میں تصنیف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صاف دل

نیک نیتی اور صحیح تحقیق کی غرض سے لکھا گیا ہے۔

چونکہ کتاب چھوٹی سی ہے اور مضمون وسیع اور ہمہ گیر ہے اس لئے بہت سے پہلو چھوٹ گئے ہیں اور بہتیوں کا خاکہ کچا ورنا مکمل رہ گیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی ایسی باتیں بھی درج کی گئی ہیں جو پوری حقیقت کو ظاہر نہیں کرتیں۔

ناموں کے ہجوں کو بھی صحیح نہیں لکھا گیا ہے۔ گوتم بدھ کی جگہ گوتم بُدّھ، انندا کی جگہ آنند، اجات سترو کی جگہ اجات شترو، ویسالی کی جگہ وئی شالی ہونا چاہیئے۔ اسی طرح کئی اور بھی نام ہیں۔ کم از کم تاریخی کتابوں میں ناموں کے صحیح ہجے پوری علامتوں کے ساتھ دیے جانے چاہئیں۔

اُردو زبان میں اس طرح کی بہت کم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اُمید ہے کہ انجمن ترقی اُردو ہند اور دوسری انجمنیں اس طرح کی کتابوں کی اشاعت کو اور بھی زیادہ فروغ دیں گی۔

و۔ د

History and Problems of Indian Currency (1835 - 1943) از۔ پروفیسر ڈی، کے، ملہوترا، استاد معاشیات جامعہ پنجاب۔ شایع کردہ منروا بک شاپ، لاہور۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت ۸ روپے۔

پروفیسر ملہوترا کی کتاب کا پہلا ایڈیشن موجودہ جنگ شروع ہونے سے کچھ روز پہلے شایع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن میں جنگ سے پہلے کے ہندوستانی زر کے مسائل کو اختصار کے ساتھ آسان اور سلیس زبان میں پیش کیا گیا ہے، تاکہ ان مسائل کو طالب علم اور ایسے تعلیم یافتہ اشخاص جنھیں زر کے پیچیدہ مسائل سے دلچسپی ہے سمجھ سکیں۔ شروع میں اُنیسویں صدی میں ہندوستانی زر کی مختصر تاریخ بیان کرنے کے بعد معیار مبادلۂ طلا کے مسئلہ سے ذرا تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ جنگ عظیم اور اس کے فوراً بعد کے حالات کو اختصار سے سمجھانے کی

کوشش کی گئی ہے۔ زیادہ تفصیلی بحث ہلٹن ینگ کمیٹی کی رپورٹ کی سفارشات اور اس کے بعد کے واقعات، خاص طور پر کساد بازاری کے دوران میں ہندوستانی زر کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ سونے کی برآمد، چاندی کی فروخت اور شرح تبادلہ جیسے دقّت طلب مسئلہ کو اس قدر آسان اور دلچسپ پیرائے میں پیش کیا گیا ہے کہ بہت سے اشخاص اس کو سمجھ سکتے اور استفادہ کرسکتے ہیں۔

یہ کتاب بہت زیادہ مقبول ہوئی اور مصنف کو دوسرا ایڈیشن شایع کرنا پڑا۔ یہ ایڈیشن اپریل ۴۴ء میں شایع ہوا ہے۔ موجودہ جنگ نے ہندوستانی زر کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے اور زر کے بہت سے نئے نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ موجودہ گرانی کی وجہ سے زر کے مسائل میں لوگ زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ نئے ایڈیشن میں ان مسائل سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ نگرانی تبادلہ کی تفصیلات ملتی ہیں۔ افراطِ زر کے اسباب، اس کا تعلق حکومتِ ہند کی مالیاتی پالیسی سے، اور ہندوستانی معاشرہ خاص طور پر زرعی طبقہ پر اس کے اثرات سے تسلی بخش بحث کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ افراطِ زر کے متعلق مختلف لوگوں کے خیالات کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ غرض افراطِ زر کے سلسلہ میں جو کچھ مباحث ہوئے ہیں ان کا خلاصہ بہت خوبی سے دیا گیا ہے۔ اسٹرلنگ کے فاضلات کے مسئلہ کی تفصیلات بھی کتاب میں ملتی ہیں۔

آخری باب میں ہندوستانی زر کے مستقبل عنوان کے تحت امریکی، برطانوی اور کنیڈائی حکومتوں کی طرف سے جو بین الاقوامی زر کے منصوبے پیش کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ ملتا ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ کن شرائط کے ساتھ ہندوستان کا بین الاقوامی زر کی تنظیم میں شریک ہونا مفید ثابت ہوگا۔ یہ ہیں وہ چند اہم مسائل ہیں جن سے نئے ایڈیشن میں بحث کی گئی ہے اور جن کی وجہ سے کتاب کی افادیت میں دوچند اضافہ ہوگیا ہے۔

کتاب کے آخر میں چند مفید ضمیمہ جات دیئے گئے ہیں، ان میں خاص طور پر کتابوں کی فہرست بہت ہی مفید ہے، اور مسائل کی تفصیلات معلوم کرنے والوں کو ان کتابوں سے بہت بڑی مدد مل سکتی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ دوسرا ایڈیشن پہلے ایڈیشن کے مقابلہ میں اور بھی زیادہ مقبول ہوگا، اور معاشیات کے زیادہ سے زیادہ طلباء اور تعلیم یافتہ حضرات اس سے استفادہ کریں گے۔ (ا۔ ح۔ خ)

مجلۂ طیلسانین

۱۔ "مجلۂ طیلسانین" انجمنِ طیلسانین جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ ہے۔

اس کا شمار حیدر آباد کے معیاری رسالوں میں ہوتا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں: ایک حصہ عام اور دوسرا حصہ معاشیات۔

۲۔ حصہ عام میں ادبیات، سیاسیات، عمرانیات، اخلاقیات، نفسیات، قانونیات، فلسفہ، دینیات اور جمالیات پر ماہرین کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔

۳۔ حصہ معاشیات صرف معاشی عنوانات کے لئے وقف ہوتا ہے۔ اس میں نظری اور علمی معاشیات پر اہلِ قلم کے مضامین شامل ہوتے ہیں۔ مقامی اور بیرونی مسائل حاضرہ پر ٹھیٹ علمی پیرائے میں بحث کی جاتی ہے۔

یہ رسالہ رائل سائز کے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے اعلیٰ مضامین اور اس قدر زیادہ حجم کے باوجود اس کا سالانہ چندہ مقامی خریداروں سے پانچ روپے سکۂ عثمانیہ اور بیرونی خریداروں سے پانچ روپے بارہ آنے سکۂ انگریزی مع محصول ڈاک رکھا گیا ہے قیمت فی پرچہ (عہ۸) ہے۔

انجمن طیلسانین عثمانیہ۔ نمائش گاہ باغ عامہ۔ حیدر آباد دکن ٹیلیفون نمبر (۲۵۵۳)

ہندستان کی شماریاتِ آبادی

اور

اُس کی عمرانیاتی تشریح

(گذشتہ سلسلے سے)

ہندستان کی مردانی اور نسوانی آبادی

مردانی آبادی سے مراد صرف بالغ آبادی ہی نہیں بلکہ سارے ملک کے تمام بچے، لڑکے، نوجوان، جوان اور ادھیڑ مرد اور بوڑھے ہیں۔ نسوانی آبادی میں تمام بچیاں، نوجوان، جوان اور ادھیڑ عورتیں اور بوڑھیاں شریک ہیں۔ یورپ کے تمام ملکوں میں مردانی آبادی کے مقابلے میں نسوانی آبادی زیادہ ہوتی ہے مگر ہندستان میں تمام مردم شماریوں کے مطابق نسوانی آبادی سے مردانی آبادی زیادہ ہوتی ہے چنانچہ ۱۹۴۱ء کے گنادے سے ظاہر ہے کہ

سارے ملک میں بیس کروڑ دس لاکھ بچے، لڑکے اور مرد ہیں

اور اٹھارہ کروڑ اسی لاکھ بچیاں، لڑکیاں اور عورتیں ہیں

گویا ۱،۳۰،۰۰،۰۰۰ یعنے ایک کروڑ تیس لاکھ کی مردانی آبادی زیادہ ہے!

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مردوں اور عورتوں، لڑکوں اور لڑکیوں، بچوں اور بچیوں کی تعداد برابر ہوگی کیونکہ "قدرت جوڑے بنا بنا کر بھیجتی ہے" یا "جنت ہی میں جوڑے بنا دیے جاتے ہیں۔ بہتیرے مردوں کا یقین ہے کہ "مردوں سے زیادہ عورتوں کی تعداد ہوتی ہے، اسی لیے دو بیویاں رکھنا یا دو سے زیادہ شادیاں کرنا نہ صرف جائز بلکہ لازمی اور قدرت کا اٹل قانون ہے!"

انگریزی کی ایک بڑی اچھی کہاوت ہے کہ

"The devil himself can quote the scripture" "خود شیطان بھی مقدس تحریر کا حوالہ دے سکتا ہے!"

یہ کہاوت اس عام ذہنیت کا پتہ دیتی ہے کہ لوگ اپنے کرتوتوں کو جائز یا ضروری ظاہر کرنے کے لیے بلکل غیر متعلق اور بسا اوقات متضاد حوالے دیتے ہیں اور اپنی خود غرضانہ نفسانیت میں اتنے بہک جاتے ہیں کہ جس ثبوت سے ان کے بیان یا اعتقاد کی تردید ہوتی ہے اسی کو وہ اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں ۔ اسی قسم کے مغالطے میں وہ لوگ مبتلا ہیں جو اس مفروضے کے تحت کہ ہر جگہ مردوں سے زیادہ عورتوں کی تعداد ہوتی ہے کثرتِ ازدواج کو قدرت کا "اٹل قانون" سمجھتے ہیں!

انھیں معلوم کر کے کس قدر حیرت ہوگی کہ ہر جگہ لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکے زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور پیدائش کے وقت ہی بچوں اور بچیوں کی تعداد میں عدم تناسب ہوتا ہے ۔ چنانچہ ہزاروں مشاہدوں اور سالہا سال کا تجربہ رکھنے والوں کے بیانوں، نیز شماریاتی تحقیقوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جہاں ہزار لڑکے پیدا ہوتے ہیں تقریباً ۹۵۳ لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں اور فی ہزار چالیس سے پچاس تک لڑکیوں کی کمی ہوتی ہے ۔

اکثر گھرانوں میں لڑکوں کی دیکھ بھال زیادہ ہوتی ہے اور لڑکیوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مذہبی تعصبات یا وہم پرستیاں لڑکیوں کے خلاف ہیں ۔ معاشی نقطۂ نظر سے بھی لڑکے کو "آمدنی" کا ذریعہ اور لڑکی کو خرچ کا مد تصور کیا جاتا ہے ۔ ہزاروں تعلیم یافتہ

اور مغربی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ اور لاکھوں مغربی تعلیم سے فیض یافتہ لوگ موجود ہیں جو لڑکے کی پیدائش سے خوش اور لڑکی کی پیدائش سے افسردہ ہو جاتے ہیں!! لڑکے کے پیدا ہونے پر خوشیاں منانا ایک عام رسم ہے۔ ولیعہد سلطنت سے لے کر معمولی گھرانے میں لڑکے کی پیدائش کو خاندان کے تسلسل، مضبوطی اور درخشاں مستقبل کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے اور سب سے زیادہ "بقائے نام" کا ذریعہ!! شاعر و ادیب، عالم و جاہل، تعلیم یافتہ اور ان پڑھ؛ سب کے سب اپنی نظموں، کہانیوں، قصوں، اور روز مرہ کی بحثوں اور گفتگو سے اس خیال کی تشہیر کرتے ہیں کہ ذاتی اور خاندانی دونوں نقطۂ نظر سے لڑکی سے لڑکا بدرجہا بہتر ہوتا ہے!

اس تعصب آمیز مغالطے کا لازمی اثر لڑکیوں کی دیکھ بھال پر پڑتا ہے اور نسبتاً زیادہ بچیاں مر کھپ جاتی ہیں اور اس غیر متناسب توجہ اور حفاظت کی وجہ سے مردانی اور نسوانی آبادی کا عدم تناسب بڑھ جاتا ہے۔

ہندستان کے عام سماجی رواج کے مطابق لڑکیوں کی شادی بہت ہی کم عمری (یا قانونی مجبوری ہو تو) تو جوانی کی بالکل ابتدائی حالت میں کر دی جاتی ہے۔ انسانی بدن اچھی طرح نشو و نما نہیں پاتا کہ پیدائش کا ذریعہ بنا دیا جاتا ہے، نیز اکثر لڑکیوں اور عورتوں کو جلد جلد اور بار بار حمل سے زیر بار ہونا پڑتا ہے، جس کو ان کی کم طاقتی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ انھیں افلاس کی وجہ سے ناکافی اور ناموافق غذا ملتی ہے اور اکثر ماہرانہ امداد کے بغیر (صرف اناڑی دائیوں یا غیر تجربہ کار عورتوں کے سہارے) اپنے ماں پن کے فرائض کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ ہندستانیوں کی ازدواجی زندگی کے تاریک رسوم نے قومی تباہی میں بہت کافی حصہ لیا ہے اور آج کروڑوں لوگوں کی کم طاقتی، بیماری، سدا کے روگ وغیرہ کا ایک اہم سبب گذشتہ نسلوں کی غفلت، ہمارے آبا و اجداد کی جاہلانہ تنگ نظری؛ اور قومی رہنماؤں اور حاکموں کی مجرمانہ لاپرواہی ہے۔ ہم ایک ایک کر کے اپنی نادانیوں اور کم سمجھیوں کی سزا

بھگت چکے ہیں ۔ ہم نے حکومت کھوئی ، حاکم سے محکوم بنے ؛ ہم نے دولت گنوائی مرفہ الحال سے مفلس اور کنگال ہوئے ، ہم نے صحت اور طاقت کو برباد کرنے والی یا دونوں کے معیار کو گھٹا کر زندوں کی جان کو دوبھر بنانے والی رسمیں اختیار کرکے نہ صرف خود کو معصیت میں گرفتار کیا بلکہ تمام قوم کے مستقبل کو خطرے میں مبتلا رکھا ہے ۔ مستقبل کی امیدوں کا ذریعہ مرد اور عورت دونوں ہیں اور دونوں کی طاقت وصحت کی سلامتی سے طاقتور اور صحت مند اولاد پیدا ہوسکتی ہے ۔ قومی صحت و طاقت کے معیار کو بڑھانے کے لئے جہاں معاشی دولت ، سیاسی نگرانی اور عمدہ علاج معالجہ اور حفاظت صحت کی تدبیریں لازمی ہیں وہاں عمدہ سماجی ماحول بھی ضروری ہے تاکہ کم سنی کی شادی نہ ہو ! بالکل عنفوان شباب میں شادی نہ کردی جائے ، جلد جلد اور بار بار کے حمل سے عورتوں اور بچوں کی صحت کو بری طرح متاثر نہ کیا جائے ، پردے کی قید اٹھادی جائے اور ماہرانہ علاج سے حجاب نہ ہو۔

غرض کئی وجوہ سے (جن میں شادی کی رسمیں اور اناڑی دائیاں بھی شریک ہیں) عورتوں کی تعداد اور زیادہ گھٹ جاتی ہے اور پچاس برس سے کم عمر والی آبادی میں مردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ، عورتوں اور لڑکیوں کی نسبتاً اور کم ۔

قدرتی عدم تناسب کی اہمیت شادی بیاہ کی رسموں اور سماجی طریقوں کے علاوہ ایک اور سبب سے بڑھ جاتی ہے : ہندوں اور مسلمانوں ، جینوں اور سکھوں میں دو دو ، تین تین اور چار چار شادیاں کرنے کی اجازت اور رواج ہے[۱] ۔ بعض خوش حال لوگوں کے پاس منکوحہ یا بیاہتا اور جائز یا قانونی بیویوں کے علاوہ رکھیلیوں اور خواصوں کی پلٹن کی پلٹن ہوتی ہے ۔ اور ایسے بھی نام نہاد مذہبی رہنما اور "مخلص" رہبر موجود ہیں

---

[۱] ۔ عیسائیوں اور پارسیوں کا نام جان بوجھ کر نہیں لیا گیا کیونکہ عیسائیوں اور پارسیوں کے لئے پہلی بیوی کی زندگی میں یا اس کو باقاعدہ طور پر طلاق دیئے بغیر دوسری شادی قانونی طور پر منع ہے ۔

جن کی ناپاک زندگیوں کا تاریک ترین باب ان کی جنسی زندگی ہے! جس میں جرائم اور عصمت فروشی؛ منظم فریب اور سرتاپا نفسانیت پائی جاتی ہے۔ غرض ہندستان میں ہزاروں دو بیویے یا تین بیویے یا کئی بیویے ہیں جن کی وجہ سے مردانی اور نسوانی آبادی میں عدم تناسب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے اور اس عدم تناسب کی وجہ سے شدید سماجی مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب مردوں اور عورتوں کی تعداد میں شروع ہی سے فرق ہوگا تو یہ فرق آسانی سے مٹایا نہیں جاسکے گا اور اس فرق کا دُور کرنا ناممکن ہوگا اگر ہمارا سماجی ماحول اور سماجی زندگی پر اثر انداز ہونے والے مذہبی رواج اور سرکاری قانون اس فرق کو مٹانے کی بجائے اُلٹا اور بڑھائیں۔ غرض کئی وجہوں سے ہندستانی مردوں کی ایک معقول تعداد بن جوڑے کے رہ جاتی ہے اور وہ اپنے قدرتی جذبات کو تشفی پہنچانے کے لئے وہ راستہ اختیار کرتے ہیں جو روز ازل سے تہذیب و تمدن کے لئے کلنک بنا ہوا ہے۔

عصمت فروشی کی منظم تجارت اور اس تجارت کے تاریک ترین پہلوؤں کو بیان کرنے کے لئے صرف ایک مثال سُنئے کہ ہزاروں لڑکیاں دھوکے اور بھُوک سے مجبور ہوکر اس پیشے میں ڈھکیلی جاتی ہیں اور ان میں سب سے زیادہ بدنصیب وہ قابلِ رحم ہستیاں ہیں جو چوانیوں اور دوانیوں کے لئے ہمہ قسم کے رذیلوں اور اوباشوں، بیماروں اور نفس پرستوں کو گوارا کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کی مجبوری اور بے بسی انھیں اس خطرناک پیشے سے نکلنے نہیں دیتی، وہ نکلنا چاہیں بھی تو سماج اور استحصال کا جال نکلنے نہیں دیتا اور وہ بہت جلد خود بیماریوں میں مبتلا ہوکر مرکھپ جاتی ہیں۔ اس طبقے کی سب سے زیادہ بدقسمت ہستیاں دو تین سال ہی میں موت کا شکار ہو جاتی ہیں! پھر بھی ہمارے اخلاق پرست نقاد اور انصاف کا دعوےٰ کرنے والے مولوی ان بیچاریوں پر "نفسانیت" کا الزام لگاتے ہیں!! گویا وہ اپنے عزم، ارادے، شوق اور انتخاب سے

"حرام کاری" میں مبتلا ہیں۔

"ملاں کاریوں" کا نتیجہ تو ما تر مندر ہیں اور دیوداسی طریق یا مریدوں کی بہوبیٹیوں اور بیویوں اور چہیتوں کے ساتھ حسن سلوک! ان باتوں کی تفصیل پیش کرنے کی تاب ہوتی بھی تو ہمارے خودپسند سماج میں سننے اور برداشت کرنے کی اہلیت کہاں ہے؟

اعداد و شمار کی روشنی میں مختلف تمدنی اور سماجی مسئلوں کی توضیح کرتے ہوئے مجھے کئی بار خیال آیا کہ اعداد و شمار پر سماجی رسموں اور طریقوں کا اثر پڑتا ہے یعنے یہ کہ ان کی نوعیت واہمیت بدل جاتی ہے۔ چنانچہ مردانی اور زنانی آبادی میں عدم تناسب جو بہرحال فطرت کے اٹل دستور کی وجہ سے شروع ہوتا ہے، لڑکیوں اور عورتوں کی عدم حفاظت اور ان کی جانیں ضایع جانے کی وجہ سے بڑھ جاتا ہے اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ ہندستان میں طلاق کی ممانعت یا محدود رواج ہے، نیز بیواؤں سے دوبارہ شادی بری نظروں سے دیکھی جاتی ہے اور ہندؤں کے کئی فرقوں میں قانونی طور پر منع اور مسلمانوں میں عملاً دشوار اور بعض جماعتوں میں ناممکن ہے۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر بسا اوقات مخصوص فرقوں، طبقوں اور جماعتوں میں شادی کرنے والے مرد تو زیادہ ہوتے ہیں مگر قابلِ بیاہ عورتیں یا لڑکیاں کم ہوتی رہیں۔ چونکہ ہمارے ملک میں ذات پات کی بندھنیں ہیں، نیز نسل، فرقے اور جماعت کا خیال بھی بہت کیا جاتا ہے اس لئے بعض مرتبہ ایسی صورتیں پیدا ہوتی ہیں کہ ایک شخص کو شادی کے لئے اپنی جماعت میں لڑکی کی پیدائش کا انتظار کرنا پڑتا ہے!! اور ایسا بھی ہو چکا ہے کہ کسی حاملہ کے بطن کے بچے سے کسی نوجوان کی —— مشروط شادی ہوئی ہے! جو صرف بچے کے ہم جنس ہونے کی صورت میں کالعدم ورنہ پکی ہو جاتی ہے!

"دلہن مول" یعنے بیاہ کے لئے لڑکی کے ماں باپ کو نذر دینے کا طریقہ بھی بیاہ کے آرزومند مردوں کی کثرت اور عورتوں کی کمی یا قابلِ بیاہ عورتوں کی قلت کی

وجہ سے پیدا ہوا ہوگا ۔ اگر ان ہی جماعتوں میں بیواؤں سے دوبارہ شادی کرنے اور طلاق کو جائز یا مروج کرنے کے طریقے اختیار کئے جائیں تو "لڑکیوں کا کال" کم ہوجائے! کیونکہ نہ صرف بہت سے مرد خاص کر ادھیڑ اور رنڈوے، بیواؤں سے شادی کریں گے بلکہ دوسری بیوی لانے سے قبل پہلی کو رہا کریں گے یا رہا کرنے پر مجبور ہونگے! جن گھرانوں میں دو دو تین تین بن بیاہی لڑکیاں "بیٹھی" ہیں اور تلاش کے باوجود بر نہیں ملتا اور جو جہیز دینے تیار ہیں وہ معکوس جہیز "دلہن مول" کے فلسفے کو ناقابلِ اعتبار سمجھیں گے! مگر حقیقت کیونکر بدل سکتی ہے؟ دُنیا کی ہر جنس کی طرح شادی بیاہ کے بازار میں کہیں قلت ہے کہیں کثرت! کبھی زیادتی ہے کبھی کمی! کہیں ان کا حاصل کرنا دشوار ہے اور کہیں ان کا اُٹھانا ناممکن! اس کا بھی نام دنیا ہے!

ہندستان دیہاتی ملک ہے

۳۸،۹۰،۰۰،۰۰۰ یعنے تقریباً ۳۹ کروڑ لوگوں میں سے

۳۳،۹۳،۰۰،۰۰۰ " " ۳۴ " گانو کھیڑوں میں رہتے ہیں

۴،۹۷،۰۰،۰۰۰ " " ۵ " قصبوں اور شہروں میں

لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندستانیوں کی عظیم اکثریت دیہاتی ہے شہری نہیں! پھر بھی سیّاح، حاکم، محقق، اڈیٹر شہروں کو ہندستان سمجھتے ہیں اور کلکتہ اور بمبئی، کراچی اور مدراس، حیدرآباد اور لکھنو، بریلی اور بنگلور، بروڈا اور میسور کے حالات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہی "ہندستان" ہے ۔ حالانکہ حقیقی ہندستان گُم نام کھیڑے، غیر مشہور گانو، چھوٹی چھوٹی بستیاں اور منتشر جھونپڑیاں ہیں، جہاں نہ "لائیٹ" ہے نہ ریڈیو، اخبار ہے نہ مدرسہ، موٹریں ہیں نہ ہسپتال!

اشوک اعظم کے قدیم ترین زمانے میں یا مغل بادشاہوں کے سُنہرے دَور میں

یہ لوگ جس طرح رہتے بستے تھے تقریباً اب بھی رہتے بستے ہیں ۔ انپڑھ ، نیم فاقہ کش ، بیماریوں میں مبتلا ، پھر بھی حیرت انگیز طور پر مطمئن اور جاندار ! ان کا فلسفۂ حیات ، سکون پسندی، اطمینان قلب ، مہمان نوازی ، خوش سلوکی ، ہمدردی قابل تعریف مگر ان کی گندگی، کاہلی، ضرورت سے زیادہ قناعت پسندی اور سب سے زیادہ سماج پرستی قابل نفرت ہے ۔

ہندستان کو سنبھالنا ہے تو اس کی ابتدا شہروں کے ساتھ ساتھ گانوؤں سے کرنی چاہیے کیونکہ ہندستان میں اگرچہ

۵۷ بڑے شہر ہیں جن میں سے ہر ایک کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ ہے

۹۵ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ تک ہے

۳،۷۵۰ قصبے ہیں 〃 〃 〃 〃 〃 دس اور پچاس ہزار کے درمیان ہے

گویا ۳،۹۰۲ شہروں اور قصبوں میں تقریباً پانچ کروڑ کی آبادی ہے

مگر ۲۲،۱۵۱ بڑے گانو ہیں جن میں سے ہر ایک کی آبادی دو اور پانچ ہزار کے درمیان ہے

۱،۸۱،۳۱۹ چھوٹے گانو ہیں 〃 〃 〃 〃 〃 پانسو سے دو ہزار تک ہے

اور ۴،۵۰،۹۰۲ کھیڑے ہیں جن کی آبادی پانسو سے بھی کم ہے

یعنے ۶،۵۴،۳۷۲ بستیوں میں ۳۴ کروڑ کی آبادی ۔

ہندستان کی کُل آبادی میں سے فی سو ۱۳ آدمی شہروں ، اور قصبوں میں رہتے ہیں اور ۸۷ گانو کھیڑوں میں !

پھر بھی مرکزی حکومت کی طرح ، صوبائی اور ریاستی حکومتیں اپنی عنایتیں زیادہ تر شہروں پر کرتی ہیں ۔ تعلیم اور آرائش ، صاف پانی اور نمایش ، عمدہ سڑکیں اور روشنی ، دواخانے اور زچہ خانے ، بے گردی سڑکیں اور کھیلوں کے میدان اور تفریح گاہیں ، باغ اور جھولے زیادہ تر شہروں کے لیے فراہم کئے جاتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ بڑے بڑے بنک گانو کھیڑوں میں نہیں کھولے جا سکتے اور گانو کو کسی ریلوے کا مرکز نہیں بنایا جا سکتا ! مگر اس کے یہ معنے تو نہیں کہ شہروں میں فالتو درس گاہیں یا کالجوں پر کالج کھلتے جائیں ؛

اور ہزاروں گانو ٔ میں معمولی سا مکتب یا پاٹ شالہ بھی نہ ہو! سرکاری رقموں سے بڑے شہروں کی زیبایش اور آرایش پر کروڑوں روپیہ خرچ کیا جائے مگر دو دو ہزار کی بستیوں میں ایک بھی تربیت یافتہ ماہر دائی نہ ہو، شہر کی نمایشوں اور عجائب گھروں پر قوم کا بے حساب روپیہ صرف ہو مگر ہزار ہزار کی آبادی والے گانو ٔ کے بچوں کے لیے ایک جھولا اور کرنجی ڈنڈا بھی نصب نہ کیا جائے! اصل بات یہ ہے کہ حاکموں کے زاویۂ نگاہ میں انقلاب کی ضرورت ہے اور اس ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لیے لاکھوں تعلیم یافتہ اور حقیقت سے باخبر افراد درکار ہیں۔ جب لاکھوں کی تعداد میں یہ لوگ قومی مرفہ الحالی اور تباہی، ترقی اور جمود، زوال اور موت کی کہانی پڑھیں گے اور ان کے وجوہ معلوم کریں گے تو قدرتی طور پر ان میں کئی کو سُدھار کا خیال ہوگا اور ان میں سے چند کو صحیح عمل کی توفیق نصیب ہوگی۔ تمدن کی اصلاح کے لیے تمدن کے سمجھنے والوں کی ضرورت ہے۔ سماج اور معیشت، مذہب اور سیاست کے سمجھنے والے ہی زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان میں موافقانہ تبدیلیاں پیدا کرسکتے ہیں۔

شہری آبادی

ہندستان کے سب سے بڑے دس شہر

تہذیب و شائستگی کے نقطۂ نظر سے نہیں ، باشندوں کی دولت اور خوش حالی کے زاویۂ نگاہ سے نہیں ، صحتِ عامہ کے اعتبار سے نہیں ، معیارِ تعلیم اور معیارِ آرام کے لحاظ سے بھی نہیں بلکہ صرف باشندوں کی مجموعی تعداد کے مطابق !! چاہے ان میں کتنے ہی بے روزگار ، سدا کے روگی یا اَن پڑھ ہوں یا مصیبت و جہالت میں مُبتلا ہوں یا جرائم پسندی اور استحصال ، لُوٹ اور فریب سے روزگار حاصل کر رہے ہوں یا تعطّل اور بیکاری میں طفیلیوں کی طرح مفت خوری کرنے پر مجبور ہوں ، چاہے ان میں بہتیرے سرکاری تجوری اور قومی آمدنی پر بیجا بار ہوں یا بخت اور اتفاق سے اپنے باپ دادا کی طرح قوم کے سہارے نخوت اور تعیش سے زندگی بسر کر رہے ہوں !

کلکتہ اور ہاوڑا کی آبادی	۱۹۴۱ء میں		۲۴،۸۰،۰۰۰
بمبئی	”	”	۱۴،۹۰،۰۰۰
مدراس	”	”	۷،۷۷،۰۰۰
حیدرآباد (دکن)	”	”	۷،۳۹،۰۰۰
لاہور	”	”	۶،۷۲،۰۰۰

احمد آباد کی آبادی ۱۹۴۱ء میں		۵،۹۲،۰۰۰
دہلی	" "	۵،۲۲،۰۰۰
کانپور	" "	۴،۸۷،۰۰۰
امرتسر	" "	۳،۹۱،۰۰۰
لکھنو	" "	۳،۸۷،۰۰۰

ان تمام شہروں کی عام اور مشترک خصوصیت یہ ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد کم، بعض میں بہت کم ہے۔ شہروں میں مردانی آبادی کی نمایاں کثرت شہریوں کے جنسی اخلاق پر اثرانداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسی لیے ہر شہر میں عصمت فروشی کا بھی بازار ہوتا ہے جس کی رونق اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ شہروں میں رہنے والے کماؤ مرد بہت ہوتے ہیں جن کی روک ٹوک کرنے والیاں کوئی نہیں ہوتیں اور بے لگام ہوکر اپنے نفسانی خواہشوں کو پورا کرتے ہیں۔ ان ہی اسباب کی بنا پر تمدن کی ابتدا سے علم اور حکمت کے ساتھ ساتھ شہر جرائم، نفسانیت، فریب اور جھوٹ کا مرکز رہے ہیں!! ان کی تاریخ سرتاپا کامیابیوں اور کامرانیوں کی سرگذشت نہیں بلکہ سفید و سیاہ کا مجموعہ ہے۔ ان کی تاریخ میں بعض صفحے اچھے ہیں، بعض رنگین ہیں، بعض پر سنہرے حرفوں سے دل پذیر داستان لکھی ہے مگر بہتیرے ورقوں پر رنج و مصیبت کی نشانی، کالی پٹی، چھپی ہے۔ بہت سے صفحوں پر مندرجہ نامۂ اعمال افسوس ناک اور شرم ناک ہے۔ ان میں سے کئی صفحے ناقابلِ بیان اور ناقابلِ تشریح سیاہ کاریوں کی سرگذشت پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے جزو جزو دُکھ بھری کہانیوں، مصیبت کے سچے قصوں اور ظلم و استحصال کے شکار بھولے بھالے یا کم سمجھ یا زود اعتماد بدقسمتوں کی درد بھری داستانوں سے لکھے گئے ہیں۔

ان تمام شہروں کی ایک اور مشترک خصوصیت مکانوں کی قلت اور صفائی کی

غیر تشفی بخش حالت ہے؛ امیروں کے محلّوں، عہدہ داروں کے رہائشی حصوں، سرکاری دفتروں اور بڑے بڑے بازاروں اور باغوں کے علاوہ ہر شہر میں غریب واڑے اور غلیظ واڑے ہیں؛ جن کی تاریکی اور گندگی بیسویں صدی ہی پر نہیں انسانیت پر ایک بدنما داغ ہے۔

انسانیت نے خاص کر مشرق میں ابھی اس بات کو اچھی طرح محسوس نہیں کیا کہ شہروں کی رونق سمنٹ کی شاہراہوں، عالیشان محلّوں، خوب صورت ناموں، موثر تشہیر اور زرخرید یا جبری ستائش میں نہیں بلکہ شہریوں کی صحت، اخلاق، تعلیم اور مرفہ الحالی میں ہے۔

حیدرآباد کے متعدد لوگ فخریہ کہتے ہیں کہ "حیدرآباد ہندستان کا چوتھا بڑا شہر ہے" اس عامیانہ ذہنیت کا انکشاف ان عہدہ داروں نے بھی کیا جنھوں نے ۱۹۴۱ء کے اعداد شایع کرتے ہوئے بڑا اطمینان ظاہر کیا تھا کہ

"حیدرآباد ہندستاں کے شہروں میں چوتھے درجے کو برقرار رکھ سکا"

کلکتہ کے کم ظرف اس خصوصیت پر ناز کرتے ہیں کہ کلکتہ

"مملکتِ برطانیہ کا دوسرا بڑا شہر ہے"۔

دوسرے یا چوتھے ہونے پر خوشی یا فخر یا ناز کی کیا بات ہے جب کہ ہزاروں شہری ان پڑھ ہیں، لاکھوں بے گھر ہیں، اور ان گنت تعداد افلاس اور بھوک کی اٹل مصیبتوں میں گرفتار ہیں۔ عمرانیات اور اخلاقیات ہی نہیں، سیاسیات اور علم تمدن ہی نہیں، انسانیت، شرافت، تہذیب اور شایستگی کے نقطۂ نظر سے کیا یہ زیب دے سکتا ہے کہ جن شہروں میں لوگ بھوکوں مر رہے ہیں اس کی تعداد پر ناز کیا جائے یا جن بھکاریوں اور معذوروں کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو ان کو بھی شہری تعداد کو "باوقار" بنانے کے لیے شمار کر لیا جائے!! بڑی تعداد سے مرعوبیت بیسویں صدی کی ذہنی کمزوری ہے۔

دکھی بھارت

یعنے

بیماریوں میں مبتلا

اور

سدا کا روگی ہندستان

کل ہندستان کی صحتِ عامّہ کی ایک حالیہ روئداد میں لکھا ہے:

"میعادی اور پیلے بخار کو چھوڑ کر Excepting typhoid and yellow fever
ہندستان دُنیا کے لیے اثر انگیز India is one of theworlds reservoirs
بیماریوں کا سرچشمہ ہے، طاعون of infection for the others ond the main
اور ہیضے کے لیے تو جراثیم کا خاص reservoir of infection for plague and
مہا ساگر!" cholera.

کیا تعریف ہے ہندستان کی! وہ ملک جس نے قدیم زمانے میں شانتی اور محبت کا پیام بھیجا تھا اور جہاں کے مقدّس مقاموں سے فیض یاب ہونے کے لیے دور دور سے جاتری آتے تھے آج ساری دنیا کے لیے گھناؤنی بیماریوں کا سرچشمہ اور خطرناک جراثیم کا مہا ساگر بنا ہوا ہے۔ ہیضہ اور چیچک، طاعون اور کوڑھ ہندستان میں اس طرح جمے بیٹھے ہیں جیسے کسی جیو رکشا سبھا میں پالتو جانور!

اس میں شک نہیں کہ ان بیماریوں اور وباؤں کا وجود ہر غیرت مند حکومت کے لیے باعثِ شرم ہے مگر حکومت سے زیادہ ہم پر حرف آتا ہے کیونکہ

بہر حال بھگتنا تو ہمیں ہی پڑتا ہے اور بڑی حد تک ان کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ ہماری گندگی، غلاظت سے لاپرواہی، نفاست سے بیزاری، غفلت، قسمت پرستی، جہالت، بے ایمانی، کاہلی، بہانہ بازی اور فرائض سے مجرمانہ غفلت بیماریوں اور وباؤں کو پھیلانے کا اصل باعث ہیں۔

سماج اور افراد کی اس سے بڑھ کر مجرمانہ غفلت اور کیا ہوسکتی ہے کہ جو تیل طاعونی چوہوں کو جلوانے کے لیے ہمارے اختیار میں آتا ہو اس میں سے پیسے کے پیسے گھریلو استعمال کے لئے لیئے جائیں اور گھر کا خرچ چلانے والے خوش ہوں کہ انھیں چند روپیوں کی کفایت ہوتی! یہ فرضی اتہام یا غیر معتبر الزام نہیں بلکہ بالکل سچا اور طاعون کے "سنہرے دَور" کا عام تجربہ ہے۔ اگر ہندستان کی سماجی ذہنیت اتنی پست نہ ہوتی اور ایسے ناجائز اور خطرناک استحصال کو گوارا نہ کرتی تو وباؤں کا زور آدھے سے زیادہ ٹوٹ گیا ہوتا۔

میرا مقصد حکومت کو اس کے حصۂ الزام سے چھٹکارا دلانا نہیں ہے اور نہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہندستان میں بیماریوں کی کثرت اور وباؤں کی شدّت سے مرکزی، صوبائی، ریاستی اور مقامی حکومتیں بری الذمہ ہیں بلکہ میرا اصل مقصد عمرانیاتی نقطۂ نظر سے اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ

سماج تمام خوبیوں اور برائیوں کا سرچشمہ ہے جس طرح
تمام بھلائیوں کا سہرا سماج کے سر ہوتا ہے اسی طرح
تمام برائیوں کی ذمہ داری سب سے زیادہ اور
سب سے پہلے سماج پر عاید ہوتی ہے۔ اگر حکومتیں خراب
ہیں یا غافل ہیں تو بھی یہ سماج ہی کا قصور ہے کیونکہ
ہر قوم کو ایسی ہی حکومت ملتی ہے جس کی وہ مستحق ہو!

یہاں فلسفیانہ اور نظری مباحثوں کی تشریح نہیں ہوسکتی البتہ یہ بتانے کے لیے کہ

ہندستان کو "جراثیم کا مہاساگر" بنانے میں لوگوں کا کتنا حصہ ہے، چند مثالیں دی جاتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے بالکل ابتدائی زمانے کے کسی میدانِ جنگ پر مخالف فوجیں سبقت کے انتظار میں ڈیرہ ڈالے ہوئی تھیں ۔ یوں ہی مسلمانوں کی تعداد کم اور فوجی حالت اور کیفیت مخدوش تھی، اس پر وبا کی نئی مصیبت ٹوٹ پڑی ۔ چند لوگ وبا کے ڈر سے فرار ہو گئے باقی بھاگنا چاہتے تھے یا یہ کہ کافی لوگوں کے متعلق یہ گمان ہو سکتا تھا کہ وہ بھی وبا سے ڈر کر بھاگ جائیں گے ۔ حالت نازک تو تھی ہی، خطرناک ہو گئی ۔ ایسی صورت میں حکم دیا گیا کہ

"وبا سے ڈر کر بھاگنا جائز نہیں"۔

لوگ ٹھہر گئے، اور ایک زبردست خطرہ، جس سے مسلمانوں کو سخت ترین نقصان پہنچ سکتا تھا، جاتا رہا ۔

اب سے تیرہ چودہ سال پہلے کا بالکل سچا قصہ ہے کہ حیدرآباد کی راج دھانی میں پھر ایک بار طاعون کا راج ہو رہا تھا، مرگھٹوں اور قبرستانوں میں چوبیسوں گھنٹے "رونق" رہتی تھی، آنے جانے اور مُردوں کو گاڑنے اور جلانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا البتہ سیکڑوں یا ہزاروں کا مجمع کسی مُردے کے ساتھ نہیں ہوتا تھا صرف چار پانچ آدمی رہتے تھے جو محبت، انسانیت یا لالچ سے مُردے کی آخری خدمت بجا لاتے تھے ۔ شہر کے اکثر محلّے ویران تھے، لوگ شہر سے باہر جھونپڑیوں میں پناہ ڈھونڈھ رہے تھے ۔ مسلمانوں کے خاص محلّوں میں البتہ چند خاندان اسی حکم کی اطاعت میں کہ "وبا سے ڈر کر بھاگنا منع ہے" اپنے طاعون زدہ محلّوں سے نہیں نکل رہے تھے ۔ ان میں سے ایک کو سمجھایا گیا کہ مذہب انسان کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے اگر مذہبی احکام میں لچک نہ ہو تو انسان تباہ ہو جائے ! جو ہدایت ایک خاص موقع کے لیے سرتاپا عقل اور مصلحت پر مبنی تھی ہم پر منطبق کی جائے تو خودکشی کا حکم بن جاتی ہے۔ ہمارے رہنما رحمتِ عالم تھے ان کی اور ان کے توسط سے آئی ہوئی ہر ہدایت ہمیشہ

ہمارے فایدے ہی کے لیے ہوسکتی ہے! وہ پھر بھی نہ مانے اور مذہب سے زیادہ اپنی ہٹ پر قائم رہے! جب انھیں منطق کے اصولوں سے سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ خاص اصولوں کو عام کیفیت پر منطبق کرنا اور سیاق عبارت سے علٰحدہ کرکے جُملے کو پیش کرنا یا پس منظر کو نظر انداز کرکے کسی واقعہ پر غور کرنا کج فہمی ہے تو بھی وہ رضامند نہ ہوئے۔ آخر میں ان سے کہا گیا کہ انسان پاپی ہوتا ہے، ہزاروں گناہ کرتا ہے، اللہ مہربان ہے، لاکھوں گُناہوں کو بخشنے والا ہے کیا وہ آپ کے اسُ "گناہ" کو نہیں بخشے گا؟ آپ اپنی خاطر نہیں تو اپنے بیوی بچوں اور بہو بیٹی کی خاطر اس خطرناک محلّے سے نکل چلئے....

تیسرے روز وہ مرچکے تھے اور ان کا اکلوتا جوان بیٹا بھی اسی مرض میں مبتلا تھا اور چند روز بعد وہ بھی اپنے بیوی بچّوں کو چھوڑکر چل بسا! آج بیوہ عورتوں اور یتیم بچیوں کا سہارا حکومت کے جبری بیمے کی بدولت حاصل ہونے والی آمدنی اور حکومت کے وظیفے ہیں، جو سراسر رعایتی اور بہت ہی کم ہیں۔ مسلمان گھرانوں کی یہ تنہا مثال نہیں ہے، سیکڑوں نہیں ہزاروں گھرانے مذہب زدگی اور جہالت میں مبتلا ہوکر فنا ہوگئے اور لاکھوں افراد قبل از وقت موت کا شکار ہوئے۔ ان کی موت فطری موت نہیں تھی، بلکہ ملک الموت کی خدمت میں جہالت کا نذرانہ تھا۔ ان کی موت خودکشی تھی، ایک تارک الدنیا یا آدم بیزار یا رنجور و بیمار انسان کی قابلِ معافی خودکشی نہیں بلکہ جہالت اور رعونت میں مبتلا بہکے ہوئے آدمی کی قابلِ نفرت خودکشی!!

ایسے ہی لوگ مرض کا شکار اور مرض کے پھیلانے کا ذریعہ ہوتے ہیں! ان میں سے اکثر کاہلی اور بےحسی کو چھپانے کے لیے یہ تاویل کرتے ہیں کہ "موت اٹل ہے، موت کا وقت اٹل ہے، جس کی جو موت ہوتی ہے، وہی موت انسان مرتا ہے!" گویا شہادت سے لے کر پھانسی تک موت کی جتنی قسمیں ہیں سب معینہ اور مقررہ ہیں جس میں رتی برابر فرق نہیں آسکتا! جسے حرام موت مرنا ہے وہ حرام موت مرے گا، جسے ہیضہ اور چیچک یا حادثے یا سولی سے مرنا ہے وہ اسی طرح مرے گا۔ ہندستان میں

کروڑ ہا لوگ یہ اور اسی قسم کے گمراہ کرنے والے خیالات رکھتے ہیں جس کی وجہ سے دباؤں کے پھیلنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس عقلِ سلیم اور علمی نقطۂ نظر سے وہی موت اٹل تصور کی جاتی ہے جو انسانی کوششوں اور تدبیروں کے باوجود واقع ہو یا جسے ٹالنے کی کوئی تدبیر ہمارے زمانے کے لوگوں کو نامعلوم ہو۔

اگر کھیل کود میں کوئی شخص اتفاق سے اس بُری طرح چوٹ کھائے کہ مرہم پٹی کے باوجود وہ مر جائے تو بے شک موت اٹل ہے؛ اگر بڑھاپے میں کوئی شخص بظاہر معمولی بیماری میں چل بسے تو بے شک موت اٹل ہے؛ اگر شہر کو معقول معیار پر صاف رکھنے اور خاص کر کھانے پینے کی چیزوں کی صفائی کا حتی المقدور عمدہ انتظام کرنے کے باوجود چند لوگ میعادی بخار میں مبتلا ہو کر مر جائیں تو بھی موت اٹل معلوم ہوتی ہے، مگر یہ ماننے کے لیے میں ہرگز تیار نہیں کہ سیاسی مجرموں کی سولی اٹل ہے، حکومتی بدانتظامی سے قحط سے بھوکوں مرنے والوں کی موت اٹل ہے، بے روزگاری سے تنگ آکر خودکشی کرنے والے نوجوانوں کی موت اٹل ہو سکتی ہے! دنیا میں رہنے کی آرزو رکھنے والے شخص کا بے روزگاری کی وجہ سے تنگ آکر خودکشی کرنا یا فاقے کرتے کرتے نڈھال ہو کر مر جانا فطری موت نہیں بلکہ بے سولی کی سزائے موت ہے!

ہندستانی اپنی برائیوں اور کمزوریوں کو چھپانے کے لیے دو وجوہ بار بار اور بڑی شدت سے پیش کرتے ہیں: ایک تو سیاسی مجبوری اور دوسرے افلاس۔ چنانچہ متعدد بیماریوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "ہندستان مفلس ہے، وہ دباؤں کو کیونکر دُور کر سکتا ہے؟" اس میں شک نہیں کہ خاندانوں یا محدود جماعتوں کی حد تک افلاس کا عذر صحیح ہے مگر عام طور پر ہر وبا اور اس کے اثرات کو افلاس کا نتیجہ قرار دینا سراسر دھاندلی اور بہانہ بازی ہے۔ افلاس اور بیماریوں یا مفلسی اور دباؤں میں جو قریبی بندھن ہے اس سے میں انکار نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس کے لازم و ملزوم ہونے یا دباؤں کو زیادہ تر افلاس کے سر تھوپنے کا مخالف ہوں۔

بڑے بڑے امیروں، جاگیرداروں، عہدہ داروں، سیٹھ ساہوکاروں، زمین داروں اور سرمایہ داروں کے گھروں میں جتنی گندگی ہوتی ہے وہ تو "افلاس" کا نتیجہ نہیں ہوسکتی؟ جہاں دس پندرہ جھونپڑیاں پڑ جاتی ہیں، یا شہر کے نواح میں جہاں غریب لوگ اپنے کچے پکے مکان بنالیتے ہیں وہاں غلاظت کو دفن کرنے کے لیے کیا افلاس مانع ہے؟ کوڑا کرکٹ اور گندگی کو دفن کردینے کے لیے کیا چاہیے! کدال اور پھاوڑا! کیا غریبوں کے پاس یہ بھی نہیں ہوتا! اصل چیز ان کی لاپرواہی اور کاہلی ہے جو امیروں اور غریبوں، تعلیم یافتہ لوگوں اور انپڑھوں سب میں پائی جاتی ہے۔ غریبوں کے لیے غلاظت کئی صورتوں میں بہانا ہے اور آدھی سے زیادہ غلاظت محض تھوڑی سی محنت اور اہتمام سے دور کی جاسکتی ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ ہر غریب واڑہ غلیظ واڑہ بن کر جراثیم کی پرورش گاہ بن جائے۔ اگر غریب خود کچھ نہیں کرسکتے تو محلّہ کے امیر لوگ یا کھاتے پیتے گھرانے کے لوگ تو صفائی پر پیسہ خرچ کرکے جراثیم کو فنا کرنے میں مدد دے سکتے ہیں!

چند سال قبل ایک دیسی ریاست کے وزیر اعظم کی چہیتی بیوی کا انتقال طاعون میں ہوا تھا۔ لوگوں کو حیرت ہوئی تھی کہ اتنے بڑے گھرانے میں ایسی بری موت! یہ معلوم کرکے اور بھی حیرت ہوئی تھی کہ جس گھر میں لاکھوں کے زیور اور ہزاروں کی روزآنہ آمدنی تھی، اسی گھر کی کچی اور کھلی موریاں گندگی کا بدترین نمونہ تھیں۔ مودی خانہ بالکل معمولی تھا جہاں چوہے آسانی سے پل سکتے تھے۔ صفائی کا معیار اتنا پست تھا کہ اس کو صفائی سے تعبیر کرنا صفائی کے لفظ کی توہین کرتا تھا۔ ان کا محل سارے محلّے کے لیے خطرے کا باعث بنا ہوا تھا۔ جب شہر میں وبا پھیلی تو لازماً یہ گھر بھی متاثر ہوا۔ چوہے مرنے لگے۔ گھر کے ملازموں کا نمبر آیا۔ چہیتی بیوی کی خادمہ اور ان کے باغیچہ میں کام کرنے والی مالن طاعون میں مبتلا ہوکر دنیا سے سدھاریں مگر گھر کی حکمرانی کرنے والی کو سوائے گنڈے تعویذ کرانے کے اس وقت بھی صفائی کا

خیال نہ ہوا ۔ آخر کار وہ خود اپنی جہالت کا شکار ہوئی ۔ جس ملک کی چھپنی ملکہ اس قدر تاریکی میں مبتلا ہوگی ، اس ملک میں بھی بیماریوں اور وباؤں کا راج نہ ہوگا تو اور کہاں ہوگا؟

دُکھی بھارت یا سداکاروگی ہندستان

دوسرا حصّہ

چند عبرت انگیز حالات

کوڑھ یا جذام

کوڑھ میں مبتلا افراد : ۱۴،۰۰،۰۰۰

ہندستان میں کوڑھ میں مبتلا لوگوں کی تعداد چودہ یا پندرہ لاکھ ہے جنھیں کھلے بندوں پھرنے کی ہمارے غلام ملک میں آزادی ہے ! نہ صرف گھومنے پھرنے کی آزادی بلکہ شادی بیاہ کی آزادی بھی اور ایسی معصوم ہستیوں کو دنیا میں لانے کی آزادی جن کی زندگی خود ان کے لیے وبالِ جان ہوگی ! اگر ہم اپنے ملک سے وباؤں کو دور کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے لازمی ہوگا کہ خطرناک اور گھناؤنی بیماریوں میں مبتلا لوگوں کو صحتِ عامّہ کا دائمی خطرہ بنے رہنے نہ دیں اور وہ تمام طریقے اور تدبیریں اختیار کریں جن کی بدولت ترقی پذیر یورپ نے ان وباؤں کو دور یا محدود کیا۔

چودہ پندرہ لاکھ جذامیوں کے لیے سارے ملک میں گنتی کے چند دواخانے ہیں جو زیادہ تر عیسائی تبلیغی انجمنوں کے قائم کردہ اور انھیں کی محنت و توجہ سے چل رہے ہیں۔

عیسائی تبلیغی انجمنوں کا یہ کارِ خیر ہر طرح قابلِ قدر اور قابلِ تعریف ہے ۔ اسی قسم کا ایک دواخانہ حیدرآباد ریاست کے ڈچ پلی نامی قصبے میں قائم ہے جسے ریاست کی طرف سے مالی امداد بھی دی جاتی ہے ۔ وہاں کے ڈاکٹروں سے یہ معلوم ہوا تھا کہ کئی مریض بہت قبل از وقت بھاگ جاتے ہیں اور چونکہ جبری علاج کا کوئی قانون نہیں لہذا بہت سے مریضوں پر ان کی محنت و توجہ رائیگاں جاتی ہے ۔

تمام سنجیدہ لوگوں کا فرض ہے کہ وہ تمدنی قانون سازی کے مسئلہ پر غور کریں اور یہ تصفیہ کریں کہ قانون نافذ کئے بغیر اور ان پر سختی سے عمل کروائے بغیر کیا صدیوں کی بیماریاں دُور ہوسکتی ہیں ؟ کیا بیماریوں کی روک تھام کئے بغیر اور خاص کر یقینی معذور پیدا ہونے والوں کی تعداد کو کم کئے بغیر گداگری کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے ؟

اندھے

اندھوں کی تعداد :

ہمارے ملک میں اندھوں کی تعداد کا اندازہ بیس لاکھ کے قریب ہے اور سب دکھیوں کی طرح ان کا بھی پرسانِ حال کوئی نہیں ۔ چند سال قبل بنگال میں "اندھے پن کی انسدادی انجمن" قائم ہوئی ہے جو اندھوں کی دنیا میں امید کی روشنی پیدا کرنا چاہتی ہے اور اس مقصد میں کچھ کچھ کامیاب ہو رہی ہے ۔

اس ممتاز انجمن کی طرف سے سالانہ روداد یں اور معلوماتی رسالے شایع ہوئے ہیں اس میں بار بار واضح کیا گیا ہے کہ ساٹھ فی صد اندھا پن قابلِ انسداد ہے یعنے جو لوگ اندھے ہیں یا غفلت ، جہالت اور بغیر علاج کی وجہ سے آئندہ یقینی اندھے ہوں گے ان میں ساٹھ فی صد کی آنکھوں کی روشنی بچائی جاسکتی ہے ۔

اندھے پن کی وجہیں بیان کرتے ہوئے گندی جنسی بیماریوں کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اکثر مرد آوارگی اور بد چلنی کی وجہ سے کسی نہ کسی گندی جنسی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور

اپنی نفسانیت سے مغلوب ہو کر اپنی بیوی سے بھی ملتے ہیں بلکہ بعض تو شادی بھی کرتے ہیں ۔ اس کی وجہ سے اولاد میں جنسی بیماریوں کا اثر رہتا ہے اور اکثر ان اثرات کا شکار ہوتے ہیں ۔ ان میں سے بہتیرے مرض زدہ بچے اندھے ہو جاتے ہیں ۔ اندھے پن کی روک تھام کے لیے علاج کے علاوہ قانون کے ذریعے جنسی بیماریوں میں مبتلا لوگوں کی خانگی زندگی ، خاص کر ازدواجی زندگی اور خواہشِ اولاد پر پابندیاں عاید کرنا پڑیں گی ۔ اگر ہم گذشتہ صدیوں کی طرح وجدانیت میں مبتلا رہیں اور کوڑھیوں یا گندی جنسی بیماریوں میں مبتلا لوگوں کی خواہشِ اولاد کا احترام کریں تو مستقبل میں بھی ہماری وہی دشواریاں رہیں گی جو گذشتہ زمانوں میں تھیں اور اب بھی ہیں ۔

ہماری قوم مرفہ الحال کبھی نہیں ہو سکے گی اگر وہ قابل انسداد افلاس کو جڑ سے اکھیڑنے کی کوشش نہ کرے اور قابلِ انسداد افلاس کو جڑ سے اکھیڑنے کے لیے لازمی ہے کہ تمام مہلک اور خطرناک بیماریوں میں مبتلا لا علاج لوگوں کو مرض زدہ اولاد پیدا کرنے سے محروم کر دیا جائے اور شر انگیز بیماریوں میں مبتلا لوگوں کو محدود علاقوں میں رہنے پر مجبور کیا جائے تاکہ وہ باصحت انسانوں کے لیے خطرہ کا باعث نہ بن سکیں ۔ تا وقتیکہ ہم اس قسم کی تدبیریں اختیار نہیں کریں گے بھیک منگوں کی تعداد کم نہیں ہو سکے گی ، سڑکوں اور شاہراہوں پر گھناؤنی بیماریوں میں مبتلا ، خاص کر کوڑھی اور ننگ جھڑے نظر آئیں گے اور ہر سال لاکھوں مدقوق ، جذامی یا اور کسی طرح معذور ، یا اندھے بچے پیدا ہوتے رہیں گے جو زندگی بھر بھگتے اور ہمارے وجدانیت زدہ ہیچ تمدن کی تشہیر کرتے رہینگے ۔

ہمارے بعض رہنما بیماروں اور بیماریوں کے وجود سے انکار یا دونوں کے وجوہ سے چشم پوشی کرتے ہیں اور اپنے دل و دماغ کو بھول بھلیوں میں ڈالنے کے لیے وقت بے وقت اپنے تمدن کی بڑائی کرتے ہیں اس سے ان کا مقصد ، شہرت اور پروپگنڈا ، تو حاصل ہو جاتا ہے مگر مصیبت زدہ ہندستان کے دکھیوں کی نہ تو تعداد کم ہوتی ہے اور نہ درد کم ہوتا ہے ۔ علم مرفہ الحالی کی حیثیت سے عمرانیات کا یہ فرض ہے کہ وہ حقایق کا

پتہ چلائے اور اس کا انکشاف کرے اور اس ناگوار فرض کی انجام دہی میں جو کچھ بھی اعتراض اور طعنے سننا پڑیں ان کے لیے پہلے ہی سے تیار رہے۔ تمدنی علوم کی خدمت کرنے والوں کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگوں کو تمدن کی اصلیت سے واقف کرائیں تاکہ وہ اپنی تہذیب و شائستگی کی تباہ کن برائیوں سے واقف ہوکر اصلاح کی خواہش کریں اور رفتہ رفتہ ایسی جماعت بنا سکیں جو اصلاح کا بیڑا اٹھائے اور اسے کامیاب بنائے۔ اصلاح کی خواہش کرنے والی ترقی پسند جماعت کے بغیر بڑے سے بڑا رہنما بھی ناکام ہوگا۔ ترقی پسند جماعت کے بنانے میں سب سے بڑا حصہ تمدنی علوم کا ہے اور رہوگا جو سیاست، سماج، نفس، معیشت، مذہب، اخلاق کے باہمی مسئلوں کا تجزیہ کرکے دوسروں کو باخبر اور متنبہ کرتے ہیں!

دِق

دِق سے مرنے والوں کی تعداد ۱۲٬۰۰٬۰۰۰ سالانہ

دِق ایک عالمگیر مرض ہے اور سماجی مرضیات یا عمرانیات کے نقطۂ نظر سے دِق کے تذکرے کی ضرورت نہ ہوتی اگر دِق کے پھیلنے کا کوئی تعلق سماج سے نہ ہوتا یا دِق کی کثرت و شدّت سے ہماری سماجی زندگی کے بعض ناقابلِ انکار حقیقتوں کا پتہ نہ چلتا۔ ہندستان کے لال صلیب نے متعدد پوسٹر شایع کئے ہیں جن میں واضح کیا گیا ہے کہ ہندستان کی سماجی رسمیں دِق کے پھیلانے میں کیا حصہ لیتی ہیں۔ لحاف یا رضائی سے مُنہ ڈھانپ کر سونا، ایک ہی تھالی یا رکابی سے کئی کئی لوگوں کا کھانا، ایک ہی چلم یا حُقّے سے ساری محفل کا مستفید ہونا اور سب سے بڑھ کر شخصی اور گھریلو گندگی! شخصی عادتوں میں بدترین عادت (جو بظاہر سارے مشرق کی امتیازی خصوصیت معلوم ہوتی ہے) جا بجا تھوکنا ہے، خاص کر ریلوے کے ڈبوں، مسافر خانوں، اور ہوٹلوں کے کمروں وغیرہ کو گندا کرنا۔ اپنے گھر کی گندگی ہی کافی بری ہوتی ہے مگر پبلک عمارتوں اور سب کے استفادے کی عام گاہوں کو یا عام سواریوں کو

متاثر کرنا دس گنا رہا ہے کیونکہ نجی مکان کی گندگی سے سب سے زیادہ اور سب سے پہلے خود گندے لوگ یا ان کے متعلقین خطرے میں مبتلا ہوتے ہیں مگر عام گاہوں اور عام سواریوں کو غلیظ یا متاثر کرنے سے غیر لوگ کوفت اور مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں ۔ ہندستان میں بیماریوں کی شدت کو کم کرنا اور وباؤں کو دور کرنا ممکن نہیں جب تک کہ ہماری سماج صحتِ عامّہ کے مفاد کو محسوس کرکے صاف پسند اور صفائی پر عمل پیرا نہ ہو ! بیماریوں کو پھیلانے والی بری عادتیں سرکاری قانون کے بل بوتے دور نہیں ہوسکتیں ! ان عادتوں کو دور کرنے کے لیے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سماج کا غیر تحریری ہما قانون ضروری ہے جو سب پر ہر وقت نگرانی رکھنے والا، بہکنے والوں کو بروقت ٹوکنے والا، خطاکاروں اور قصورواروں کو حقارت سے دیکھ کر موثر سزا دینے والا ہوتا ہے ۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ہندستان میں ہر سال دس بارہ لاکھ افراد دق سے مرتے ہیں اور ہر جگہ جہاں سخت پردے کا رواج لڑکیوں اور عورتوں کو جسمانی ورزش اور کھلی ہوا کی نعمتوں سے محروم رکھ رہا ہے ، خاص کر متوسط حیثیت کے خاندانوں یا غریب گھرانوں میں ، دق کی نسوانی شرح اموات تگنی ہے ۔ اگر ہماری قوم ترقی پذیر اور ترقی پسند ہوجائے تو صرف دق میں مبتلا ہوکر مرنے والوں کی تعداد ہی ہماری سماجی رسموں میں سدھار کروانے کے لیے کافی ہے : خاص کر بچکانی یا نوعمری کی شادیاں ، یا سالانہ حمل یا زچگیاں ، بلند معیارِ آرام سے غفلت اور پردہ لاکھوں کی توانائی اور جانداری کو سلب کرکے ان کے جسموں کو پیلی موت کی پرورش گاہ بنا دیتے ہیں ۔

ایمان داری اور غیر جانب داری سے ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مشرقی سماج کی طرح مغربی سماج کی برائیاں دق کے مرض کو پھیلاتی ہیں ۔ یورپ کی عورتوں اور لڑکیوں میں سگریٹ دھوانے کی بری عادت اتنی ہی عام ہے جیسے ہمارے ہاں مردوں میں ۔ ایسی مثالیں بھی کسی طرح کم نہیں کہ عورتیں ایک ہی دن میں چالیس پچاس سگریٹ دھونک دیتی ہوں ۔ شاہراہوں پر یا سینماؤں اور رستوران یا کیفے وغیرہ میں یا عام محفلوں اور عوامی

سواریوں میں سگریٹ پینا مغربی تمدن میں عورتوں اور لڑکیوں کے لیے عیب نہیں رہا۔ اسی کے ساتھ شراب نوشی اور عیش پسندی خاص کر بڑی رات گذرے تک دھویں دار کمروں میں ناچتے رہنا دق میں مبتلا کرنے والے یا دق کے قریب تر پہنچانے والے مغربی تمدن کے ذریعے ہیں!

اگر "سدھار" کے معنے مشرقی برائیوں کی بجائے مغربی برائیاں قبول کرنا ہے، اگر اصلاح سے مشرقی تمدن کو مغربی تمدن سے بدلا جانے والا ہے تو ہمیں ایسی تجدید سے دور ہی رہنا چاہیے! اگر تمدن کو قبل از وقت یا تکلیف دہ موت کا باعث بنناہی ہے تو وہ تمدن ہمارا ہی ہو تو کیا برا ہے۔ فرض غرض سے ایک اور بری چیز اختیار کرکے آخر کار وہی موت مرنا کہاں کی عقلمندی ہے!

قحط اور قحط کی سنجوگی بیماریاں

بنگال کے موجودہ مہا قحط نے پھر ایک بار دنیا کو ہندستان کے دائمی خطرے کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا اور مصیبت زدہ ہندستان کی دکھ بھری کہانی مختلف محفلوں مجلسوں اور حکومتی اداروں میں سنائی جارہی ہے اور چار و ناچار ان لوگوں کو بھی سننا پڑرہی ہے جو نسلی رعونت، سائنسی گھمنڈ، مذہبی غرور اور اعلےٰ انتظامی قابلیت کی بدہوشی میں یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ترقی پذیر یورپ نے ہندستان کے گوناگوں مسئلوں کو حل کردیا۔ خاص طور پر سائنسی گھمنڈ سے سرشار ہوکر کہا جاتا تھا کہ ریلوں کی ایجاد اور رواج نے قحط کو ملک بدر کردیا۔ کروڑوں درسی کتابوں کے ذریعے نئی روشنی کی برکتیں گنائی جاتی تھیں اور ہر سبق میں ریلوں کا ذکر اور قحطوں کے خاتمے کا بیان ہوتا تھا۔ بے شمار سرکاری روئدادوں، تذکروں اور سرکاری محفلوں میں اس خیال کا پرچار کیا جاتا تھا اور سرکار پسند مباحثوں میں بار بار یہی دہرایا جاتا تھا اور یہ تک کہا گیا تھا کہ یہ لوگ احسان فراموش ہیں؛ یورپ کی نیکیوں سے فایدہ اٹھا رہے ہیں مگر

مانتے نہیں ہیں ۔ یورپ کی گوری نسلوں نے بقیہ تمام نسلوں کو مہذب اور شائستہ بنانے کا اخلاقی بار اُٹھایا ہے اور خاص کر اپنے زیر اثر علاقوں کے رہنے والوں کو خوش حال بھی بنا رہی ہیں ۔ یہی کیا کم بات ہے کہ محض ریلوں اور دخانی جہازوں کی وجہ سے بھوکوں مرنا محال ہے ۔ بیسیوں نام نہاد محققوں نے اپنے تحقیقی اور تفتیشی مقالوں اور مضمونوں میں انھی باتوں کو بار بار اور نئے نئے پیرایوں سے موقع بے موقع دہرایا ہے اور ایسے بھی کئی عالم تھے اور ہیں جنھیں علم و واقفیت کے باوجود یا بے تحقیق کئے یہ کہتے یا لکھتے شرم نہ آئی کہ زرین عہد کی تیز رو سواریوں نے قحط کو نابود کر دیا ہے !

جب عالموں اور محققوں کا یہ رویہ ہو تو پھر غریب مس مےیو کی کیا شکایت اگر اس نے لکھ دیا کہ

"ریلوں کے وجود کا ایک اثر یقیناً یہ ہوا کہ ہندستان[ل] سے قحط کا خطرہ مٹا دیا گیا"۔	One Effect of the existence of the railroads has certainly been to to wipe out the terror of famine in India

اس جملے کو لکھے ہوئے پندرہ سال بیت گئے اور اس دوران میں بھی ہر سال ملک کے کسی نہ کسی حصے میں انتہائی گرانی ہوتی رہی ، ہر دوسرے تیسرے برس کسی نہ کسی علاقہ میں قحط پڑتا رہا ، لوگ اور ان کے مویشی بھوک سے تڑپ تڑپ کے مرتے رہے مگر

ل ۔ جرمنی میں ریلوں کی طرف سے ایک خصوصی رسالہ شایع ہوتا ہے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس رسالے میں ہندستانی ریلوں پر ایک طویل مضمون ۱۹۲۶ء میں شایع ہوا تھا ۔ اس مضمون میں بھی اسی قسم کے بے بنیاد دعوے کئے گئے تھے ۔ پروپگنڈا علم اور تحقیق کو بھی مسخر کرتا ہے ! ورنہ جرمنوں کو کیا پڑی تھی کہ وہ انگریزوں کے گیت گاتے ۔ اصل یہ ہے کہ وہ خود نسلی رعونت اور مسلسل پروپگنڈے کا شکار ہوئے ہیں رسالے کا نام Archiv fur Eisenbahn wesen ۔

حکومتی حلقوں میں (ان سے زیادہ حکومت پسند اور حکومت پرست محفلوں میں) ان ناگوار باتوں کو بالکل نظرانداز کیا جاتا رہا ۔ البتہ کبھی کبھی سرکاری افراد یا اداروں نے خانگی یا نیم سرکاری طور پر اعتراف بھی کیا تھا کہ قحط کی وجہ سے شدید مصیبت پڑ رہی ہے اور جانوں کا نقصان بھی ہو رہا ہے ۔ حکومت سے وابستہ اخباروں اور رسالوں میں بھی اس قسم کی خبریں شایع ہو جاتی تھیں اور گاہے ماہے اخباروں کے اڈیٹر اڈیٹوریل لکھ کر اپنا قومی اور اخلاقی فرض ادا کر کے برس چھ مہینے کے لیے "منصبی فرائض سے سبکدوش" ہو جاتے تھے ۔

آخرکار گذشتہ زمانوں کی بدترین مصیبتوں کی طرح پھر ایک بار بنگال کا مہا قحط شروع ہوا ، پھر ایک بار ہندستان کے لیے دنیا میں بھیک مانگی گئی ، متعدد نیک اور وجدانیت زدہ افراد اور جماعتوں کی طرح امیر اور غریب قوموں نے قحط زدہ ہندستان کی مدد کی ۔ آئرستان اور چین ، امریکہ اور آسٹریلیا ، سعودی عرب اور نیپال سے خیراتی اور مصلحتی چندے وصول ہوئے ۔ ان چندوں کی فہرست میں سعودی عرب ، چین اور آسٹریلیا کے نام دیکھ کر اچنبھا ہوتا ہے کہ جو لوگ خود ہماری طرح کنگال ہیں اور ہماری طرح مصیبتوں میں مبتلا ہیں ، احسان جتانے کے لیے چندے دیتے ہیں یا بزرواژی سرمایہ داروں کی طرح جنھیں لوٹتے ہیں ان کی امداد کی خاطر چندے بھی دیتے ہیں مغربی آسٹریلیا کی طرف سے بنگال کے آسٹریلیائی گورنر کیسے صاحب کو بنگال قحط فنڈ کے لیے ایک ہزار پاؤنڈ بھیجے گئے ۔ چین کا ایک بڑا صوبہ قحط زدہ ہونے کے باوجود چینی حکومت نے ہندستان کی امداد میں لاکھ سوا لاکھ خرچ کیا[1] ۔ جس وقت ہندستان کو یہ امداد بھیجی گئی چین کے بین اقوامی امدادی کمیشن کے معتمد نے ایک اخباری بیان میں کہا تھا کہ

> "اس صوبے کے دس لاکھ آدمی قحط اور اس کی سنجوگی بیماریوں
> سے مر چکے ہیں اور ہمیں ایک بدتر مستقبل کا مقابلہ کرنا ہے ۔"

---

[1] اخباری اعلانوں میں اختلاف تھا ۔ بعض نے ایک بعض نے سوا لاکھ لکھا تھا ۔

قحط زدہ بنگال کے علاوہ ہندستان کے اور بھی حصے قحط میں مبتلا ہوئے، اور خاص کر آسام اور مالابار سے تشویش ناک اطلاعیں پہنچتی رہیں۔ اور ان کا چرچا دنیا بھر میں ہونے لگا۔ عالمگیر اطلاعوں کے بعد انگلستان کی مرکزی حکومت کو اور سدائے مداح حکومتی اخباروں کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ ہندستان میں قحط پڑا ہے۔ شرما شرمی سے بعض اخباروں نے مصیبت زدہ افراد اور گھرانوں کی تصویریں بھی چھاپیں اور ان کے بارے میں اداریے بھی لکھے اور سرکاری طور پر اعتراف کیا گیا کہ قحط کی وجہ سے موتیں ہو رہی ہیں۔

قحط کی وجہ سے لوگ صرف بھوکوں نہیں مرتے بلکہ قحط زدہ آبادی فاقے کرتے کرتے چونکہ نڈھال ہو جاتی ہے اور صریحی ناکافی اور گھٹیا قسم کی غذا کھانے پر مجبور ہوتی ہے اس لیے بہت سے لوگ معمولی معمولی بیماریوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے مرجاتے ہیں۔ انگلستان کی مرکزی حکومت کے وزیرِ ہندستان نے سرکاری بیان میں اعتراف کیا ہے کہ

> "۱۶ر اگست ۴۳ سے ۱۱ر دسمبر تک کلکتہ کے ہسپتالوں میں ۱۶،۲۸۵ ادھ موے داخل ہوئے جن میں سے ۶،۱۳۶ مر گئے۔ ان کے علاوہ ۱ر اگست ۴۳ سے ۱۱ر دسمبر ۴۳ تک پولیس یا غیر سرکاری انجمنوں کی طرف سے نپٹائی ہوئی لاشوں کی تعداد ۹،۲۱۶ تھی جن میں ممکن ہے ایسی موتیں بھی شامل ہوں جو بھوک کی وجہ سے نہیں ہوئیں"۔

اسی بیان میں وزیرِ ہند نے یہ بھی اعتراف کیا کہ

> "۲۷ر جون ۴۳ اور ۱۳ر نومبر ۴۳ کے درمیان بنگال میں ہیضے کی وجہ سے ۷۷،۹۳۸ موتیں ہوئیں"۔

ان اعداد کا خلاصہ یہ ہے کہ گذشتہ مہینوں میں کلکتہ کے ہسپتالوں میں روزانہ ۵۲ افراد مر رہے تھے اور اس کے علاوہ کلکتہ کی شاہراہوں یا گلی کوچوں پر پائی جانے والی لاشوں کی روزانہ اوسط تعداد ۶۹ تھی گویا بنگال کے موجودہ مہا قحط میں (سرکاری بیان کے بموجب) صرف صوبے کی راج دھانی میں روزانہ ۱۲۱ افراد بیسویں صدی کی تنظیم اور "قحط کو ناممکن بنانے والی ریلوں" کے ہوتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتے رہے اور ایسی بے موت مرے کہ پرانے زمانوں کے بدقسمت افراد کی یاد تازہ ہوگئی!

سارے صوبے میں یا بقیہ ہندستان میں قحط اور بھوک سے کتنی جانیں ضایع گئیں یا جا رہی ہیں اس کا علم جنگ کے برسوں بعد تک کسی کو نہیں ہو سکے گا اور اس وقت بھی نہ معلوم تمام اطلاعیں یکجا کی جا کر شایع بھی کی جاتی ہیں یا ہر حکومت کانٹ چھانٹ کر کے مرکزی حکومت کو بھی ٹھیک طور پر باخبر نہیں کرتی! موجودہ زمانے کی قحط اور اس کی سنجوگی بیماریوں کی شدت اور وسعت کا صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

نوکھالی ضلع کے انگریز کمشنر نے ایک دربار کے موقع پر کہا کہ

"ضلع کی چالیس ہزار سالانہ اموات کے مقابلے میں گذشتہ
سال (۱۹۴۳ء میں) ستر ہزار موتیں ہوئیں"

کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ انسانیات کے صدر پروفیسر چٹو پدھیا نے آٹھ ضلعوں کی سروے کے بعد اندازہ کیا ہے کہ

"قحط سے کم و بیش دو تہائی تعداد متاثر ہوئی ہے اور
ہر سال معمولاً واقع ہونی والی موتوں کے علاوہ اندازاً تیس
پینتیس لاکھ موتیں ہوئی ہوں گی"

ان ہی کا خیال ہے کہ عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی شرح بہت زیادہ تھی، کہیں دونی اور کہیں اس سے بھی زیادہ۔ پروفیسر چٹو پدھیا نے صحیح لکھا ہے کہ زیادہ مردوں کے مرنے کی وجہ سے کماؤ لوگوں کا رہا سہا رابھی جاتا رہا اور کنبے کے کنبے بے وارث ہو گئے

جس کی وجہ سے کئی سماجی بُرائیاں نمودار ہوئیں۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں انسان فروشی اور بیسواپن ہے۔

سارے بنگال کی بابت وزیر ہند نے برطانوی پارلیمنٹ میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا ہے کہ

"۱۹۴۳ء کے آخری پانچ مہینوں میں قحط اور ریا اس کی سنجوگی بیماریوں سے مرنے والوں کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ نہیں۔"

ہفتوں بعد وزیر ہند نے پارلیمنٹ ہی میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ

"۶،۸۹،۰۰۰ افراد حالیہ قحط میں مرے"

غرض سرکاری، نیم سرکاری اور خلاف سرکاری بیانوں اور اطلاعوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم یہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ قحط اور اس کی لازمی خرابیوں کی وجہ سے صوبہ بنگال میں بیس بائیس لاکھ افراد ہلاک ہوچکے ہیں اور موجودہ زمانے کی قحط کی شدت اور وسعت کا صحیح اندازہ جنگ کے بعد ہی ہو سکے گا مگر اس وقت تک حالات بہتر ہو چکے ہوں گے، قحط کی روداد پڑھنے کی کسی کو کیا غرض ہوگی اور عوام کی بہتر حالت سے فایدہ اٹھاکر ریلوں کی عالم آشکار ابرکتوں کا پھر ذکر ہوا کرے گا: درسی کتابوں میں، علمی مضمونوں میں، تحقیقی مقالوں میں، سرکاری رودادوں میں اور سب سے زیادہ صاحب سے زیادہ صاحبیت پر فریفتہ ہندستانی حلقوں میں!

یم دیوتا کے چرنوں پر بھارت ماتا کی بھینٹ
یعنی
ملک الموت کی خدمت میں ہندستان کا نذرانہ

۱۹۴۱ کے گناوے کی سرکاری روداد میں دی ہوئی شرح کے مطابق اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر سال ہندستان میں ہیضے، چیچک اور طاعون جیسے قابلِ انسداد بیماریوں میں مبتلا ہوکر مرنے والوں کی

تعداد تقریباً چھ لاکھ سالانہ ہے۔

عمرانیات کی رائج کردہ اصطلاحوں میں سے ایک اصطلاح Preventable deatbs (قابلِ انسداد موت) ہے۔ یہ اصطلاح علمی اور تحقیقی حلقوں کے علاوہ اچھے پڑھے لکھے حلقوں میں بھی استعمال کی جانے لگی ہے۔ ہر جاندار کو ایک نہ ایک روز مرنا ہے۔ پھر "قابلِ انسداد موت" کے کیا معنے؟ اس کے معنے ایسی بیماریوں میں مبتلا ہو کر اور یا ایسی وجہوں سے مرنا ہے جنھیں انسانی عقل، تدبیر اور دریافت کردہ طریق کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہیضہ، چیچک، طاعون جیسی بیماریاں یا فاقے، قحط سب اسی نوعیت کی وجہیں ہیں۔ جب سے مغرب میں تہذیب کا پرچم لہرانے لگا ہے قحطوں اور وباؤں کی عملداری صرف مشرق تک محدود ہو گئی ہے اور انھوں نے خاص کر چین اور ہندستان میں بسیرا کیا ہے۔

گذشتہ سو ڈیڑھ سو سال میں جتنے قحط واقع ہوئے اور جتنی مرتبہ وبائیں پھیلیں، اور ان میں مبتلا ہو ہو کر جتنے لوگ فنا ہو گئے، اس سے حساب لگایا گیا ہے کہ ہمارے ملک میں ہر سال دس لاکھ قابلِ انسداد موتیں ہوتی ہیں۔ یہ تعداد گویا فرشتۂ موت پر ہندستان کی طرف سے انسانوں کی قربانی ہے۔ "اشرف المخلوقات" کے لیے کیسی قابلِ فخر قربانی!

یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ یہ اندازہ بالکل بے بنیاد نہیں میں صرف ہیضے سے واقع ہونے والی موتوں کا معتبر حوالہ دیتا ہوں۔ ۱۹۴۱ کے گناوے کی سرکاری روئداد کے مطابق ۱۹۲۰ سے ۱۹۳۹ کی دو دہائیوں میں چالیس لاکھ افراد صرف ہیضے کی وجہ سے قبل از وقت موت کا شکار ہوئے۔ انھیں موت نہیں آئی تھی، انھیں ہندستان کے راج اور سماج نے مارا تھا۔

سرکاری اعداد کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر سید محمود نے اکتوبر ۴۴ کے ایک اخباری بیان میں کہا ہے کہ ۱۹۴۴ کے جنوری سے جولائی تک دو لاکھ افراد ہیضے میں مبتلا ہو کر مر چکے اور ان دنوں بہار وبائی مصیبت میں گرفتار ہے۔ کیا وہ زمانہ جلد آنے والا ہے جب ہندستان بھی یورپ اور امریکہ کے ترقی پذیر ملکوں کی طرح گھناؤنی بیماریوں اور قابلِ نفرت وباؤں سے محفوظ رہے گا؟

ایرانی تہذیب
اور
اسلامی ملکوں پر اسکے اثرات

از

جناب ابونصر محمد خالدی صاحب ام ۔ اے (عثمانیہ)

ہمیں معلوم ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی و تمدنی زندگی کے اس دور میں بھی جب کہ اسلامی دُنیا کی ادبی زبان عربی اور صرف عربی تھی ایرانی ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے لیکن یہ بات اب تک پوری طور پر واضح نہیں ہوسکی کہ ایرانیوں کی یہ سرگرمیاں کس حد تک زمانۂ قبل اسلام کے ساسانی دور سے وابستہ تھیں۔ قدیم بابل کی سرزمین کو چھوڑکر، جہاں ساسانی دارالسلطنت واقع تھا مگر جہاں کی آبادی کی زبان ایرانی یا فارسی نہ تھی، باقی اور تمام ساسانی صوبوں کا اثر اسلام کے مذہب، اس کی سیاسیات اور اُس کے علوم پر اتنا گہرا نہیں پڑا، جتنا کہ مثلاً بلخ کے شہر کا پڑا، جو ساسانی حدود کے باہر تھا، اور جہاں عربی فتوحات کے وقت بُدھ مذہب کے پیروؤں کا دور دورہ تھا۔ خلفاء بغداد کے مشہور زمان وزرا یعنی برامکہ بلخ ہی کے رہنے والے تھے۔

صرف برامکہ ہی نہیں بل کہ ان کے علاوہ بلخ میں بہت سے ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے
مسلمانوں کی تاریخِ علم و ادب میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔ ایرانی تمدن کی تاریخ کے لیئے
بلخ و بابل کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ دارالسلطنت ایران اور بلخ میں غیر معمولی
بُعدِ مسافت کے باوجود عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ ساسانی دارالسلطنت کی زبان
بلخ کی زبان سے بہت زیادہ مشابہ ہے ۔ غالباً ان لوگوں کا ایسا خیال کرنا صحیح نہیں تھا۔
عربوں کی فتح سے نہ صرف ساسانی مملکت کا بالکل خاتمہ ہوگیا بل کہ زمانۂ قبلِ اسلام
میں وہاں جو مذہب اور ذات بندی نظام رائج تھا اس کو بھی ختم کر دیا گیا۔ زردشتی
مذہب کے ماننے والوں کی کچھ نہ کچھ تعداد وہاں آج تک موجود ہے ۔ یہ لوگ گبر یا
پارسی کہلاتے ہیں لیکن اسلام کے زیرِ اثر توحید کا خیال قدیم عقیدوں پر پوری طرح
غالب آچکا تھا۔ اس لیئے اگر چہ زردشتی مذہب کی رُو سے باپ بیٹی، ماں بیٹے اور
بھائی بہن میں نکاح ہو سکتا تھا لیکن مدت دراز سے پارسیوں میں یہ رواج باقی نہیں
رہا۔ زردشتیوں میں باپ بیٹی وغیرہ کے نکاح کا جواز ایک مسلمہ حقیقت ہے لیکن اس کے
باوصف نہ صرف قرونِ وسطیٰ میں بل کہ آج کل بھی زردشتی اس بات کو ثابت کرنے کی
بار بار کوشش کرتے رہتے ہیں کہ نہ صرف اب بل کہ زمانۂ قبلِ اسلام میں بھی اس قسم کے
قبیح عقیدوں کا ان میں وجود تھا اور نہ اس قسم کے شادی بیاہ کا۔ اس طرح کی
حُبِّ وطنی نے ، بیشتر تو مسلمہ حقیقتوں کے خلاف ، زمانۂ قبلِ اسلام کی ایرانی زندگی کے
دوسرے شعبوں کو بھی متاثر کیا ہے مثلاً ساسانی دربار کی شان و شوکت، شہنشاہ
کی قوت و عظمت ، حکمرانوں اور وزیروں کی عقل و فراست ، ملک کی تمدنی حالت وغیرہ۔
چناں چہ اسلامی دَور کے تمام تمدنی کارناموں کا رشتہ خواہ یہ تمدنی کام بلخ ہی میں
انجام پائے ہوں کسی نہ کسی طرح ساسانی حکومت کے فسانوں سے جوڑنے کی کوشش
میں عجیب و غریب شجرہ ہائے نسب گھڑ لیئے گئے ہیں ۔
یورپی عالموں کا پہلے یہ خیال تھا کہ ایرانی قومیت کی نشاۃ ثانیہ ایران میں

موروثی حکمران خاندانوں کے قیام کا راست نتیجہ تھا اس لیے کہ یہ حکمران خاندان خلافتِ بغداد سے عملاً ہر طرح آزاد تھے ۔ اس نظریہ میں یہ خیال کار فرما تھا کہ چوں کہ ان خاندانوں نے اپنے اپنے مقبوضہ ملکوں کو بغداد اور خلیفہ سے بُعد و بیگانگی پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی اس لیئے اس حد تک نہ صرف ایرانی ۔ بل کہ ترکی خاندانوں نے بھی ایرانی قومیت کو ترقی دینے میں بڑا حصہ لیا تھا ۔ اس تحریک کو محمود غزنوی (۹۹۷ء تا ۱۰۳۰ء) سے شاید اس لیئے منسوب کیا جاتا ہے کہ محمود گو ترک تھا لیکن غزنہ (افغانستان) اس کا دربار فارسی کے بہترین شاعروں کا ملجا و ماویٰ بن گیا تھا ۔ چنانچہ ان شاعروں میں مشہورِ دوراں رزمیہ نظم شاہ نامہ کا مصنف فردوسی بھی شامل تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن حالات نے قدیم نظام کو کمزور کرنے میں مدد دے کر ایران میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی تھی، وہ بہت زیادہ پیچیدہ تھے ۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جب ایرانی امیروں ـــــ دہقان ـــ کو سرکاری ملازمتیں مل گئیں اور بہت سے زمینداروں کے معاشری و معاشی حقوق بھی محفوظ ہو گئے تو پھر اس جماعت نے ان فائدوں کے پیشِ نظر اپنی قدیم سیاسی اہمیت کے نقصان کو گوارا کرلیا ۔ جیسا کہ کچھ زمانہ بعد یورپ کے جاگیری امیروں نے کیا ۔ خود عربوں کے لیئے ساسانی دور کا ایران ایک منظم مملکت کا بہترین نمونہ تھا ۔ اس لیئے ان کا خیال تھا کہ اگر ایسے ادارے قائم کیئے جائیں جیسے کہ ایران میں موجود تھے تو اس سے اسلام اور مسلمانوں کی قوت مضبوط ہو جائے گی ۔ چناں چہ خلفاءِ عباسیہ کے ایرانی وزیر و امیر پورے خلوص سے اپنے آپ کو راسخ العقیدہ مسلمان اور خلفاء کی وفادار رعایا سمجھتے تھے ۔ گو شیعیت کے لیئے ایران کی فضا ساز گار تھی لیکن اس کو وہاں جو کامیابی حاصل ہوئی وہ قومی احساس کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے اتنی نہیں ہوئی جتنی کہ مخالفت کا ایک عنصر ہونے کی وجہ سے۔

قُم کی آبادی کا ایک کثیر حصہ عربوں پر مشتمل تھا لیکن اس کے باوجود یہ شہر بہت جلد شیعوں کی مذہبی سرگرمی کا ایک مرکز بن گیا آج بھی وہاں یہی حالت ہے ۔

۱۹۱۸ء ۔ مشترکہ مقصد حاصل کرنے کے لیئے ابتدا میں دہقان عوام کے ساتھ متحد ہو گئے تھے۔ عوام کے ساتھ مل کر دہقانوں نے شیعی سردار ابومسلم خراسانی کے ماتحت آخری اموی خلیفہ سے جنگ کی لیکن اپنا متوقع مقصد حاصل ہوتے ہی ان سب لوگوں نے اپنی اپنی مصلحتوں کے مطابق حسب سابق اپنے طبقے علیحدہ علیحدہ قائم کر لیئے ۔ ابومسلم مارا گیا اور اس کے ساتھی حکومت سے بغاوت کرتے رہے ۔ دہقانوں میں برامکہ جیسے جو سربرآوردہ لوگ تھے برابر خلفاء عباسیہ کی خدمت بجالاتے رہے تاآن کہ ہارون الرشید کی حکومت کے آخری زمانہ میں مذہبی اور سیاسی ردِّعمل شروع ہوا ۔ برامکہ اسی ردِّعمل کے شکار ہوئے ۔ غالباً ان رجعت پسندانہ تدبیروں اور اُس مخالفت کی وجہ سے جو بعد میں شروع ہوئی ۔ ہارون الرشید کے بیٹوں امین و مامون میں سیاسی اقتدار کے لیئے کشمکش ہوئی ۔ مامون نے شیعیت کا جھنڈا بلند کیا تھا لیکن بغداد میں داخل ہوتے ہی اس نے سبز رنگ ترک کر کے بنی عباس کا سرکاری سیاہ رنگ پھر اختیار کر لیا ۔ مامون نے یہ فیصلہ عربوں کے زیرِ اثر نہیں کیا بل کی اس کی تحریک خاندانِ طاہریہ کے بانی ایران نژاد طاہر نے کی تھی جس طرح سابق میں برمکیوں نے کیا تھا اسی طرح خاندانِ طاہریہ نے اسلام اور عربوں کے مفاد کے لیئے ان ملکوں کو فتح کرنے میں عملی حصہ لیا جو بحیرۂ خزر کے جنوب میں واقع تھے ۔ یہ ایسے ملک تھے جو ساسانی شہنشاہیت کے زمانے میں بھی نہ صرف آزادی بل کہ اپنی زندگی کے مخصوص طور طریق کو ایرانی اثر سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے تھے ۔ یہاں بھی عوام نے زردشتی مذہب ترک کر کے شیعی مذہب قبول کر لیا ۔ ان ملکوں میں شیعیت کی اشاعت کا جاگیری نظام اور بڑے بڑے زمینداروں کی بربادی سے خاص تعلق رہا ہے ۔ خلافت اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کے خلاف کشمکش شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ساتھ زمیندارانہ شورشیں بھی برپا ہوئیں ۔ یورپ کی طرح یہاں بھی حکمرانوں نے عوام کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی، اور زمینوں پر کام کرنے والوں کو زمینداروں کے خلاف اُکسایا، کیوں کہ زمینداروں کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ عربوں کے حامی ہیں ۔

حضری زندگی کی ترقی اور نئے تمدنی مرکزوں کی تشکیل سے صورتِ حال اور زیادہ پیچیدہ ہوگئی۔ نویں اور دسویں صدی عیسوی کے ایرانی شہروں میں ہمیں اصفہان کے متعلق سب سے زیادہ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اسی شہر کے رہنے والے دو جغرافیہ نویسوں کی بدولت ہم کو شہر اور اس کے ماحول کے متعلق نہایت تفصیلی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہاں ہم کو وہ سب رجحانات یکجا ملتے ہیں جو اس دور کے تمام اہم مرکزوں میں موجود تھے۔

دسویں صدی عیسوی کے عرب محبِ وطن اور قوم پسند ابو الفرج الاصفہانی مصنف کتاب الاغانی کا مسقط الراس اصفہان ہی تھا۔ فارسی رزمیہ نظم کو جن آٹھ ادیبوں نے عربی میں منتقل کیا تھا ان میں سے تین شعراء کا وطن بھی اصفہان تھا۔ اصفہان کے چند علاقوں میں بعض مضافات میں تقریباً سب کے سب دہقان آباد تھے۔ حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہقان گو عملاً اس وقت سے ہر لحاظ سے کسان بن گئے تھے مگر بوستان کے شلاختوں کی طرح ان کو ہمیشہ اپنی شرافت نسب کا خاص خیال رہتا تھا۔ یہ سیدھے سادے گنواروں کو حقیر سمجھتے تھے اور شادی بیاہ صرف اپنی ہی برادری میں کرتے تھے۔ اصفہان کے دوسرے مضافات میں آبادی بیچ میل تھی البتہ ادنیٰ طبقہ کے افراد کی ان میں کثرت تھی اس مقام پر اُس اشتمالی فرقہ کے اصول مقبول ہوئے جو ساسانی عہد میں ظاہر ہوا تھا لیکن اسلامی دور میں اس کی تجدید ایک نئے مقام سے کی گئی تھی۔

جو طبقہ علم و ادب کی خدمت میں مصروف تھا وہ پوری طرح کسی ایک فریق کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ حکمران طبقہ انھیں میں سے تھا یا ان کا ساتھ دیتے دالانقا اسلئے عوام کے علاوہ یہ حکمرانوں سے بھی دوستانہ طرزِ عمل رکھتے تھے کیوں کہ یہ نہ صرف عربوں اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کے مخالف تھے بل کہ ایرانی قومیت کا احساس رکھنے کے علاوہ شعوبیت اور ملحدانہ خیالات سے بھی رواداری برتتے تھے۔ اس کے برخلاف تمدنی اور طبقہ واری اغراض ان کو زمیندارانہ تصور کی حمایت اور معاشری رجعت پسندی سے ہمدردی کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ اس طرح ایران کی تمدنی نشاۃ ثانیہ انتہائی پیچیدہ حالات

میں ہوئی اور اب تک اس موضوع کی پوری طرح عالمانہ تحقیق سے وضاحت نہیں ہوئی۔ عربی حروفِ تہجی صرف تمام مسلمانوں ہی نے نہیں بل کہ کچھ مدت بعد حضرت زردشت کے پیروؤں نے بھی اختیار کر لیے۔ اب ایک نئی فارسی زبان وجود میں آئی جس میں قدرتاً بہت سے عربی الفاظ شامل تھے۔

قدیم فارسی کتابوں کو، جن میں مقدس کتابیں بھی شامل تھیں، بڑی مشکل سے پڑھا جانے لگا۔ اور جیسا کہ یورپی عالموں نے ثابت کیا ہے ان کے پڑھنے میں بہت سی غلطیاں بھی کی گئیں۔ نئی فارسی زبان نے عرب قبل اسلام کی بعض مروجہ بحروں سے بھی کام لیا لیکن یہ بحریں نہ صرف عربی ناموں ہی سے موسوم کی گئیں بل کہ ان کا استعمال بھی عربی عروض کے مطابق ہوا۔ ایرانیوں نے اپنی شاعری کی ابتداء کے متعلق بھی کوئی مستند روایت محفوظ نہیں رکھی۔ عباس نامی کسی شاعر نے جب خلیفہ مامون مرو داخل ہوا تو اس موقع پر اس کے روبرو چند مدحیہ شعر پڑھے تھے۔ چنان چہ اکثر ان ہی شعروں کو نئی فارسی زبان کے اولین اشعار کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ حال آں کہ اس دعویٰ کی بنیاد صرف اتنی ہے کہ شاعر نے اپنے شعروں میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ فارسی زبان میں اس سے پہلے کسی نے شعر نہیں کہے تھے۔ ان شعروں میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ بہت پرشکوہ ہونے کے علاوہ بعد کی ترقی یافتہ زبان سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ غرض مضمون اور زبان دونوں اعتبار سے ان شعروں کی اصلیت میں بڑا شبہہ ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ عباس نامی ایک شاعر ضرور گزرا ہے۔ نویں صدی عیسوی کا جغرافیہ نویس ابن خرداذبہ جس نے اپنی کتاب عربی میں لکھی ہے، عباس بن طرفان کے فارسی شعر بھی نقل کیے ہیں۔ یہ عباس بن طرفان غالباً وہی شخص ہے جس کا ذکر ابھی ہوا۔ ان شعروں میں فارسی کے بہت سے قدیم الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ نیز شہر سمرقند و شاش (تاشقند) کی تاریخ کے بعض ایسے واقعات کی طرف تلمیحات ہیں جن سے ہم بالکل ناواقف ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان شعروں کا مصنف وسطِ ایشیا کا باشندہ تھا اس عہد میں

ایرانی دنیا کے ایک دوسرے سرے پر ارمی جھیل کے کنارے محمد بن بیاس جو دو قلعوں کا مالک تھا، عربی و فارسی میں شاعری کیا کرتا تھا۔ اس کے فارسی شعر ہم تک نہیں پہنچے اور نہ فارسی ادب کے کسی مورخ نے اس کے شعر نقل کیے لیکن امام طبری، جنھوں نے اپنی تمام کتابیں عربی میں لکھی ہیں، بیان کرتے ہیں کہ محمد بن بیاس کو اپنے وطن میں کافی مقبولیت حاصل تھی۔ اس شاعر کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ مامون کے خلافت کے آخری زمانے میں اس نے آذربیجان میں مسلمانوں اور عربوں کے خلاف ایک شورش میں حصہ لیا تھا۔ جو بیس سال بعد فرد ہوئی لیکن اس دوران میں شورش کے فرد ہونے سے بہت قبل محمد بن بیاس عربوں کی مخالفت ترک کر کے خود ان کی حمایت کرنے لگا تھا لیکن پھر ایک مرتبہ اس نے خلیفہ کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا۔

سب سے پہلے طاہریہ (۸۲۱ء تا ۸۷۳ء) نے ایرانی الاصل اسلامی خاندان کی بنیاد رکھی تھی۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی ادب کے مخالف تھے اس لیے کہ ان کے خیال کے مطابق فارسی ادب اور خالص اسلامی اصولوں میں کوئی مناسبت نہیں تھی۔ لیکن آل طاہر نہ صرف اپنے ہی علاقہ خراسان میں بل کہ دوسرے علاقوں میں مثلاً مصر میں دبل کہ خود بغداد میں بھی جہاں خلیفہ کے سامرہ میں اٹھ جانے کے بعد، فوجی قوت بہت بڑی حد تک خاندانِ طاہریہ کے ایک فرد کے ہاتھ میں آگئی تھی، امن و امان قائم کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے ان سے عام تمدنی ترقی اور ضمناً ایرانی تمدن کی ترقی میں بڑی مدد ملی ہوگی۔ ان کے زمانہ میں مرو کی بجائے نیشاپور، خراسان کا صدر مقام اور سب سے بڑا تمدنی مرکز بن گیا۔ اس کے مغرب میں بیہق کا علاقہ تھا جس کا ایک شہر سبزوار ہے۔ یہ مقام شیعی دعوت کا ایک خاص مرکز تھا۔ نویں صدی عیسوی کی ابتدا سے اسلامی دنیا کے بہت سے عالم و ادیب اسی خاک سے اٹھے تھے۔ نیشاپور کے مشرق میں طوس تھا۔ اس کے نواح میں شیعی امام علی رضا (متوفی ۸۱۸ء) کا مزار تھا۔ بعد میں اس مرکزی حصہ پر شہرِ مشہد آباد ہوا اور یہی اس وقت خراسان کا سب سے اہم شہر ہے۔

فارسی شاعری کا احیا سب سے زیادہ خاندان سامانیہ (۸۷۴ء تا ۹۹۹ء) کا

مرہونِ منت ہے ۔ ایک مختصر وقفہ کے بعد آل طاہر کے بعد آلِ سامان کو نہ صرف خراسان میں اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو چکا تھا بلکہ وہ ترکستان کے اس حصہ پر بھی مسلط ہو چکے تھے جسے مسلمانوں نے فتح کیا تھا۔ اب سامانیوں کا دارالسلطنت بخارا بھی بہت سے عالموں اور شاعروں کا مرکز بن رہا تھا۔ دسویں صدی عیسوی میں جو ملک اس خاندان کے زیر اقتدار آئے تھے ان کے متعلق خیال تھا کہ وہاں کی حکومت سب سے زیادہ اچھی ہے ۔ سامانی بلخ کے رہنے والے تھے اور ایرانی نسل سے تھے ۔ آلِ سامان کے اکثر حکمرانوں کے زمانے میں سرکاری زبان فارسی تھی لیکن یہ چیز ان کو عربی زبان میں لکھنے والے عالموں اور عرب ادیبوں کی سرپرستی کرنے میں مانع نہیں ہوئی۔ دسویں صدی عیسوی کے پانچویں دہے میں یہاں کی حکومت شیعی دعوت کے اثر میں آگئی لیکن اس مختصر سے وقفہ کے علاوہ شروع سے آخر تک سامانی فرمان روا سُنّی مذہب کے پیرو اور حمایتی رہے۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ آلِ سامان کے لیئے عربی میں ایک رسالہ بطرز سوال وجواب لکھا گیا تھا۔ پھر اس کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا تاکہ عوام الناس کو ملحدانہ تعلیم کے دھوکہ میں آنے سے روکا جا سکے۔

مشہور مورخ امام طبری نے قرآن کی جو تفسیر لکھی تھی وہ سامانیوں کے لیئے فارسی میں منتقل کی گئی اور فارسی میں بھی اس غرض سے ایک مستقل تفسیر لکھی گئی ۔ عربی کی طرح فارسی زبان کو بھی مذہبی مضامین کے اظہار کا ذریعہ بنانے کے لیئے مذہبی پیشواؤں کے خاص فتووں کی ضرورت تھی بعض عالموں نے تو یہاں تک دعویٰ کر دیا کہ عربوں کے جد اعلیٰ حضرت اسماعیلؑ سے پہلے اکثر پیغمبر فارسی بولتے تھے ۔ یہاں تک کہ بارھویں صدی عیسوی میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جن کا خیال تھا کہ خود حضرت ابراہیمؑ نے ایرانی شہنشاہوں کے دربار میں اپنی تعلیمات فارسی زبان میں پیش کی تھی ـــ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو فارسی گو شاعر سامانیوں کی مدح سرائی کرتے تھے وہ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے حد درجہ فاسق و فاجر تھے سمرقند کے رہنے والے شاعر رُودکی کو کسی زمانے میں بڑی مقبولیت حاصل تھی لیکن اب تو یہ گمنامی میں پڑا ہوا ہے۔ اس کا شعر ہے کہ :

روئے بمحراب نہادن چہ سود دل بہ بخارا و بُتان طراز
ایزد ما وسوسۂ عاشقی از تو پذیرد نپذیرد نماز

یہی شاعر کھلے بندوں شیعی خلفا دینی فاطمہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے ۔ یہی نہیں بل کہ زمین و آسمان کے متعلق اس کا تصور وہی ہے جو مشرکوں کا تھا یعنی زمین و آسمان انسان کے ماں و باپ ہیں ۔ اپنے ایک ہم عصر کی موت پر رودکی کہتا ہے : ۔

جان گرامی بہ پدر باز داد کالبد تیرہ بہ مادر سپرد

دقیقی نے سب سے پہلے ایرانی قوم کے رزمیہ فسانوں کو نظم کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ۔ یہ شاعر کہتا ہے اور برملا کہتا ہے : ۔

دقیقی چہار خصلت دوست دارد بگیتی از ہمہ خوبی و زشتی
لب یاقوت رنگ و نالۂ چنگ شراب لعل و کیش زردشتی

اسی دسویں صدی عیسوی میں خلافت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بحیرہ خزر کے جنوبی کنارے کے جنگ جو حکمرانوں نے ایران کے زیادہ متمدن علاقوں پر حملہ کرنا شروع کر دیا ۔ اس تحریک کے بعض علم بردار کھلم کھلا کہتے تھے کہ ان کا مقصد خلافت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر ساسانی حکومت دوبارہ قائم کرنا ہے ۔ چناں چہ بحیرہ خزر کے ایک حکمران خاندان آل بویہ نے اپنا مقصد حاصل کرنے میں ایک حد تک کامیابی بھی حاصل کر لی ۔ اس خاندان نے بغداد پر قبضہ کر کے خلیفہ کو دنیوی اقتدار سے محروم کر دیا ۔ اب ان کے سکوں پر زمانہ قبل اسلام کے ایرانی حکمرانوں کا لقب شہنشاہ مضروب ہونے لگا ۔ آل بویہ کی سلطنت کسی ایک حکمران کے ماتحت نہیں تھی ۔ اس خاندان کے مختلف افراد نے مفتوحہ علاقوں کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا اس لیے اقتدار اعلیٰ خاندان کی ایک شاخ سے دوسری شاخ میں منتقل ہوتا رہتا تھا ۔ ان کا کوئی مستقل دار السلطنت بھی نہیں تھا سب سے زیادہ طاقت ور حکمران جس شہر میں رہتا وہی اس وقت دار السلطنت بن جاتا تھا ۔ تقسیم اقتدار کے اس نظام کی خرابیوں کے باوجود آل بویہ نے شہری زندگی کی نشو و نما اور تمدنی مراکز کو ترقی دینے میں بھی حصہ لیا ۔ ہر حکمران کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ جس شہر پر اس کا قبضہ ہے وہی سب سے زیادہ ترقی کرے ۔ اس لیے وہ علما و شعرا کو اپنے دربار سے وابستہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے ۔ اب رفتہ رفتہ تمدنی سرگرمی کے مراکز بغداد و بصرہ سے منتقل

ہو کر، طہران کے جنوب مغرب میں رہے، اصفہان اور شیراز جیسے بڑے بڑے ایرانی شہروں
میں منتقل ہو رہے تھے۔ ان شہروں میں آلِ بویہ نے بہت سی کتابیں جمع کر کے بڑے بڑے
کتب خانے جمع کر دیئے تھے۔ عام علم و ادب کے علاوہ یہ امراء علوم صحیحہ کی سرپرستی بھی
کرتے تھے۔ چنان چہ ایک رصدگاہ کا حال پڑھنے میں آتا ہے جو ان کی سرپرستی میں
بمقام شیراز تعمیر ہوئی تھی۔ یہاں جو آلات مہیا کیئے گئے تھے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ
زمانۂ قبل اسلام کے مقابلہ میں اب علم ہیئت کی تحقیقات کی طرف اہم قدم اُٹھایا گیا
تھا۔ آل بویہ کا ایک وزیر عالموں اور ادیبوں کو جمع کرنے کے لیئے مختلف دن مقرر
کیا کرتا تھا۔ چنان چہ ایک دن فقیہوں کے لیئے مقرر تھا، ایک دن ادیبوں کے لیئے
مخصوص تھا، ایک دن عقیدوں پر بحث مباحثہ کا تھا اور ایک دن فلسفہ کے لیئے
مخصوص تھا۔

چوں کہ بحیرہ خزر کے کنارے اپنے اصل وطن سے آل بویہ اپنے ساتھ کوئی
علمی و ادبی روایات نہیں لائے تھے، اس لیئے ان کو عربی ادب کے اثرات پوری
طرح قبول کرنے پڑے اور انھوں نے فارسی ادب سے بھی کوئی اعتنا نہیں کیا۔ یہ جن
شاعروں کی سرپرستی کرتے تھے ان میں سے کسی فارسی گو شاعر کو شہرت عام کا خلعت نہیں
ملا۔ درآں حالیکہ اس زمانے میں سامانیوں اور غزنویوں کے دربار میں فارسی شاعری
برسرِ عروج تھی۔ غزنویوں کے دربار میں فارسی شاعری کی سرپرستی اس لیے بھی کی جاتی
تھی کہ مغربی ایرانی صوبوں میں غزنوی سلاطین سامانیوں کے ہر طرح جانشین تھے۔
صوبہ خراسان کے مشہور شہر طوس نے فردوسی جیسا شاعر پیدا کیا۔ تاریخی ترتیب کے اعتبار
سے فردوسی پہلا فارسی شاعر ہے جس کی شہرت آج تک برابر باقی ہے۔

فردوسی نے شاہ نامہ میں افسانوی دَور سے لے کر اسلامی فتح تک کی تمام ایرانی
رزمیہ داستانوں کو جمع کر دیا ہے۔ جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں فردوسی سے پہلے دسویں
صدی عیسوی میں دوسرے "فارسی گو شاعر بھی گزرے ہیں جنھوں نے اس طرف توجہ کی تھی

اور بجائے اصلی ماخذوں کے عربی ترجموں پر اپنی تحقیقات کی بنیاد رکھی تھی ۔ فردوسی کا شاہ نامہ پوری ایرانی قوم کا قومی سرمایہ بن گیا ۔ چوں کہ ارمنی چرکسی اور ترکی قومیں بھی ایران کے زیرِ اثر تھیں اس لیئے رزمیہ داستان کی حیثیت سے شاہ نامہ نے ان قوموں کو بھی مسحور کر دیا ۔ دنیا کے ادب میں شاہ نامہ کو جو مرتبہ حاصل ہے اس کی کہیں نظیر نہیں ملتی ۔ اس لیئے کہ تمام دوسری قومیں اس وقت تک عروج حاصل کر چکی ہوتی ہیں جب کہ ان پر رزمیہ داستانیں پڑھنے کی بجائے کتابیں پڑھنے کا شوق غالب رہتا ہے ۔ لیکن صرف ساسانی دور ہی میں نہیں بل کہ اسلام کے ابتدائی زمانے کے ایرانیوں پر بھی کتابیں پڑھنے کے رواج کا زبردست اثر تھا ۔

بہ ایں ہمہ یہ قوم ابھی تک رزمیہ روایات ہی کے دور سے گزر رہی تھی ۔ اسلامی عہد میں تمدنی زندگی کو غیر معمولی ترقی ہو چکی تھی اور فوجی طبقہ پر زوال آ چکا تھا ۔ اس کے باوصف شاہ نامہ کی تقلید میں بہت سی مثنویاں لکھی گئیں ۔ بیسویں صدی عیسوی تک کے ہر دور کے بادشاہوں کی مدح و ستایش فردوسی کی طرز ادا میں ہوتی رہی ۔ ان میں بھی زندگی کا وہی فقدان نظر آتا ہے جو یورپ میں نام نہاد جعلی کلاسکی دور کے رزمیہ نظموں کی خصوصیت ہے ۔ البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ فارسی شعراء ایک ایسے شاعر کی تقلید کرتے تھے جو اُن ہی کی قوم کا ایک فرد تھا ۔ لیکن یورپی مقلدین کو یہ بات بھی حاصل نہ تھی ۔

فردوسی کی زندگی میں ان نتیجوں کے متعلق پیش قیاسی کرنا ممکن نہیں تھا جو کتابی علم کی وجہ سے پیدا ہونے والے تھے قرون وسطیٰ کے یورپ کی طرح ایشیا میں بھی رزمیہ داستان کی سب سے بڑے مخالف مذہبی پیشوا تھے ، کیوں کہ وہ کسی طرح یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ بے دین اکابر کی اتنی تعریف و توصیف کی جائے ۔ اس شاعر اعظم کی شہرت کو مٹانے میں یہ جماعت کامیاب نہیں ہوئی تاہم اس کی وجہ سے فردوسی کو بہت رنج اُٹھا کر مایوسی کے عالم میں دنیا سے کنارہ کش ہونا پڑا ۔ فردوسی اپنا شاہ نامہ لیکر سلطان محمود غزنوی کے دربار میں پہنچا ۔ حال آں کہ محمود کی تخت نشینی سے بہت پہلے ہی اس نے اپنا کام ختم کر لیا تھا ۔

چوں کہ سلطان دیندار لوگوں کے زیر اثر تھا اور خود بھی اپنے آپ کو اسلام کا حامی و مددگار سمجھتا تھا اس لیئے اس نے شاعر کی تمنائیں پوری نہیں کیں۔ مایوسی کے عالم میں فردوسی نے سلطان کی ایک زبردست ہجو لکھی۔ شاعری کے اعتبار سے یہ ہجو شاہ نامہ کے مصنف کے شایانِ شان تھی۔ اب وہ دوسرے بادشاہوں کے دربار میں پناہ ڈھونڈنے نکلا لیکن کسی نے اس کا خیر مقدم نہیں کیا۔ ہر چند کہ آل بویہ کو ساسانی روایتوں کے حامی ہونے کا دعویٰ تھا لیکن انھوں نے بھی فردوسی کی سرپرستی نہیں کی۔ بہت تکلیفیں اٹھانے کے بعد آل بویہ کے ایک حکمران کے دربار میں فردوسی نے یوسف و زلیخا کی مشہور مثنوی لکھی۔ اس مثنوی کی تمہید میں شاعر نے، جو اب بہت بوڑھا ہو چکا تھا، اپنے پہلے کام کی مذمت کی ہے اور پھر اپنے آپ کو سخت ملامت کرتا ہے کہ اس نے بے دین ابطال کو بڑھانے اور ان کے خیالی کارنامے بیان کرنے میں اپنی عمر عزیز رائگاں کی کیوں کہ ان کی قیمت ایک مشت خاک سے زیادہ نہیں۔ آخر کار مجبور و مایوس ہو کر شاعر پھر اپنے وطن طوس واپس آیا۔ اس وقت تک وہاں کے حکمران فردوسی کو بھول چکے تھے لیکن دیندار لوگوں کے دلوں سے وہ اب بھی محو نہیں ہوا تھا۔ ان لوگوں نے آخر تک اس کو معاف نہیں کیا اور مرنے کے بعد اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے نہیں دیا۔[۱]

حاصل کلام یہ کہ دسویں صدی عیسوی میں بل کہ گیارھویں صدی عیسوی کی ابتدا تک بھی فارسی ادب خاص کر ایران کے مشرقی صوبوں میں پورے عروج پر تھا لیکن وہ ایرانی علما جو اپنی کتابیں زیادہ تر عربی زبان میں لکھتے تھے انھیں مغربی صوبوں میں زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ جوں جوں ملک کے مختلف صوبے تمدنی اعتبار سے ایک دوسرے سے زیادہ

---

[۱] بارتولڈ نے جس وقت یہ عبارت لکھی تھی اس وقت تک زیر بحث واقعہ کی تحقیق نہیں ہوئی تھی، لیکن اب یہ اچھی طرح ثابت ہو چکا ہے کہ فردوسی اور محمود کا قصہ بہت کچھ غلط اور بے بنیاد ہے۔ یوسف زلیخا کی مثنوی بھی فردوسی کی نہیں ہے۔

قریب ہوتے گئے رفتہ رفتہ یہ جغرافیائی امتیاز زیادہ نمایاں نہیں رہا۔ اس زمانہ کے عالم زمانۂ حال کے یورپی عالموں کی طرح صرف ایک ہی علم کے مطالعہ وتحقیق میں مصروف نہیں رہتے تھے۔ ایک ہی شخص مختلف علوم میں دست گاہ رکھنے کے علاوہ فرصت کے اوقات میں ادب کی طرف بھی متوجہ ہوسکتا تھا۔ اس قسم کا ایک عالم مشہور زماں ابن سینا ہے جو شاعر بھی تھا۔ ابن سینا بخارا کے کسی گاؤں ۹۸۰ء میں پیدا ہوا اور ہمدان و اصفہان کے بویہی حکمرانوں کے دربار سے وابستہ رہا۔ ہمدان میں اس نے کچھ مدت وزیر کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ابن سینا نے بہت ہی کم عمری میں قرآن حفظ کیا اور مقامی استاد سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بخارا میں جب اسماعیلی دعوت شروع ہوئی تو اس نے فلسفہ اور مابعد الطبعیات سے واقفیت بہم پہنچائی۔ اٹھارہ سال کا تھا کہ بشمول طب قریباً تمام مروجہ علوم سے واقف ہوچکا تھا۔ طب کو وہ تمام علوم سے آسان خیال کیا کرتا تھا حالانکہ اسی علم میں اُسے سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی لیکن سب سے زیادہ مشکل ارسطو کی مابعد الطبعیات کے مطالعہ میں ہوئی۔ ایک روز بازار میں محض اتفاق سے فارابی کا ایک رسالہ تین درہم میں اس کے ہاتھ لگا۔ فارابی کے اسی رسالہ کی مدد سے اس کو ارسطو پر عبور حاصل ہوگیا۔ علم طب کی وجہ سے اس کو سامانی حکمران کے دربار میں رسوخ حاصل ہوا اور پھر شاہی کتب خانہ سے بھی استفادہ کا موقع ملا۔ سامانی حکمران کے اس کتب خانہ سے اس سے پہلے غالباً کسی اور عالم نے استفادہ نہیں کیا تھا۔

گیارھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں غالباً جب سامانی حکومت باقی نہیں رہی اور ملک پر ترکوں نے قبضہ کرلیا تو یہ بخارا سے نکل کر پہلے خوارزم آیا پھر بحیرۂ خزر کے صوبوں اور خراسان اور مغربی ایران میں پھرتا رہا۔ یہاں پھر اپنے علم طب کی وجہ سے اس کو خاندان بویہ کے حکمرانوں سے دوستی پیدا ہوئی۔ اپنے شاگردوں کی مدد سے اس نے جو بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی تھیں ان میں "القانون فی الطب" علم طب پر ایک زبردست تالیف ہے۔ "قانون" کی اصطلاح یورپ میں اسلامی دنیا میں مذہبی قوانین کے لیئے

مروج تھی لیکن اسلام میں دنیوی قانون کے مجموعے کو یہ نام دیا جاتا تھا۔ بازنطیہ کی طرح بعض وقت اس اصطلاح کا اطلاق احصائی کتابوں (مُعْلمہ) پر ہوتا تھا۔ گویا ایسی کتابیں علوم وفنون کے قوانین کا مجموعہ ہوتی تھیں۔ اپنی ایک دوسری کتاب کے لیے بھی اس نے طبّی اصطلاح استعمال کی ہے یعنی کتاب الشفا، لیکن درحقیقت اس میں منطق، طبعیات، مابعدالطبیعات، ہئیت اور دینیات سے بحث کی ہے۔ اصفہان کے بادشاہ کی فرمائش پر اس نے اپنے شاگردوں کی مدد سے فارسی زبان میں مختلف علوم کی ایک احصائی کتاب لکھی۔ اس میں منطق کو سب سے پہلے جگہ دی گئی ہے۔ منطق کے بعد علوم شریفہ (مابعدالطبیعات اور دینیات) اور آخر میں علوم رذیلہ (علوم طبعیہ) سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد اُن علوم سے بحث کی ہے جو "علوم اربعہ" کہلاتے ہیں۔ اس حکیم نے جو بہت سی کتابیں لکھی ہیں اُن میں طب پر عربی نظم میں چند رسالے اور تصوف کے رنگ میں کچھ فارسی رباعیات بھی شامل ہیں۔ اپنی عمر کے آخری دنوں میں یہ عربی لسانیات کا مطالعہ کرنے لگا تھا۔ ایسی وسیع علمی و ادبی مصروفیتیں بھی اس کو انتہائی بے لگام زندگی بسر کرنے سے نہ روک سکیں اور ابھی ساٹھ سال کی عمر بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ ۱۰۳۷ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ گو کسی شعبۂ علم میں بھی وہ دوسروں کی خدمات سے بے نیاز نہیں رہا تھا تاہم اپنے دور کے تمام علمی کارناموں پر عبور حاصل کرکے ان کو نہایت دانائی سے فن کارانہ طور پر پیش کرنے کی اس میں غیر معمولی صلاحیت تھی۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کی کتابیں اسلامی دنیا اور بعد کو یورپ میں بہت مقبول ہوئیں۔ سترھویں صدی عیسوی کے ایران میں فلسفے کو جو ایک مرتبہ پھر غلبہ حاصل ہوا اور جو انیسویں صدی عیسوی تک باقی رہا وہ اسی کی تصانیف کا نتیجہ تھا۔ مذہبی گروہ اس کو ناپاک فلسفہ کا خاص حمایتی اور سیدھے سادے عوام الناس اسے ایک جادوگر سمجھتے تھے چناں چہ بزمانہ قرون وسطیٰ یورپ میں ڈاکٹر فاؤ ہٹ کے متعلق بھی ایسا ہی خیال تھا۔

ابن سینا کا ہم عصر ابوریحان بیرونی (۹۷۳ء تا ۱۰۴۸ء) ایک بالکل دوسرے ہی

قسم کا عالم تھا۔ اس میں اور ابن سینا میں بہت سے علمی مسئلوں کے متعلق خط و کتابت ہوتی رہتی تھی جو بعض وقت سخت اختلاف کی حد تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ بیرونی خوارزم میں پیدا ہوا تھا۔ جہاں وہ حکمران کا مشیر بھی ہوگیا تھا۔ اپنی زندگی کے چالیس سے زیادہ سال اس نے یہیں گزارے۔ البتہ اس دوران میں صرف چند سال جرجان (بحیرۂ خزر کے جنوب مشرق میں قدیم ہرکانی کا علاقہ) اور اس مدت کا کچھ عرصہ سفر میں گزرا۔ جہاں تک ہمیں علم ہے اس نے رئے تک سفر کیا تھا۔ بعد کو بیرونی غزنی میں محمود اور اس کے جانشینوں کے زیر سایہ رہنے لگا۔ یہاں سے اس نے ہندوستان کے متعدد سفر کیے۔ افسوس ہے کہ بیرونی جیسے عظیم المرتبت عالم (ان معنوں میں کہ اس نے اپنی کتابیں عربی زبان میں لکھی تھیں) کی کتابوں کی اشاعت کی ٹھیک ٹھیک تاریخ کا ہمیں علم نہ ہو سکا۔ بہر طور ایک ہم عصر یورپی متخصص کے الفاظ میں اس نے علم ہئیت کے قوانین پر "لاثانی" کتاب تالیف کرنے کے علاوہ قوموں کے تاریخی نظام پر ایک احصائی تالیف اور ہندوستان پر ایک کتاب لکھی۔ یہ کتاب نقطہ نظر کی وسعت اور علمی معروضیت کے وصف سے خاص طور ممتاز ہے۔ اس کا خاص موضوع ہندی علوم اور مذاہب ہیں۔ ان کے متعلق بیرونی نے اپنی معلومات اصل سنسکرت ماخذوں سے حاصل کی تھیں۔

بیرونی بغداد و بصرہ دونوں دبستانوں کے عالموں کی کتابوں سے بخوبی واقف تھا لیکن ان کو وہ ازکار رفتہ خیال کرتا تھا۔ نویں صدی عیسوی میں بصرہ کے سب سے زیادہ مقبول عام فلسفی جاحظ کو وہ سادہ لوح سمجھتا ہے۔ خود بیرونی نے ہئیت یا ریاضی میں کوئی اصلاح نہیں کی۔ اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح وہ بھی نجوم پر اعتقاد رکھتا تھا۔ اس کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد سے پہلے ان علوم کے مسلّمہ تصورات میں اصلاح کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئیں تھیں۔ ابوسعید سجزی نے ایک اصطرلاب بنایا تھا جو اس مفروضہ پر مبنی تھا کہ زمین متحرک اور آسمانی گنبد ساکن ہے۔ بیرونی کے زمانہ میں عام طور پر یہ نظریہ صحیح تسلیم کیا جاتا تھا لیکن یہ اس کا پوری طرح

قائل نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ مسئلہ "مشکوک" اور "اس کا حل بہت مشکل ہے"۔ بیرونی کے بہت مدت بعد چودھویں صدی عیسوی کا ایک عرب عالم رازی اس بات پر تعجب کا اظہار کرتا ہے وہ لکھتا ہے :۔ ایسے دور میں نہ معلوم بیرونی کو اس مسئلہ کے صحیح سمجھنے میں کیا دقت پیش آئی جب کہ حرکت زمین کا مفروضہ ابن سینا اور اس کے پیشرو رازی جیسے طبیب اور ہئیت دان نے واضح طور پر ثابت کر دیا تھا۔ رازی کا انتقال ۳۲۰ھ؁ میں ہوا۔

ہمارے زمانے کے عالموں کے لیئے غیر اسلامی عقیدوں خصوصاً ہندی مذاہب کے متعلق بیرونی کی رائے بہت زیادہ دلچسپ ہے۔ بیرونی اس بات کا قائل تھا کہ مذہبی عقیدے ہر جگہ ایک ہی قسم کے نفسیاتی محرکات کے زیر اثر رہتے ہیں۔ عوام الناس اور چند منتخب لوگوں کے عقیدوں میں ہر جگہ نمایاں فرق و امتیاز موجود رہتا ہے۔ بیرونی مذہبی تعلیمات کو بغیر کسی اخلاقی رنگ کے پیش کرتا ہے۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکے ہر مذہب کے متعلق اس کے پیروؤں کے مستند بیان پیش کرتا ہے۔ جب وہ دو مذہبوں کا مقابلہ و موازنہ کرتا ہے تو اس سے اس کا مقصد علمی تقابلی طریقہ اختیار کر کے کسی مذہب کی تعلیمات اور جس اصل اصول پر وہ تعلیمات مبنی ہیں اس کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ اسلامی ادبیات میں دوسرے مذہبوں سے رواداری اور معروضی نقطۂ نظر سے بحث کرنا بیرونی کے زمانہ میں بھی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس لیئے جہاں تک معروضیت کا تعلق ہے اس کی کتابیں کوئی استثنائی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس سے پہلے نویں صدی عیسوی میں یعقوبی نے خالص معروضی نقطۂ نظر سے اپنی تاریخ میں نصرانیوں کی مقدس کتابوں کے مضامین پوری صحت و تفصیل کے ساتھ پیش کیئے ہیں۔ نویں صدی عیسوی کے آخر میں بمقام غزنی فارسی زبان میں کتاب المذاہب کے نام سے ایک کتاب تالیف ہوئی تھی۔ خود بیرونی اپنے استاد ایرانشہری کی کتابوں کی بڑی ستائش کرتا ہے جن میں نصرانیوں، یہودیوں اور مانیوں کے مذاہب سے بحث کی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ ایرانشہری کی کتابیں ہم تک نہیں پہنچیں اور نہ ہمیں ان کے متعلق کچھ مزید معلومات حاصل

ہیں۔ بیرونی کہتا ہے کہ ہندوستانی قوموں کا ذکر کرتے ہوئے ایرانشہری سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں۔ کیوں کہ اس نے ان لوگوں کے بیانوں پر یقین کر لیا تھا جو ہندوستانی مذہبوں سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ اسلامی ادبیات کا جو ذخیرہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں بیرونی کی کتابوں کو ایک استثنائی درجہ حاصل ہے۔ اس لیے کہ ان کتابوں میں علاوہ معلومات کی کثرت کے علمی طریقوں سے پوری طرح بحث کی گئی ہے۔ گو ان کتابوں میں ہم کو بیرونی بعض وقت ایک ایسے پرجوش ایرانی محب وطن کے رنگ میں نظر آتا ہے جو زمانۂ قبل اسلام کے ایرانی تمدن اور عربوں کی فتح کے بعد اس کی تباہی پر آنسو بہاتا ہے۔ مذہبی عقائد کے اعتبار سے بیرونی شیعہ تھا اور بہت سے تعلیم یافتہ ایرانیوں کی طرح مذہب مانی سے ہمدردی رکھتا تھا۔ سیاسیات میں اس نے کوئی اصلاحی تجویز پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی نظر میں حکومت اور مذہب ـــــ چناں چہ غزنوی حکومت کی کوششیں ہمیشہ اسی مدعا کے حصول میں صرف ہوئیں ـــــ یا زمانۂ حال کی اصطلاح میں مملکت اور مذہب میں اتحاد و ہم آہنگی پیدا کرنا کسی سیاسی ادارے کا سب سے اعلیٰ نصب العین ہے اور تمام انسانی آرزوؤں کی آخری حد بھی یہی ہے۔ بیرونی جس قسم کی زبان استعمال کرتا ہے وہ نہایت مشکل و مغلق ہوتی ہے۔ یہی چیز اس کی مقبولیت میں حائل رہی۔ مدت دراز سے علما اس کی کتابوں کی ذاتی خوبیوں کی بنا پر ستائش کرتے آئے ہیں لیکن ان کتابوں کا عامۃ الناس پر زیادہ اثر نہیں پڑا۔ انیسویں صدی عیسوی تک یورپی علما اس کی کتابوں سے لاعلم تھے۔ حالانکہ ایک اندلسی یہودی ابراہیم بن عذرا نے بارھویں صدی عیسوی میں ہیئتی زیچوں سے متعلق اس کی ایک کتاب کا عبرانی میں ترجمہ کر دیا تھا۔ خود بیرونی کہتا ہے کہ اس نے اپنی کتابیں عام قاریوں کے لیے نہیں بل کہ عالموں کے لیے لکھی ہیں۔ گو اس کے علمی کارنامے اتنے مختلف النوع نہیں ہیں جتنے کہ ابن سینا کے۔ بایں ہمہ اس نے بھی فارسی زبان کے چند قصے عربی میں منتقل کیے ہیں بل کہ عربی میں چند شعر بھی کہے ہیں۔ لیکن خود ہی لکھتا ہے کہ اس کی ادبی

تصنیفیں محض تفنن طبع کا نتیجہ ہیں۔

عام طور پر گیارھویں صدی عیسوی کو اسلامی تمدن کی انتہائی ترقی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے ساتھ ہی یہ بھی خیال ہے کہ زوال کی ابتدا بھی اسی عہد سے شروع ہوئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمدنی زندگی کے بہت سے شعبوں میں کم از کم ایران کی حد تک، مزید چند صدیوں تک برابر ترقی ہوتی رہی۔ گیارھویں صدی عیسوی تک اجتماعی زندگی ہر جگہ شہرستان یا قدیم قسم کے شہروں سے ہٹ کر ان مضافات میں منتقل ہوگئی جن کی ترقی اسلامی حکومت کی رہین منت ہے پچھلے صفحوں پر جس قسم کے شہروں کا ذکر ہوا ہے ان کی وضع قطع آخری طور پر اسی دور میں قائم ہوئی۔ بایں ہمہ شہروں کی وسعت اتنی زیادہ نہیں ہوئی جتنی کہ بعد کے زمانہ میں ہوئی۔ گیارھویں صدی عیسوی کا سب سے بڑا شہر اصفہان تھا۔ اس کا دور تقریباً سات مربع میل وسیع تھا۔ اسلامی ایران کی جو قدیم ترین تاریخ کندہ عمارت اس وقت تک باقی ہے وہ ۱۰۰۶ئہ تا ۱۰۰۷ئہ میں بنی تھی۔ یہ عمارت جرجان کے امیر قابوس بن وشمگیر کا مقبرہ ہے۔ اس کی تعمیر گیارھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں ہوئی تھی۔ یہ اس نمونہ کے مطابق تعمیر ہوئی تھی جو بحیرہ خزر کے ساحلی علاقوں اور قفقاز میں کثرت سے رائج تھا۔ بلکہ کلیسا بھی اسی وضع کے بنائے جاتے تھے۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ کثیر الجہت عمارت پر ایک مخروطی مینار کھڑا کیا جاتا تھا۔ عربی زبان میں جو عبارت کندہ ہے اس میں اس کو قصر سے موسوم کیا گیا ہے۔ ایران کے بعض مقاموں مثلاً اصفہان میں اس اصطلاح کا اطلاق ایسی عمارت پر ہوتا ہے جو گورستانوں میں کسی قبر پر بنائی جاتی ہے۔ یہاں کے لوگ آج کل اس عمارت کو گنبد کہتے ہیں پہلی اصطلاح کی بجائے دوسری اصطلاح غالباً اس لیئے چل پڑی کہ اوّل الذکر قسم کی عمارت کی بجائے اب ایسی عمارتیں تعمیر ہونے لگیں جن کے اوپر گنبد ہوتے تھے۔ دوسری قسم کی عمارتوں میں ایک قدیم عمارت مرو میں سلطان سنجر کا مقبرہ ہے جو بارھویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں تعمیر ہوا تھا۔ لیکن اس کا گنبد نکیلا نہیں بلکہ

سپاٹ ہے۔ قابوس کے مقبرہ کی بلندی قریباً اٹھاون گز ہے۔ اس کی نہایت موٹی موٹی دیواریں اینٹ کی بنی ہوئی ہیں جن کا حجم قریباً تین گز ہے۔ بعد کی صدیوں میں دیواروں کی اس زبردست موٹائی کا تصور کرنا بھی مشکل تھا۔ برسبیل اطلاق دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانہ کی عمارتوں میں جو اینٹ استعمال ہوتی تھی وہ بعد کی عمارتوں کی اینٹوں سے بہتر ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں قدیم اینٹوں کی جسامت بھی بہت زیادہ ہوتی تھی۔ البتہ ابتدائی عہد میں اینٹ کا استعمال کم ہوتا تھا۔ اس کے بعد جیسا کہ آج کل یورپ میں ہو رہا ہے کفایت کے خیال سے معمولی قسم کے مسالہ پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔

ایران کے اسلامی فن تعمیر کی ابھی تک کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی۔ اس کی مکمل وضاحت سے پہلے بہت سی تمہیدی تالیفوں کی ضرورت پڑے گی۔ آل بویہ کے عہد میں ایران کی مسجدوں کا عام نمونہ کیا تھا اس کا ہمیں علم نہیں۔ گیارھویں صدی عیسوی کے مشہور ایرانی اہل قلم ناصر خسرو نے لکھا ہے کہ ہر علاقہ کی شیعی مسجدوں میں ایک خاص قسم کی خوب صورتی پائی جاتی ہے۔ لیکن اس سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس سے خسرو کی مراد کس قسم کی مسجدوں سے ہے۔ مختلف صوبہ واری نمونوں کی ترکیب و آمیزش ــــ اگر واقعی کوئی صوبہ واری نمونہ تھا ــــ اور عمومی حیثیت سے تمدنی قدروں کے لین دین پر وسط ایشیا کے سلجوقیوں کے جانشینوں نے کچھ کم اثر نہیں ڈالا ہوگا۔ اس لئے کہ گیارھویں صدی عیسوی میں اس ترک خاندان نے پورا ایران فتح کر ڈالا تھا۔ علاوہ ازیں، گو ایک تھوڑی سی مدت کے لئے سہی، بحیرۂ روم اور بحیرۂ احمر سے لے کر چین کی سرحدوں تک ایشیا کے تمام مسلمان ان کے زیر سیادت متحد ہو گئے تھے۔

دسویں صدی عیسوی کے آخر میں لوگوں کو توقع تھی کہ ایران کے مغربی حصہ پر مشرقی ایران والے یورش کریں گے۔ گو آل بویہ کے بعض فرماں رواؤں نے تمدنی خدمتیں بھی انجام دی تھیں اور وہ علوم و فنون کی سرپرستی بھی کیا کرتے تھے بایں ہمہ ان کو بحیرۂ خزر کے وحشی قبیلوں کا سردار ہی سمجھا جاتا رہا۔ اور ساسانیوں سے موازنہ

کرتے ہوئے ان کو امن و امان اور شائستگی کے تباہ کرنے والا خیال کیا جاتا تھا۔ ہمیشہ یہ خیال لوگوں کے دلوں میں رہا کہ مشرق یعنی خراسان کے سامانی علاقہ میں کوئی ایسا بادشاہ پیدا ہوگا جو "عالم و فلسفی ہوگا" اور وہی مغرب میں امن و امان بحال کرنے میں کامیاب ہوگا۔ یہ اُمیدیں پوری کی پوری تو بر نہیں آئیں کسی عالم بادشاہ کی بجائے خانہ بدوش قبیلہ کا ایک سردار مغرب آیا جو باعتبار تہذیب و شائستگی آل بویہ سے بہت فروتر تھا۔ ایران میں ایک صدی سے زیادہ حکومت کرنے کے بعد بھی سلجوقی ناخواندہ ہی رہے بارھویں صدی عیسوی میں ان کی حکومت کے زوال کے بعد سیاسی قوت بہت سے چھوٹے چھوٹے خاندانوں میں تقسیم ہوگئی۔ یہ خاندان زیادہ تر ترکی نسل سے تھے۔ با ایں ہمہ جب سلجوقیوں نے ایران فتح کیا تو نہ صرف خراسان کے علماء و شعراء کو اپنی جولانیاں دکھانے کا موقع ملا بلکہ سامانی اور غزنوی عہد کے سیاسی روایات کے حامیوں کو اپنی سرگرمیوں کو بروئے عمل لانے کے لیئے وسیع میدان ہاتھ آیا۔ آخرالذکر لوگوں میں ایک نظام الملک طوسی بھی ہے۔ مدت دراز تک (۱۰۶۴ء تا ۱۰۹۲ء) سلجوقیوں کی پوری وسیع سلطنت میں اسی کی شخصیت سب سے زیادہ با اقتدار تھی۔

اسی دور میں تمدنی زندگی اور تجارت و صنعت کو ترقی دینے کے لیئے بہت سے طریقے اختیار کیئے گئے۔ نامکمل عمارتیں مکمل کی گئیں جن میں سے بعض اس وقت تک مغربی ایران میں موجود ہیں۔ نئے شہر بسائے گئے جن کے گرد پختہ اینٹوں کے حصار تعمیر کیئے گئے تھے سلجوقیوں کے دربار میں فارسی شاعروں کی قدرافزائی کی گئی۔ اس قدرافزائی میں سلجوقیوں کے جانشینوں نے اور زیادہ مبالغہ کیا۔ ۱۰۴۵ء عیسوی میں فخرالدین اسعد نے پہلے سلجوقی سلطان کو ایک منظوم عشقیہ داستان ویس ورامین نذر کی۔ یہ مثنوی دراصل پہلوی سے فارسی میں ترجمہ کی گئی تھی۔ اسعد کے زمانہ میں لوگ پہلوی زبان بالکل بھول چکے تھے۔ خود اسعد لکھتا ہے: پہلوی زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کو ہر شخص اچھی طرح نہیں پڑھ سکتا اور اگر کوشش کر کے کچھ پڑھ بھی لے تو اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ بارھویں صدی عیسوی کے

دو شاعر انوری و نظامی کو خود ایرانیوں نے فارسی زبان کے سب سے بڑے شاعروں میں شمار کیا ہے۔ انوری نے زیادہ تر سلطان سنجر کی قصیدہ خوانی کی ہے اور نظامی نے عشقیہ مثنویاں زیادہ لکھی ہیں۔ نظامی قفقاز کے شہر گنجہ میں پیدا ہوا اور انتقال بھی کیا وہیں۔ بعض یورپی عالموں نے نظامی کو فردوسی سے صرف دوسرے درجہ پر رکھا ہے۔ نظامی کی شاعری نے فارسی کے علاوہ ترکی زبان پر بھی زبردست اثر ڈالا ہے۔

سلجوقیوں نے ایران میں سُنیوں کی سیادت قائم کر دی تھی لیکن شیعیت کو ختم کرنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ گیارھویں صدی عیسوی کی ابتدا سے لے کر بارھویں صدی عیسوی تک ایران مذہبی کشمکش کا آماجگاہ بنا رہا۔ اس کشمکش کی ابھی تک کسی نے پوری طرح وضاحت نہیں کی۔ گیارھویں صدی عیسوی کے آخر میں اسماعیلی دعوت نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ اسماعیلیوں نے ایران کے اکثر علاقوں بل کہ شام میں بھی بہت سے فصیل بند قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسماعیلی تحریک نے خالص قومی رنگ اختیار نہیں کیا تھا۔ اس تحریک میں طبقہ واری اغراض کا حصہ زیادہ نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ اب جو جنگ ہو رہی تھی وہ زمینداروں اور کاشت کاروں کے درمیان نہیں تھی، جیسی کہ نویں صدی عیسوی میں ہوئی، بل کہ یہ جنگ شہروں اور فصیل بند قلعوں کے درمیان تھی۔ اسماعیلیوں کو سب سے زیادہ امداد انھیں علاقوں سے ملی جہاں تمدنی زندگی کا ارتقا سب سے کم ہوا تھا خصوصاً خراسان کے جنوب مشرقی علاقہ قوہستان اور قزوین کے شمال میں پہاڑی علاقوں سے ان کو بڑی تقویت پہنچی تھی۔ اسماعیلی قلعوں کی قریباً دو تہائی تعداد صرف قوہستان میں تھی۔ اسی پہاڑی علاقہ میں ان کے پیشوا کا صدر مقام الموت واقع تھا۔ اس جنگ نے فارس اور اصفہان کے مضافاتی علاقوں میں استثنائی طور پر نہایت وحشیانہ رنگ اختیار کیا اس لئے کہ ان مقاموں پر اسلامی حکومت کے زمانہ میں بہت سے قلعوں کے پہلو بہ پہلو کئی نئے شہر آباد ہو گئے تھے۔ اسماعیلی اپنے دشمنوں سے نہ صرف کھلے میدان میں جنگ کرتے تھے بل کہ بہت سے پوشیدہ طریقوں سے بھی انھیں موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ اس فرقہ کے پیشوا کے ماتحت

فدائیوں کی ایک زبردست تنظیم موجود تھی۔ ان کا امام فدائیوں کو ان لوگوں کے قتل کرنے پر مقرر کر دیتا تھا جو پہلے سے نشان زد کر دیئے جاتے تھے۔ امام کو پورا یقین رہتا تھا کہ جو خطرناک کام فدائیوں کے تفویض کیا گیا ہے وہ ضرور انجام پا جائے گا۔ اس فرقہ کے افراد کا جنوں حشیش کے استعمال سے برانگیختہ کیا جاتا تھا۔ یورپی زبانوں میں Assassain کا لفظ حشیشین ہی سے ماخوذ بتایا جاتا ہے۔ اس مفروضے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرون وسطیٰ میں اہل یورپ کو اسماعیلیوں کے نظام نے کتنا مرعوب کر رکھا تھا۔ بہرطور اسماعیلی قلعوں میں نہ صرف پوشیدہ طور پر لوگوں کے قتل کا انتظام کیا جاتا تھا بلکہ اس کے ساتھ ہی کچھ تمدنی کام بھی انجام پاتے تھے۔ الموت کا کتب خانہ اور وہاں کی رصدگاہ کی بڑی شہرت تھی۔ انھیں قلعوں سے بہت سے ایسے عالم ظاہر ہوئے جنھوں نے بعد کو ایران پر منگولی حکومت کے زمانہ میں اہم خدمات انجام دیں مثلاً ایک نصیر الدین طوسی ہے۔ اس نے فلسفہ، ہئیت، ریاضی اور شیعی دینیات پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں یا مثلاً ہمدان کے طبیبوں کا یہودی خاندان ہے۔ مشہور مورخ رشید الدین بھی ہمدان کا رہنے والا تھا۔

ہرچند کہ اسماعیلی کسی مسلسل و مربوط علاقہ پر قبضہ نہ کر سکے بایں ہمہ ان کی سیاسی اہمیت ناقابل انکار تھی۔ پہلے پہلے تو اسماعیلیوں اور مصری خلفاء میں اتحاد و اتفاق رہا اس لیئے کہ اسماعیلی دعائیہ انھی کے نام پر ہوتا تھا لیکن گیارھویں صدی عیسوی کے آخر میں اسماعیلیوں نے مصر کے فاطمیوں سے اپنا رشتہ توڑ دیا۔ قریباً ایک صدی بعد ان ملحدوں اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کے پیشوا الخلفا، بغداد میں مفاہمہ کی سی صورت پیدا ہوگئی۔ اس لیئے کہ سلطنت کی مخالفت میں یہ دونوں مشترک تھے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں یعنی تاتاریوں کے حملے سے کچھ ہی مدت پہلے رئے، اصفہان اور اس کے گرد و نواح میں جو خانہ جنگیاں ہوئیں ان پر اسماعیلی دعائیہ بھی اثر انداز ہوا یا نہیں۔ اس کے متعلق ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ صرف شیعی و سُنّی ہی آپس میں دست و گریبان نہیں تھے۔ بلکہ سُنّیوں کے دو فرقوں حنفیوں اور شافعیوں میں بھی خانہ جنگی برپا تھی۔

زرعی آبادی کا بیشتر حصہ شیعوں کا طرف دار تھا اور شہری باشندوں کا بیشتر حصہ حنفیوں پر مشتمل تھا۔ البتہ شافعیوں کی آبادی سب سے کم تھی۔ آبادی کے اس تناسب کے باوجود رے میں شافعی اپنے تمام مخالفوں پر غالب آگئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے پردے میں جو جنگ جاری تھی وہ دراصل شہر اور گاؤں یا امراء کے طبقے اور جمہوریت پسند گروہوں میں تھی۔

اس قسم کے سوالوں سے متعلق فی الوقت ہمارے پاس زیادہ مواد موجود نہیں ہے۔ انہیں قلیل معلومات کی بناء پر جو کچھ اندازہ قائم ہوسکتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے عامۃ الناس اور ان کے مہذب راہ نما دونوں سیاسی یا قومی مقاصد سے بالکل بے پروا ہوگئے تھے۔ طبقہ واری یا فرقہ واری کشمکش سے قطع نظر اس عہد کے لوگوں کا رجحان مخصوص شہروں یا مخصوص علاقوں کو مرفہ الحال بنانے کی طرف تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں خاص خاص شہروں یا مخصوص علاقوں کی تاریخوں کی تعداد برابر بڑھتی جارہی ہے۔ تمام مسلمانوں کے لیے ایک ہی مملکت بنانے کا خیال تو ایک طرف رہا صرف کل ایرانی علاقوں کو بھی ایک مملکت کے ماتحت کرنے کا خیال بھی باقی نہیں رہا۔ بل کہ اس کی بجائے کم و بیش منطقہ واریت کا خیال قائم ہوگیا۔ خصوصاً سلجوقی سلطنت کے زوال کے بعد یہ رجحان زیادہ نمایاں ہوگیا۔ اب اس تصور کو بطور ایک ناقابل انکار اصول کے تسلیم کرلیا گیا کہ ہر علاقہ کی مرفہ الحالی کا انحصار اس واقعہ پر ہے کہ وہاں کے باشندوں سے جو مالگزاری وصول کی جائے وہ کسی صورت باہر خرچ نہ ہو۔ بالفاظ دیگر اب مختلف علاقوں کے مجموعہ کو ایک ہی حکومت کے زیر تسلط متحد و مربوط کرنے کی مخالفت کا رجحان پیدا ہوگیا تھا۔ فوجی نقطۂ نظر سے بھی چھوٹی چھوٹی خود مختار وحدتوں کے مقابلے میں بڑی بڑی مرکب سلطنتوں کے فائدوں کو کم کرکے دکھایا جاتا تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی کے شروع میں، والیٔ خوارزم سلطان محمد خوارزم شاہ پورے ایران اور وسط ایشیا کے کچھ حصے کو اپنی زیر سیادت متحد کرنے میں

کامیاب ہوگیا تھا۔ اس پر مورخ ابن اثیر کا تبصرہ یہ ہے: اسی الحاق و انضمام کی وجہ سے تاتاریوں کو اپنی فتوحات میں آسانیاں پیدا ہوئیں۔ پہلے کی طرح اگر بہت سے بادشاہ رہتے تو تاتاریوں کو ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ لڑکر فتح پانا پڑتا۔ خوارزم شاہ کی وجہ سے جب تاتاریوں نے خوارزمیوں کو شکست دے دی تو پھر تاتاری سیلاب کو روکنے والا کوئی نہ رہا۔

مقامی اختصاصیت قوی ہونے کے باوجود شہری زندگی کی ترقی اندرون و بیرون ملک کی برّی و بحری تجارت پر اثر ڈالے بغیر نہ رہ سکی۔ ہندوستان و چین کے درمیان جو بحری تجارت ہوتی تھی اس سے ہُرمُز اور جزیرۂ قیس کے باشندے بہت مرفہ الحال بن گئے۔ یہ مقامات وہاں واقع تھے جہاں خلیج فارس بحیرۂ ہند سے ملتا ہے۔ دسویں صدی عیسوی میں خوارزم اور دریائے والگا کی وادی میں قافلوں کے ذریعے تجارت کی گرم بازاری تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ والگا کی وادی کے تمام باشندے مسلمان ہوگئے۔ گو ظاہر ہے کہ بعد کو تجارتی تعلقات زیادہ اہم نہیں رہے۔ دسویں صدی عیسوی میں بلغاری، یعنی وادیٔ والگا کے کنارے بلغر نامی جو شہر آباد تھا وہ اس زمانہ میں ایک غیر اہم شہر تھا جس میں سرکنڈوں کے بنے ہوئے جھونپڑے اور نمدے کی جھول داریاں تھیں۔ لیکن منگولوں کے حملہ کے وقت یہ ایک سنگ بستہ شہر بن گیا تھا۔ اس کی آبادی پچاس ہزار سے کم نہیں تھی اور بعض مخصوص صنعتیں بھی جاری تھیں جیسے چمڑے کی صنعت جس کو بعد میں روسیوں نے بطور ورثہ پایا۔ "بلگری جوتے" دساور بھیجے جاتے تھے اور ترکستان میں عام طور پر مشہور تھے۔ عرب یا ایرانی تاجر روس سے جو تجارت کرتے تھے وہ بلغروں کی معرفت ہوتی تھی۔ کیوں کہ، جہاں تک ہمیں علم ہے عربوں یا ایرانیوں کا روسیوں سے کبھی راست تعلق پیدا نہیں ہوا۔ دسویں صدی عیسوی ہی میں روسی قزاق اسلامی علاقوں پر بے پناہ چھاپے مارنے لگے تھے۔ چناں چہ ان قزاقوں نے دریائے کُر کی وادی میں شہر بُردُہ کو تباہ کر دیا تھا، جو اس زمانہ میں

آبادی کے اعتبار سے تفقاز کا سب سے بڑا شہر تھا۔ بعد کو تجارتی اغراض کے لیئے روسی بھی بلغروں کے قدم بہ قدم بحیرۂ خزر تک سفر کرنے لگے تھے بل کہ بعض تاجر خوارزم کے دارالسلطنت تک بھی پہنچتے تھے۔ زرعی پیداواروں میں روسی سَنؔ مشرق میں ایک معروف شئے تھی۔ دسویں صدی عیسوی میں انہیں تجارتی تعلقات کی وجہ سے اسلامی فوجوں کی مدد کے بغیر مشرقی علاقوں میں اسلام کی خوب اشاعت ہوئی۔ چناں چہ نہ صرف خانہ بدوش ترکوں نے اسلام قبول کیا بل کہ بعض علاقوں میں بھی اس کی اشاعت ہوئی جو اب چینی ترکستان کہلاتا ہے۔ اس طرح جن ترکوں نے دسویں صدی عیسوی کے اختتام پر اسلامی علاقوں پر حملہ کیا تھا وہ پہلے ہی اسلام لاچکے تھے۔ بعد کی صدیوں میں مسلمان تاجر مشرق کی طرف اور آگے تک پہنچ گئے۔ تیرھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں منگولیا اور چین کی تجارت انہیں کے ہاتھ میں تھی۔ حتیٰ کہ چنگیز خاں کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہونے سے قبل اُس کے فوجی صدر مقام میں مسلمان بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ لیکن یہاں مسلمانوں کی تجارتی کامیابیوں کے ساتھ مذہبی تبلیغ کا وہ جوش موجود نہیں تھا جو ترکستان اور دریائے والگا کے کنارے تھا۔ چینی زبان میں مانوی اور مسیحی مذہب کے متعلق آٹھویں صدی عیسوی ہی میں کافی ادب موجود تھا لیکن اسلامی ادب اس زبان میں کہیں سترھویں صدی عیسوی میں جاکر پیدا ہوا۔ گو خود آٹھویں صدی عیسوی ہی میں چین میں مانی یا مسیح کے ماننے والوں کی تعداد اتنی نہیں تھی جتنی کہ مسلمانوں کی تھی۔ منگولیا میں بعد کو بھی زیادہ لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ البتہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس مقام پر لوگ مانی (آٹھویں صدی عیسوی میں) اور مسیح (گیارھویں صدی عیسوی) کو ماننے لگے تھے۔ ترکوں اور منگولوں میں ایرانی مسلمان تجارت و تہذیب کے سردار و راہ نما مانے جاتے تھے۔ کسی زمانے میں ترکوں نے ایک ہندوستانی اصطلاح "سُرتْ" یا "سرتاک" یا "سرتول" اختیار کی تھی۔ اس کے معنی تاجر کے ہیں۔ بعد میں ترکوں اور منگولوں نے اس اصطلاح کا استعمال ان ایرانیوں کے لیئے کرنا شروع کردیا جو خانہ بدوش

نہیں بل کہ متمدن تھے۔ بعد کے زمانہ میں منگولوں کی قومی داستان نے مقبول عام ہیرو "سرتک تائی" پیدا کیا جس نے گھاٹ تعمیر کیئے اور نہریں کھدائیں (تائی لاحقہ ہے جو عام ناموں کے آخر میں تذکیر ظاہر کرنے کے لیئے آتا ہے)۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ غیر اسلامی ملکوں سے تجارت کی بنیاد بلا کسی استثناء اصل زر نقد کی بنیاد پر قائم تھی۔ گیارھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں جنوبی روس کی تجارت کا لین دین چاندی میں ہوتا تھا۔ اور روس میں اسلامی ملکوں سے چاندی کے سکّے بڑی مقدار میں آتے تھے۔ مسلمانوں کو چاندی کے سکّہ کا رواج ساسانی سلطنت کے مشرقی علاقوں سے وراثت میں ملا تھا۔ لیکن بعد میں چاندی کے سکّوں کے زری نظام کی جگہ سونے کے سکّوں نے لے لی۔ گیارھویں صدی عیسوی کے آخر میں اسلامی دنیا میں چاندی میں ایک نازک وقت آیا اور اس کا اثر مشرق سے مغرب تک پھیل گیا۔ چاندی کے درہموں کی بجائے تانبے کے درہم مضروب ہونے لگے۔ یہ ایک قسم کا زر قانونی تھا جو صرف اس علاقہ میں چل سکتا تھا جہاں وہ مضروب ہوا تھا۔ ایشیا کے مغربی حصوں میں، جن میں وہ علاقے بھی شامل تھے جو راست خلفاء بغداد کے زیر حکومت تھے، چاندی کے سکّے گیارھویں صدی عیسوی ہی میں مضروب ہونے لگے تھے۔ جب منگولوں کی فتوحات کا دائرہ مشرقی ایشیا تک وسیع ہوا تو اس وقت ان علاقوں میں تانبے کا سکّہ رائج تھا۔ ہمارے پاس جو تاریخی شہادتیں موجود ہیں ان میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ زری نظام کی گڑبڑ نے لوگوں کی معاشی زندگی خصوصاً تجارت پر کیا اثر ڈالا تھا۔

تعمیر مابعد جنگ کا ایک جامع منصوبہ

از

جناب سید فخر الحسن صاحب ایم اے لکچرار معاشیات جامعہ عثمانیہ

دُنیا کے اکثر و بیشتر ممالک میں اس وقت تعمیر مابعد جنگ کا مسئلہ قابل توجہ بنا ہوا ہے اور اس کے متعلق مختلف قسم کے منصوبے اور لائحہ عمل تیار کئے جا رہے ہیں۔ انگلستان میں بیورج رپورٹ اور "فڈریشن آف انڈسٹریز" کی رپورٹ اور امریکہ میں "نیشنل ریسورسز پلاننگ بورڈ" کی رپورٹ اسی تعمیر مابعد جنگ کے لائحہ عمل پر مشتمل ہیں۔ ہندوستان میں بھی اس مسئلے پر سرکاری اور غیر سرکاری طور پر غور کیا جا رہا ہے جس کے نتیجے کے طور پر "بمبئی پلان" اور "پیپلس پلان" کے نام سے دو منصوبے شائع ہوئے اور اب حال میں ایک اور منصوبہ شائع ہوا ہے جس پر اس مضمون میں بحث کی جائے گی۔

اس قسم کے تمام منصوبوں کا تعلق معاشی ترقی و اصلاح اور قومی تعمیر سے ہے۔ البتہ ان میں اگر کوئی عام فرق پایا جاتا ہے تو وہ اس لحاظ سے کہ معاشی اعتبار سے ایک ترقی یافتہ ملک یہ چاہتا ہے کہ اس کی معیشت جنگ کے بعد ابتری کا شکار نہ ہو جائے اور اس کا موجودہ معیار نہ صرف برقرار رہے بلکہ اس میں مزید ترقی اور اصلاح ہو جائے لیکن جو ملک اب تک معاشی پستی میں رہا ہے اس کا اصلی مقصد اپنے معیار کو بلند کرنا اور ان نقائص سے بچنا ہے جو معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک میں پیدا ہو گئے ہیں اور وہ اب ان کو دُور کرنا چاہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس قسم کی منصوبہ بندیوں کا تعلق

بنیادی طور پر بے روزگاری کو کم کرنے یا معیار زندگی کو بڑھانے سے ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو فی نفسہ جنگ کی پیداوار نہیں کہلا سکتا بلکہ یہ پہلے سے موجود ہے، البتہ جنگ کے بعد جو صورت حال پیدا ہونے کا امکان ہے اس کے پیش نظر اگر اس سے غفلت برتی گئی اور قبل سے کوئی باضابطہ منصوبہ بندی نہ کی گئی تو ملک کی معاشی اور قومی زندگی کو خطرے میں پڑ جانے کا امکان ہے۔

مغربی ممالک کے برخلاف جہاں روزگار کے مسئلے کو اولیت حاصل ہے مشرقی ممالک میں معیار زندگی کا مسئلہ زیادہ مقدم ہے۔ انگلستان اور امریکہ وغیرہ میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیوں کر مکمل روزگار کی صورت پیدا کی جائے اور کم از کم موجودہ معیار کو گرنے نہ دیا جائے۔ لیکن ہندوستان کا اصلی مسئلہ یہ ہے کہ معیار زندگی کو بڑھایا جائے اور پھر جہاں تک ممکن ہو سکے بے روزگاری کو دُور کیا جائے۔ موجودہ جنگ سے قبل بھی ہندوستانی معیشت کا اہم مسئلہ یہی تھا اور جنگ کے بعد بھی یہی رہے گا۔ جس کے لیے مختلف منصوبہ بندیاں کی جا رہی ہیں۔ "ممبئی پلان" جو سر پرشوتم داس ٹھاکرداس اور ان کے سات رفیقوں کی طرف سے ایک یادداشت کی شکل میں پیش کیا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ پندرہ سال کے عرصے میں لوگوں کی موجودہ فی کس آمدنی میں دوگنا اضافہ ہو جائے، اسی طرح "پیپلس پلان" جو "انڈین فیڈریشن آف لیبر" کی جانب سے شائع ہوا ہے اس کی غرض بھی یہی ہے کہ دس سال کے عرصے میں لوگوں کے معیار زندگی کو ۴۰۰ ٪ بڑھایا جا سکے البتہ ان دونوں کا ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر سرمایہ دارانہ نوعیت رکھتا ہے اور اس میں صنعتی ترقی کو زیادہ اہم قرار دیا گیا ہے اور ثانی الذکر اشتراکی نوعیت رکھتا ہے اور اس میں زرعی ترقی کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اب رہا تیسرا منصوبہ جسے ہندوستان کے مشہور معاشی انجینیر سر وسویسوریا نے پیش کیا ہے، اس کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ ہندوستان کی معاشی پستی کو دُور کیا جائے، البتہ اس منصوبے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ

اس میں معاشی مسئلے کے ساتھ ساتھ سیاسی اور معاشرتی مسائل بھی شریک ہیں جس کی بناء پر اسے تعمیر مابعد جنگ کا ایک جامع منصوبہ کہا گیا ہے۔ ذیل میں اسی اعتبار سے اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

سیاسی تعمیر:

کسی ملک کی قومی ترقی کا کوئی منصوبہ مفید اور کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک کہ خود اہل ملک اُسے تیار نہ کریں اور قومی حکومت اُسے عملی جامہ پہنانے میں ہاتھ نہ بٹائے۔ ہندوستان کی آئندہ ترقی کا منصوبہ خود ہندوستانی بہی خواہان ملک کے مشورے سے ہی تیار کیا جاسکتا ہے اور اُسے قومی حکومت کی سرپرستی و استعانت ہی سے کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اسی چیز کے پیش نظر سیاسی تعمیر کا خاکہ پیش کرنے سے پہلے قومی حکومت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ برطانوی حکومت کا طرز عمل اب تک ملکی مفاد کے مغائر رہا ہے۔ ملک کی معاشی خوشحالی جیسے اہم مسئلے کے متعلق حکومت نے اب تک کوئی صحیح طریقۂ عمل اختیار نہیں کیا۔ خاص کر صنعتی ترقی جس پر ملک کی معاشی خوشحالی کا بہت کچھ انحصار ہے حقیقی معنی میں اب بھی اس سلسلے میں اپنا فرض ادا نہیں کر رہی ہے۔ موجودہ جنگ نے صنعتی ترقی کے لیے جو مناسب حالات پیدا کر دیے ہیں ان میں افسوس کہ حکومت نے بھتیری بنیادی اور بھاری صنعتوں کی ترقی کی طرف توجہ نہ کی۔ مثلاً جہاز سازی کی حالیہ قائم کردہ صنعت کو امداد اور ترقی کی صورت بہم پہنچانے کے بجائے ہندوستان کے لیے جہازوں کی سربراہی کا کام اسٹریلیا کے کارخانوں کو تفویض کیا جارہا ہے۔ طیارہ سازی کا جو کارخانہ قائم ہوا اُسے خانگی ہاتھوں میں رکھنے کے بجائے خود اپنے ہاتھوں میں لیکر فوجی قبضے میں دے دیا۔ حالانکہ کنیڈا اور اسٹریلیا کا تجربہ شاہد ہے کہ وہاں حکومت بڑی بڑی صنعتیں قائم کرکے خانگی کمپنیوں کے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔ اسی طرح ریلوے انجن سازی کا کارخانہ جو کچھ عرصہ پہلے جمشید پور میں قائم ہوا تھا اور بڑی حد تک ریلوے کے فرمائشات نہ ملنے کی

وجہ سے بند ہوگیا، اُسے دوبارہ قائم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی اور سیکڑوں انجن آج بھی برطانیہ اور کنیڈا سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ چیز بھی قابل ذکر ہے کہ ایسٹرن گروپ کانفرنس میں جنگی سامان کی تیاری کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے دیگر ممالک کے کارخانہ داروں کو شریک کیا گیا لیکن ہندوستان کے جن نمایندوں نے شرکت کی ان میں محض سرکاری عہدہ دار تھے، کارخانہ داروں کا کوئی نمایندہ نہ تھا۔ غرض ایسی صورت میں سیاسی تعمیر کا مسئلہ نہایت اہم ہے اور اس کے لیے قومی حکومت کا قیام ضروری ہے۔ جس قسم کی قومی حکومت کی تشکیل کی ضرورت ہے اس کا خاکہ حسب ذیل ہے۔

مرکزی حکومت ــ مشترک انتخاب : مرکزی حکومت میں مشترک انتخاب کے ذریعہ نمایندے شریک ہوں اور فرقہ وارانہ نمایندگی نہ رکھی جائے۔ حق رائے دہی کا انحصار یا تو جائداد کی ملکیت یا تعلیم پر ایک خاص معیار کے لحاظ سے ہو۔ اس طرح منتخب شدہ نمایندے جب پہلی بار مرکزی اسمبلی میں جمع ہوں گے تو یقیناً ان میں چند ایسی شخصیتیں ہوں گی جو تمام جماعت کی قیادت کے لائق ہوں، لہٰذا ان میں سے وہ شخص جسے اکثریت کا اعتماد حاصل ہو کابینہ کی تشکیل دے گا جس کے اراکین کا انتخاب ان ہی منتخب اراکین سے عموماً جماعت کی اکثریت کے اتفاق رائے کے ساتھ کرے گا۔ اور اس طرح یہ کابینہ، جس میں وائسرائے تاج کے نمایندے کی حیثیت سے شریک ہوگا، حکومت ہند پر مشتمل ہوگا۔

دو جماعتی حکومت : جیساکہ ممالک متحدہ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے جدید جمہوریت میں دو جماعتی حکومت پائی جاتی ہے ہندوستان میں بھی ہوگی۔ منتخب نمایندوں کی دو جماعتیں ہوں گی جن کی قیادت عوام کے مشہور افراد کریںگے جیساکہ انگلستان میں قدامت پسندوں اور مزدوروں کی جماعتیں ہیں یا امریکہ میں عمومیت پسندوں Democrats اور جمہوریت پسندوں Republicans کی دو جماعتیں ہیں۔

تاج برطانیہ سے تعلق - کرپس تجاویز : کرپس تجاویز میں حق خود ارادیت اور ایک یا ایک سے زیادہ یونین کی تشکیل تسلیم کر لی گئی ہے، اگر کوئی صوبہ یا ریاست اپنے کو اصل یونین سے علٰحدہ کرے تو ہندوستان کی وحدت باقی نہیں رہتی، اور پھر عملی طور پر برطانوی حکومت کا اقتدار باقی رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کسی یونین کو ترقی اور بقا کا موقع نہیں مل سکتا۔ نیز کرپس تجاویز کی رو سے قلمدان دفاع برطانوی سپہ سالار کے ہاتھوں میں رہے گا، لہٰذا سیاسی تعمیر میں کرپس تجاویز لائق پذیرائی نہیں۔ ہندوستانی حکومت کا تاج سے بالکل ایسا ہی تعلق رہنا چاہئے جیسا کہ کنیڈا اور اسٹریلیا کا ہے۔ اور اس میں کوئی ایسی دقت بھی نہیں جبکہ خود کرپس تجاویز میں ہندوستان کو علٰحدہ ہو جانے کی رعایت دی گئی ہے۔

دفاعی انتظامات : چونکہ ہندوستان اُس وقت تک ذمہ دار حکومت حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ اس میں بیرونی حملوں سے بچنے کی پوری صلاحیت پیدا نہ ہو جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ قومی حکومت ملتے ہی ملک کی حفاظت کا انتظام بھی شروع کر دیا جائے۔ بری، بحری اور ہوائی فوج کا قیام اور اس کو مستحکم بنانے کے لیے ہر قسم کی تربیت اور ساز و سامان کی فراہمی لازمی ہوگی۔

صوبہ واری اور ریاستی حکومت : صوبہ واری اور ریاستی حکومت کی تنظیم و تشکیل بھی بالکل مرکزی حکومت کی طرح ہونی چاہئے جس طرح مرکزی حکومت کے نمائندوں کا انتخاب مشترکہ عمل میں آئے اس طرح صوبوں اور ریاستوں میں مشترک انتخاب ہو اور فرقہ وارانہ بنیاد کو قائم نہ رکھا جائے۔ اور یہاں کے کابینہ کی تشکیل اس طرح سے ہو جس طرح مرکزی حکومت میں ہو۔ صوبوں اور ریاستوں میں البتہ جو فرق باقی رہے گا وہ یہ کہ ریاست میں خاندانی طور پر ایک والی ہوا کرے گا جس کے اختیارات مختلف اعتبار سے صوبوں کے گورنروں سے کچھ زیادہ ہوں گے۔

برطانیہ سے تجارتی اور مالی تعلقات : حکومت کی منتقلی کے بعد برطانیہ سے تجارتی

اور مالی تعلقات کیا ہونے چاہئیں ۔ ان پر ایک ذمہ دار کمیشن کے ذریعہ غور کرنے کے بعد ایک صاف اور واضح سمجھوتہ کیا جائے ۔ ہندوستان میں بہت سارے کاروبار مثلاً جوٹ، چائے، کافی اور معدنیات وغیرہ برطانوی سرمایہ سے چل رہے ہیں، ان پر ہندوستانی حکومت کے اقتدار کے متعلق تصفیہ کر دیا جائے گا۔ اس ضمن میں کنیڈا اور اسٹریلیا کے تجربات و حالات سے رہبری حاصل کی جاسکتی ہے ۔

مالیات، دفاع، حمل ونقل اور بیرونی تعلقات پر اقتدار : ہندوستان کی نئی حکومت دیگر ملکوں کی قومی حکومت کی طرح آزاد اور خود مختار ہوگی اور اس کا مالیات، دفاع، حمل ونقل اور بیرونی تعلقات پر پورا پورا اقتدار ہوگا۔ نیز قومی حکومت کو بالکل اختیار رہے گا کہ وہ برطانیہ یا دیگر ممالک سے جس قسم کے تعلقات کو بہتر سمجھے باقی رکھے اور آزادی کے ساتھ معاہدات کرے اور دیگر ممالک میں سفارت خانے اور قنصل خانے اسی طرح قائم کرے گی جس طرح کنیڈا کی حکومت نے کئے ہیں ۔

معاشری تعمیر: ہندوستان میں بعض ایسی خرابیاں پائی جاتی ہیں جو ایک حد تک موجودہ طرز حکومت کا نتیجہ ہیں اور ایک عام قومی بدنظمی دزبوں حالی کو ظاہر کرتی ہیں ۔ عموماً جہاں قومی حکومت ہوتی ہے وہاں اس قسم کی صورت حال پیدا نہیں ہوتی اور سماجی اصلاح اور قومی ترقی کا کام خود بخود چلتا رہتا ہے ۔

آبادی میں تیزی سے اضافہ : آبادی جس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اس کا ساتھ اشیائے خوراک نہیں دے رہی ہیں ۔ نتیجہ یہ ہے کہ معیار زندگی پست ہوتا جارہا ہے۔ مغربی ممالک میں عوام اور حکومت دونوں کے پیش نظر معیار زندگی کو نہ صرف برقرار رکھنے بلکہ بڑھانے اور بے روزگاری کو دُور کرنے کا مسئلہ رہتا ہے ۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں حکومت کی بے پروائی کے ساتھ ساتھ عوام بھی اپنے معیار زندگی کو برقرار رکھنے یا بڑھانے کی امکانی کوشش سے غافل نظر آتے ہیں ۔ مغربی ممالک کی طرح ضرورت ہے کہ ہندوستان میں افراد خاندان کی تعداد کو زیادہ بڑھنے سے روکا جائے۔

اور کم از کم اس پر اس وقت تک ضرور عمل کیا جائے جب تک کہ یہاں کا معیار زندگی ایک معقول سطح پر نہ پہنچ جائے۔

ہندوستانیوں کی وحدت: ہندوستان میں فرقہ وارانہ بنیاد پر مختلف سیاسی جماعتیں بن گئی ہیں جن کی نمایندگی مجالس مقننہ میں علحدہ طور پر ہوتی ہے۔ اس چیز کو مٹا دینے کی ضرورت ہے۔ نمایندگی مشترک انتخاب کے ذریعہ ہوا ور خدمات پر قابلیت کے لحاظ سے تقرر کئے جائیں تاکہ تمام افراد قوم کو یکساں طور پر صلاحیت پیدا کرنے اور ترقی پانے کا موقع مل سکے اور لوگ اتحاد و اتفاق کے ساتھ کام کرنے کا سبق سیکھ سکیں۔

ہندوستانیت: جس طرح امریکہ میں دوسرے ملکوں سے آکر بسنے والوں کو امریکانیت کی تحریک کے ذریعہ شہریت کے ایک خاص معیار اور یکسانیت میں لایا جاتا تھا اسی طرح ہندوستان میں اس بات کی ضرورت ہے کہ تمام باشندوں کو شہریت کے ایک خاص معیار پر لانے اور تہذیبی خصوصیت کے لحاظ سے یکساں بنانے کے انتظامات کئے جائیں۔ تاکہ یہاں کے غریب اور پست طبقے کے لوگ بھی کارکردگی، اخلاق، تعلیم، عادات واطوار اور قومی خصوصیات کے ایک خاص معیار پر پہنچ جائیں اور ہندوستانی شہری کہلانے کے مستحق بن سکیں۔ اگر ہندوستانیت کا یہ لائحۂ عمل صحیح طور پر چلایا جائے تو قومی اتحاد و ترقی کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔

ابتدائی عام تعلیم: تعلیمی اعتبار سے ہندوستان بہت پیچھے ہے۔ برطانوی ہند میں صرف ۱۲ فی صد ایسے لوگ ہیں جو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ لہٰذا ابتدائی تعلیم کا انتظام نہ صرف بچوں بلکہ بڑوں کے لئے بھی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک خاص مقصد کے تحت تعلیماتی مسلک اختیار کیا جائے تاکہ تعلیم یافتہ افراد مختلف موزوں اور کارآمد پیشوں میں مشغول ہو کر قومی دولت میں اضافہ کا باعث بن سکیں اور معیار زندگی کو بڑھا سکیں۔

زرعی آبادی کی منتقلی: ملک میں صنعتی ترقی میں رکاوٹ اور دوسرے پیشے کی کمی کی وجہ سے

آبادی کا ۷۶ ٪ زراعت میں لگا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پیدائش دولت کے شعبے اور روزگار کا توازن بگڑا ہوا ہے، لہٰذا صنعت کو ترقی دیکر زراعت سے زاید از ضرورت آبادی کو منتقل کیا جائے۔

دیہی خود اختیاری حکومت: جمہوریت کی عملی تربیت و مشق کی خاطر دیہی خود اختیاری حکومت کے طریقے رائج کرنے کی ضرورت ہے۔ یعنی دیہاتوں کے جتھے بنائے جائیں جو چھ سات سے لیکر دس بارہ دیہاتوں پر مشتمل ہوں۔ اور ہر ایک جتھے کی آبادی پانچ ہزار سے دس ہزار تک ہو اور دیہات کے باشندوں کے منتخب اراکین کی ایک دیہی مجلس ہو جو اپنے مخصوص علاقے کے مختلف مسائل خصوصاً تعلیم اور اشیائے صرف کی پیدائش کے مسئلے طے کیا کرے۔ اراکین کی تعداد سات سے بارہ تک ہو جو اپنے صدر کا انتخاب مختلف مدت کے لیے کرے۔ مجلس کا مستقر کسی مرکزی دیہات کو بنایا جائے۔ مجلس کے دستور اور فرائض کا تعین مرکزی یا صوبہ واری حکومت کے قانون کے ذریعہ ہو۔ محاصل کی وصولی صدر اور اس کا عملہ کرے اور اس سے حکومت کا حصہ ضلع کے خزانہ میں داخل کر دے۔ نیز یہ مجلس صوبہ واری ڈائرکٹر تعلیم سے مشورے حاصل کرے اور اپنی آمدنی کا ۶۰ ٪ ہر قسم کی تعلیم و تربیت پر صرف کرے جس کا تعلق زراعت، صنعت و حرفت اور دیگر کاروبار سے ہو۔

معاشری تعمیر میں قومی تعمیر شامل ہے لہٰذا اس کے لیے ایک خاص تنظیمی جماعت کے قیام کی ضرورت ہے، اس کا نام قومی تعمیری مجلس ہوگا۔ یوں تو یہ مجلس بالکل عوام کی ہوگی لیکن جہاں تک ممکن ہوگا حکومت کی امداد اور تعاون کے ساتھ کام کرے گی۔ اس کے جملہ ۹ اراکین ہوں گے جن میں سے چھ کا انتخاب عوام کے مشہور اور قابل افراد سے کیا جائیگا اور بقیہ تین کا انتخاب ایسے سرکاری عہدہ داروں سے ہوگا جن پر عوام کو اعتماد ہوگا۔ یہ مجلس مختلف اصلاحی امور کی نگرانی اور انجام دہی کے لیے علحدہ علحدہ کمیٹیاں بنائے گی۔ ہر ایک کمیٹی ملک کے چھ مشہور اور ماہر فن افراد پر مشتمل ہوگی۔ ابتداً ایسی بارہ کمیٹیاں مختلف اصلاحی امور کے لیے بنائی جائینگی یعنی (۱) زرعی اشیاء میں اضافہ (۲) صنعتی اشیاء میں اضافہ (۳) ابتدائی تعلیم

(۴) اعلیٰ تعلیم (۵) مالیات بنک کاری (۶) اعداد و شمار (۷) برآمد (۸) نقل و حمل (۹) صحت و رہائش (۱۰) ملکی دفاع کی تربیت (۱۱) مشین اور آلات کے استعمال میں اضافہ (۱۲) کاروباری صلاحیت کی تربیت و ترقی۔

ایسے تمام امور کی انجام دہی کے لیے جس عملے کی ضرورت ہوگی اس کے لیے ملک کے مشہور اور قابل افراد اور سرکاری عہدہ داروں کو جو اس کے لیے تیار ہو سکیں مامور کیا جائے گا۔ اگر فی الحال حکومت سالانہ پچاس ہزار کی امداد دے تو اُسے ان لوگوں کی تنخواہ اور کمیٹی کے اراکین کے سفر خرچ وغیرہ پر صرف کیا جائے گا۔ اس معاشری تنظیم کے جملہ مصارف فی الوقت آٹھ لاکھ سے زیادہ نہ ہوں گے اور بعد میں جب مزید بارہ کمیٹیوں کا مختلف امور سے متعلق اضافہ کیا جائے گا تو پندرہ لاکھ کے اندر اندر جملہ مصارف تکمیل پا جا سکینگے۔
اگر حکومت کوئی امداد نہ دے تو پھر خانگی ذرائع سے مصارف کی پابجائی پر غور کرنا ہوگا۔

معاشی تعمیر: معاشی ترقی کے تمام منصوبے اور جد و جہد کی بنیاد زراعت، صنعت اور نقل و حمل پر ہے لیکن ان میں سے صنعت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس کی ترقی سے قومی آمدنی اور لوگوں کی قوت خرید میں زیادہ تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام ترقی یافتہ ملکوں نے معاشی خوشحالی حاصل کرنے کے لیے اپنے یہاں کی صنعتوں کو فروغ دینے کی ممکنہ کوشش کی۔ ہندوستان میں چونکہ صنعتی ترقی کی خاطر خواہ کوشش نہ کی گئی بلکہ حکومت کی جانب سے رکاوٹیں پیدا کی جاتی رہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک معاشی پستی میں مبتلا ہے اور صنعت جیسے اہم ذریعۂ معیشت سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے اس کا سالانہ فی کس اوسط پندرہ روپیہ ہے۔ برخلاف اس کے انگلستان میں آٹھ سو اور امریکہ میں ایک ہزار روپیہ ہے۔
اس وجہ سے زیر بحث منصوبے میں "بمبئی پلان" کی طرح صنعت کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اور اس سلسلے میں یہ منصوبہ "بمبئی پلان" سے ایک عام مماثلت رکھتا ہے۔

معاشی تعمیر کے لیے سب سے پہلے جن باتوں کی ضرورت ہے وہ یہ کہ (۱) ایک علحدہ مرکزی محکمۂ صنعت قائم کیا جائے جو ایک مستقل وزیر حکومت کے تحت ہو۔ (۲) ایک معاشی

مجلس مرتب کی جائے جو ملک کے معاشی مفاد کا تحفظ اور معاشی ترقی کے تدابیر پیش کر سکے (۳) ابتداءً پانچ سال کے لیے سالانہ آٹھ کروڑ کا عطیہ حاصل جائے جس سے معاشی ترقی کے لیے جن ابتدائی تحقیقات کی ضرورت ہے وہ عمل میں لائی جا سکے اور چھوٹے چھوٹے صناع اور کاریگروں کو رقمی امداد اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جا سکے (۴) ایک ایسا عملہ ہو اور ایسی سہولتیں فراہم کی جائیں جن کے ذریعہ اعداد و شمار جمع کئے جائیں اور مفید معلومات حاصل ہو سکیں۔

علاوہ ازیں آیندہ ترقی کے لیے اس خاص معاشی دائرۂ عمل سے متعلق اور جن باتوں کی ضرورت ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) صنعتی ترقی کے لیے ایک پنجسالہ منصوبہ تیار کیا جائے جس کے مصارف کم از کم ۱۰۰۰ ہزار ہوں۔

(۲) فوری طور پر ایسی بارہ بنیادی اور بھاری صنعتیں قائم کرنے کے لیے کاروباری افراد کی مدد کی جائے جن کی ترقی رکی ہوئی ہے جو حسب ذیل ہیں:

او ٹوموبیل
طیارہ سازی
ڈیزل انجن ۔ ریلوے انجن ۔ پاور مشینری
مشینی آلات اور مشین
آہن و فولاد
بھاری برقی صنعتیں
جہاز سازی
دفاعی مشینری (اسلحہ اور صنعتی پلانٹ)
بھاری کیمیاوی اشیاء
مصنوعی ریشم
ڈھالنے اور سانچہ سازی کی صنعت

رنگ سازی کا مسالہ

(۳) زرعی اور صنعتی پیداوار کو سات سے دس سال کے عرصے میں دوگنا کرنے کا لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔ اس سلسلے میں جس دہ سالہ لائحہ عمل کی مصنف نے اپنی مشہور کتاب "ہندوستان کی منصوبی معیشت" مطبوعہ ۱۹۴۴ء میں پیش کیا ہے، اختیار کیا جا سکتا ہے۔ جس میں سالانہ قومی آمدنی کو ۲۵۰۰ کروڑ سے ۵۰۰۰ کروڑ تک بڑھانے اور صنعتی پیداوار میں ۴۰۰ کروڑ سے ۲۰۰۰ کروڑ تک کا اضافہ کرنے کی تدابیر پیش کی گئی ہیں اور جس کے لیے ایسی تمام نئی صنعتوں کے لیے جملہ دہ سالہ مصارف کا تخمینہ ۱۰۰۰ کروڑ کیا گیا ہے۔

(۴) ملک کے اندر (۱) صنعتی کارخانوں کے پلانٹ اور مشینری اور پاور مشینری اور (ب) اسلحہ تیار کرنے کا انتظام جلد از جلد کیا جائے۔

(۵) دیہی رقبوں میں صنعتی ترقی کی جو تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں ان میں مزید توسیع کی جائے۔

(۶) ملک کے کسی ایک مرکزی مقام پر اعلیٰ ٹکنالجی کا ادارہ قائم کیا جائے۔

صنعت کی ترقی کے بعد زراعت اور حمل و نقل کی ترقی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے لہٰذا اس ضمن میں جو تدابیر اختیار کی جائیں اس کے لیے ضروری ہے کہ حکومت ہند کے محکمۂ زراعت کی نوعیت ایک مستقل اور علیحدہ محکمے کی ہونی چاہیے جو ایک مستقل وزیر کے تحت ہو اور اس کے متعلقہ ذیلی محکمے بھی اس وزیر کے تحت علیحدہ علیحدہ طور پر رکھے جائیں۔ نقل و حمل کی ترقی کے لیے نئی سڑکوں کی تعمیر اور موجودہ سڑکوں کی توسیع پر ریل، جہاز اور طیارہ کے ذریعہ نقل و حمل کی ترقی و توسیع کو ترجیح دی جائے، اس لیے کہ اس کا تعلق پیدا آور خدمات سے ہے اور اس سے حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو سکتا ہے اور مصارف کا بار ناقابل برداشت نہیں ہو سکتا۔

معاشی مجلس اور زراعت، صنعت اور نقل و حمل کے مرکزی محکموں کے ساتھ ساتھ ایک چیف کمشنر یا ڈائرکٹر کی ضرورت ہے جو ایک ماہر عملے کے ذریعہ معاشی ترقی کی مہم کو

کامیاب بنانے کی کوشش کرسکے۔ صوبوں میں بھی اس قسم کے مختلف محکموں اور عملوں کی ضرورت ہوگی جو معاشی مجلس اور مرکزی محکموں کے اشتراک عمل سے کام کرسکے۔

ایک پنجسالہ منصوبہ:

قابل منصوبہ بندنے اپنے ہر جہتی منصوبہ (سیاسی، معاشی معاشری) کو پیش کرتے ہوئے بمبئی منصوبہ کو جسے وہ سب سے بہتر اور تشفی بخش منصوبہ قرار دیتے ہیں اُسے کامیابی کے ساتھ روبہ عمل لانے کے لیے جو تدابیر پیش کی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

پندرہ سالہ بمبئی منصوبے سے ایک پنجسالہ منصوبہ تیار کیا جاسکتا ہے۔ اس کے مصارف خود بمبئی منصوبے کے لحاظ سے ۴۰۰۰ کروڑ ہوں گے، اس پنجسالہ منصوبے سے ایک سال کے لیے بھی منصوبہ تیار کیا جاسکتا ہے جس کا ایک خاص مالیہ ہوگا اور جس کو عمل میں لانے کے لیے زیادہ سے زیادہ تین چار ماہ کی تیاری درکار ہوگی اور اس طرح تعمیر کا کام پیش نظر منصوبے کے تحت جلد از جلد شروع کیا جاسکتا ہے۔ اسی سلسلے میں اگر عوام کا تعاون اور اشتراک حاصل ہوسکے تو ان کے سامنے دونوں منصوبوں کو پیش کیا جاسکتا ہے اور ان کی تجاویز کی بناء پر مصارف کے جو کچھ بھی اعداد و شمار ہیں ان میں مناسب تبدیلی کے بعد گیارہ صوبوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں، گویا اس طرح مختلف صوبوں کے لیے علیحدہ علیحدہ اور تمام کے لیے جامع منصوبہ تیار ہوسکتا ہے۔

پندرہ سالہ اور پنجسالہ منصوبوں کے مصارف مختلف مجوزہ مدات ترقی کے لحاظ سے حسب ذیل ہیں:

مدات ترقی	۱۵ سالہ		۵ سالہ	
صنعت	۴۴۸۰		۷۹۰	
زراعت	۱۲۴۰		۲۰۰	
نقل وحمل	۹۴۰	۶۶۶۰ کروڑ	۱۱۰	۱۱۰۰ کروڑ
تعلیم	۴۹۰		۴۰	
صحت	۴۵۰		۴۰	
مکانات	۲۲۰۰		۱۹۰	
متفرقات	۲۰۰	۳۳۴۰۰ ”	۳۰	۳۰۰
		۱۰۰۰۰ ”		۴۰۰

ان دونوں منصوبوں کی جملہ مدات ترقی کو دو ابواب کے تحت رکھا گیا ہے پہلے تین پیدا آور ہیں جن کے مصارف (۶۶۶۰) اور ۱۰۰۰ کروڑ روپے ہیں اور بقیہ چار غیر پیدا آور ہیں جن کے مصارف ۳۳۴۰ اور ۳۰۰۰ کروڑ روپے ہیں گویا دو تہائی مصارف پیدا آور اغراض کے لیے اور ایک تہائی غیر پیدا آور اغراض کے لیے درکار ہوں گے پہلے پنجسالہ منصوبے کے پیدا آور مصارف جو صنعت، زراعت اور نقل وحمل کے لیے ہوں گے ان کی مقدار ۱۱۰۰ کروڑ روپے ہے اس کی فراہمی خانگی افراد یا کمپنیوں یا قرضے کے ذریعے ہوگی۔ نقل وحمل کو پیدا آور کاروبار کے تحت رکھا گیا ہے اس لیے کہ بحیثیت مجموعی اس سے آمدنی سب حاصل ہوگی لہٰذا اس سلسلے میں سڑکوں کی تعمیر و توسیع پر زیادہ رقم صرف کرنا مناسب ہوگا اور اس پر جو کچھ مصارف ہوں گے ان کو یا تو جنگی اخراجات میں شامل کیا جائے گا، اس لیے کہ سڑکوں کی خرابی کا باعث فوجی نقل وحمل ہے یا معمولی اخراجات ہیں جن کی پابجائی عام آمدنی سے ہوگی۔ اب رہے دیگر غیر پیدا آور کام جو دراصل قومی تعمیر کے صیغوں سے متعلق ہیں ان کے مصارف پنجسالہ منصوبے کے لحاظ سے ۳۰۰ کروڑ روپے ہیں، ان کی پابجائی بھی حکومت کی عام آمدنی سے ہوگی البتہ ابتدائی چند سالوں کے لیے یہ ہوسکتا ہے کہ تعلیم اور صحت کے مصارف قرضے کی رقم سے حاصل کئے جائیں۔ اور ان کا سود عام آمدنی سے ادا کیا گیا۔ اور بعد میں جب پیدا آور کاروبار کی ترقی سے لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا تو حکومت کے محاصل میں بھی اضافہ ہوگا اور قرضے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اب رہا حکومت کو فوراً اس سلسلے میں کم از کم جو ایک کام انجام دینا ہے وہ یہ کہ پانچ سال تک سالانہ دس کروڑ روپے کی امداد دیتی رہے تاکہ تینوں اقسام کے تعمیراتی کاموں کے ابتدائی انتظامات پر صرف کئے جائیں۔

منصوبۂ زیر بحث کا جو خلاصہ اوپر پیش کیا گیا اس سے یہ چیز تو واضح ہوجاتی ہے کہ جنگ کے بعد ہندوستان کے تعمیری لائحہ عمل کو معاشی، معاشرتی اور سیاسی تینوں مسائل پر

مشتمل ہونا چاہئے اور اس کے لیے تین علٰحدہ تنظیمیں درکار ہوں گی جن کی نگرانی اور مشورے کے تحت تمام تعمیری کام انجام پائینگے ۔ ان میں سے پہلی تنظیم سیاسی تعمیر سے متعلق ہو گی جو "تعمیری کمیشن" کہلائے گی ۔ دوسری "معاشی مجلس" ہو گی جس کا تعلق معاشی تعمیر سے ہو گا اور تیسری "قومی تعمیری مجلس" جو معاشری اصلاح کے کام سے متعلق ہو گی ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تینوں منصوبے علٰحدہ علٰحدہ یا بحیثیت مجموعی کس حد تک ہندوستان کی مابعد جنگ تعمیر کے لیے مفید اور لائق عمل ہو سکتے ہیں ۔ اس سلسلے میں یہ امر تو قابل تسلیم ہے کہ جب تک ملکی خود اختیاری حکومت نہ ہو کسی قسم کا تعمیری منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ "دی نیو اسٹیٹسمن اینڈ نیشن" کا یہ کہنا سچ ہے کہ "گورے محبتی ہندوستان کے لیے منصوبہ بندی نہیں کر سکتے" لہذا سیاسی تعمیر اور قومی حکومت کی تشکیل ضروری ہے چنانچہ "بمبئی پلان" بھی اسی مفروضہ پر مبنی ہے کہ ہندوستان کو قومی حکومت مل جائے گی ۔ لیکن منصوبہ زیر بحث میں جو خاکہ قومی حکومت کی تشکیل کا پیش کیا گیا ہے وہ نظری طور پر ممکن ہے قابل قبول ہو لیکن عملی طور پر اس کا قیام ناممکن ہے ، اس لیے کہ ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں اقلیت کے حقوق ، خود ارادیت اور پاکستان کے مسائل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

سماجی منصوبہ جس میں قومی تعمیر کا مسئلہ شامل ہے گرچہ ایک حد تک معقول اور لائق عمل تصور کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں بعض مسائل کو مخصوص نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے جو بڑی حد تک غلط ہے ، مثلاً کثرت آبادی کا مسئلہ ۔ اس وقت جب کہ ہم تعمیری لائحہ عمل تیار کر رہے ہیں اور قومی دولت میں اضافہ مقصود ہے جس کے لیے وسیع پیمانہ پر مختلف وسائل کی ضرورت ہے ہندوستان کی موجودہ آبادی اثاثے کا کام دے گی ۔ اس پر کثرت کا حکم لگانا نہ صرف غیر دانشمندی ہے بلکہ غیر علمی بھی مسئلہ آبادی کے ماہرین کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر کسی ملک کی آبادی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ فی کس آمدنی میں اضافہ پایا جائے تو کثرت آبادی تصور کرنے کی کوئی وجہ نہیں ۔ اس میں شک نہیں ہندوستان کی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ فی کس آمدنی میں

اضافہ کا رجحان ہے، ڈاکٹر راؤ کا تخمینہ ہے کہ فی کس آمدنی جو ۱۹۳۲ء میں ۶۵ روپے تھی وہ ۱۹۴۱ء میں ۷۰ روپے ہوگئی ۔ لہٰذا خالص معاشی اعتبار سے بھی آبادی کو کثیر قرار نہیں دیا جاسکتا چہ جائے کہ اس کو زائد از ضرورت سمجھتے ہوئے اس کے تحدید کے مسلک پر ہم اپنا سماجی لائحہ عمل تیار کریں ۔ آبادی ذریعہ کے ساتھ اپنا آپ مقصد بھی ہے جس کی اہمیت معاشری نقطۂ نظر سے فراموش نہیں کی جاسکتی ۔ معیار زندگی بڑھانے کے لیے تحدید آبادی کے مناسب طریق عمل اختیار کرنے سے کہیں بڑھ کر توسیع دولت کے تدابیر ضروری ہیں تاکہ فطری طور پر خود بخود آبادی میں ایک مناسب اور صحت بخش تحدید ہو جائے اور شرح اموات میں کمی اور اوسط عمر میں اضافہ ہو جائے ۔ لہٰذا معاشی اور معاشری تعمیر کے سلسلے میں یہ ایک ایسا اہم مسئلہ ہے کہ منصوبے کو صحیح نقطۂ نظر پر مبنی ہونا چاہیئے ۔

معاشی منصوبے کا جہاں تک تعلق ہے اس سلسلے میں یہ تو معلوم ہو چکا کہ "بمبئی پلان" کو ایک بہترین منصوبہ تصور کیا گیا ہے جس کی بنیاد پر ایک پنجسالہ اور یکسالہ منصوبہ تیار کر کے بتایا گیا ہے کہ کس طرح اس کو لائق عمل اور کامیاب بنایا جاسکتا ہے ۔ لیکن اس سے پہلے معاشی منصوبہ بندی کے سلسلے میں جو عام تجاویز پیش کی گئیں ہیں ان پر ایک اہم اعتراض جو کیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ اس میں بھی "بمبئی پلان" کی طرح صنعت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے چنانچہ اس کے لیے ایک خاص پنجسالہ صنعتی منصوبے کی سفارش کی گئی ہے جس پر کم از کم ۔۔۔ اکروڑ روپے صرف کئے جائیں گے ۔ نیز مصنف کی "ہندوستان کی منصوبی معیشت" نامی کتاب میں پیش کردہ لائحہ عمل کو اختیار کرنے کی جو سفارش کی گئی ہے اس میں بھی صنعتی ترقی کو اہم جگہ دی گئی ہے ۔ غرض اس طرح زرعی ترقی کو نہ تو کوئی خاص اہمیت دی گئی اور نہ اس کے لیے کوئی لائحہ عمل بتلایا گیا ۔ اس کے علاوہ معاشی منصوبے کا ایک اور نقص یہ ہے کہ گھریلو صنعتوں کی ترقی کو بھی کوئی خاص جگہ نہیں دی گئی ۔ حالانکہ معاشی لائحہ عمل میں زراعت اور گھریلو صنعتوں کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔ ان دونوں کے لیے ایک واضح لائحہ عمل ہونا چاہیئے ۔ نیز اس سلسلے میں نقل وحمل میں یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں کہ سڑکوں کی تعمیر و توسیع زیادہ ضروری نہیں ہندوستان میں

جس طرح ریلوں اور ہوائی جہازوں وغیرہ کی ترقی و توسیع کی سخت ضرورت ہے اسی طرح سڑکوں کی مزید تعمیر و توسیع بھی لازمی ہے۔

بایں ہمہ اب ایک اہم سوال جو اس ضمن میں پیدا ہوسکتا ہے وہ مالیات کی فراہمی کا ہے جو کسی منصوبی معیشت کو عمل جامہ پہنانے کے سلسلے میں قابل غور بن جاتا ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ مالی ذرائع کی کمی کو پورا کرنے کے لیے تخلیق شدہ زر Created Money کو کام میں لایا جاتا ہے، یعنی وہ زر جو حکومت کے تمسکات کی بنا پر نوٹوں کی شکل میں چھاپ چھاپ کر جاری کیا جاتا ہے، چنانچہ روس نے اپنے مشہور لائحہ عمل کے لیے اسی کو اختیار کیا تھا۔ "بمبئی پلان" تیار کرنے والوں نے بھی مطلوبہ سرمایہ میں ۳۴۰۰ کروڑ کی کمی کو اسی تخلیق شدہ زر کے ذریعہ پورا کرنے کی تجویز کی ہے جس کی وجہ سے اس پر سخت نکتہ چینی کی گئی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ ایک طرف تو عوام کے ہاتھوں میں زر کی کافی مقدار آجاتی ہے اور دوسری طرف چونکہ عموماً منصوبہ بندی کے تحت پہلے زیادہ تر بنیادی اور بھاری صنعتیں قائم کی جاتی ہیں۔ اس لیے اشیائے صرف کی مقدار میں اضافہ نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افراط زر کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور گرانی کا دور شروع ہو جاتا ہے چنانچہ روس میں یہی صورت پیش آئی، لہٰذا تخلیق شدہ زر کو کام میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ حکومت ملک کی معیشت پر نگرانی قائم کر دے یعنی راتب بندی اور نگرانی قیمت پر عمل کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ صارفین کی آزادی اور مفاد کے خلاف ہے، لہٰذا یہ اعتراض زیر بحث منصوبے پر بھی عام خیال کے تحت کیا جاسکتا ہے، کیونکہ باوجود اس کے کہ مالی سہولت کی تدابیر بتائی گئی ہیں لیکن پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مالی کمی کو تخلیق شدہ زر کے ذریعہ پورا کرنے کی نوبت نہ آئے لیکن تخلیق شدہ زر کی ساری خرابیاں دور کی جاسکتی ہیں اگر اس کی ایک اصلاح یافتہ شکل اختیار کی جائے یعنی نوٹوں کی بجائے ہنڈیاں جاری کی جائیں تو افراط زر کی شکل پیدا نہیں ہوسکتی۔ جرمنی نے اپنے منصوبے کی مالیات فراہم کرنے کے لیے اسی طریقے سے کام لیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہاں قیمتیں بڑھ نہ سکیں۔ ہوتا یہ تھا کہ کاروباری ہنڈیاں" جاری کی جاتی تھیں

جن پر بنک بٹہ کاٹتے تھے اور ان پر دوبارہ بٹہ رائش بنک کاٹتا تھا۔ اس طرح آخر میں جب نئے زر کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ رائش بنک کی طرف سے حکومت کے تمسکات کی بنیاد پر جاری کئے جاتے تھے۔ اس لیے افراط زر کی صورت پیدا ہونے نہ پاتی تھی گویا تخلیق شدہ زر کی وہ تمام خرابیاں جن کی بناء پر اس کی مخالفت کی جاتی ہے باقی نہیں رہتیں، لہٰذا زیر بحث منصوبے میں مالی سہولت پیدا کرنے کی جو تجویز پیش کی گئی اگر اس کے باوجود تخلیق شدہ زر کی ضرورت لاحق ہو ــــ جس کا بڑی حد تک امکان ہے ــــ تو جرمنی کے طریقے سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اور اس طرح مالی مسئلہ کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

ایک اور اہم مسئلہ ماہرین فن اور با مہارت محنت کی فراہمی کا ہے ہندوستان جیسے غیر ترقی یافتہ ملک کے لیے جہاں ابتداءً بنیادی اور بھاری صنعتوں کے قیام کی تجویز ہے وہاں کافی تعداد میں فنی ماہروں کی ضرورت ہوگی۔ روس میں پنجسالہ لائحہ عمل اختیار کرتے وقت یہی مسئلہ تھا لیکن وہاں آغاز کار کے لیے تو باہر کے ماہرین فن اور با مہارت محنت حاصل کی گئی، لیکن اس کے ساتھ خود منصوبے میں فنی تربیت و تعلیم کا ایک ایسا انتظام شامل تھا جس کی وجہ سے بعد میں باہر کے لوگوں کی ضرورت نہیں رہی۔ اس میں شک نہیں کہ زیر بحث منصوبے میں فنی تعلیم کو شریک کیا گیا ہے لیکن اس کو شروع کرنے کے لیے ابتداءً اور مختلف مدارج پر کیوں کر ایسے فنی ماہر دستیاب ہوں گے۔ اس کے متعلق کوئی واضح تجویز نہیں، لہٰذا ضرورت ہے کہ اس اس مسئلے میں روس کے تجربات کی روشنی میں منصوبے کو اس طرح تیار کریں کہ وہ خود فنی تربیت کا ذریعہ بن جائے، اور جوں جوں اس پر عمل کیا جائے خود ہندوستان میں ایسے لوگ فراہم ہوتے جائیں۔

بہر حال یہ تو صاف ظاہر ہے کہ اس منصوبے میں بھی دیگر منصوبوں کی طرح بعض خامیاں ہیں لیکن اس نقطۂ نظر سے کہ تعمیری منصوبے کو نہ صرف معاشی بلکہ سیاسی اور سماجی

ترقی و اصلاح پر مبنی ہونا چاہیئے اور اس کی نوعیت ہر جہتی ہو، یہ منصوبہ دوسرے منصوبوں کے مقابلے میں یقیناً زیادہ جامع ہے اور منصوبہ بندی کے لیے ایک نئی راہِ فکر کھول دیتا ہے۔ ہمیں اسی قسم کا ایک جامع منصوبہ تیار کرنے کی ضرورت ہے جو ہندوستان کی آیندہ ہر جہتی فلاح و بہبود کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مفید سمجھا جا سکے اور جس کی کامیابی کے متعلق شبہہ نہ کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ اس غرض کے لیے معاشیات، عمرانیات اور سیاسیات کے ماہروں اور عملی تجربہ رکھنے والے فن دانوں کے تعاون اور مشورے کی ضرورت ہے، لہذا قبل اس کے کہ کوئی قطعی منصوبہ اختیار کیا جائے اس کی جانچ پڑتال کے لیے ایک کمیٹی یا کمیشن ہونا چاہیئے جو ایسے مختلف ماہروں اور فن دانوں پر مشتمل ہو اور وہ کافی غور خوض کے بعد اس امر کا فیصلہ کر سکے کہ کس قسم کے منصوبے کو اور کس طرح عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے۔

ہندوستانی زر کا مستقبل

اور

بین الاقوامی مالی کانفرنس

از

جناب امتیاز حسین خاں صاحب، بی، کام (لندن) لکچرار کامرس جامعہ عثمانیہ

ماہرین معاشیات کی اکثریت اس خیال سے اتفاق کرتی ہے کہ زر کی پالیسی معاشرہ کے لیے اچھے اور بُرے نتائج پیدا کرسکتی ہے ۔ اس خیال کی تائید میں ہندوستانی زر کی تاریخ سے مختلف مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں ۔ زر کی پالیسی کے تعین کرتے وقت حاکم قوم کے مفادات کی حفاظت ہمیشہ پیش نظر رہی اور جہاں تک ہوسکا ہندوستانی مفاد کو نظر انداز کردیا گیا ۔ ہلٹن ینگ کمیشن (۱۹۲۵ء) کی سفارشات کے بعد روپیہ کی شرح تبادلہ ایک شلنگ اور چھ پنس مقرر کرکے ہندوستانی صنعتوں اور زراعت کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا گیا ۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں جبکہ انگلستان نے مجبوراً سونا معیار کو ترک کیا تو اس وقت بھی روپیہ کا تعلق اسٹرلنگ سے قائم کرکے وہی پُرانی شرح تبادلہ جس کے خلاف ہندوستان میں بہت کافی احتجاج ہوچکا تھا، پھر سے قائم کی گئی ۔ ۱۹۳۱ء میں زر کی جو پالیسی اختیار کی گئی اس کی وجہ سے ہندوستانی معیشت کو موجودہ جنگ شروع

ہونے تک کساد بازاری کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

موجودہ جنگ شروع ہونے سے پہلے اور عالمی کساد بازاری کے درمیان کے عرصہ میں ہندوستانی زر کے تین اہم مسائل تھے۔ ہندوستان کس قسم کا نظام زر قائم کرے۔ اسٹرلنگ اور روپیہ کے درمیان شرح تبادلہ کیا ہو اور ہندوستان سے سونے کی برآمد کے (جو کساد بازاری کے حالات اور روپیہ کی بیش تدری کی وجہ سے ہوئی تھی) متعلق حکومت کی کیا پالیسی ہونی چاہیے؟۔ ان تینوں اہم مسائل کے متعلق ملک میں مباحث جاری ہی تھے کہ ستمبر ۳۹ء میں یورپ میں جنگ کا آغاز ہوا اور ہندوستان کو بھی جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ جنگی حالات نے زر کے نئے نئے مسائل پیدا کردئے ہیں۔ جنگی ضروریات کی تکمیل کی خاطر نگرانیٔ تبادلہ کا قیام ضروری سمجھا گیا۔ اس سلسلہ میں یہ مناسب سمجھا گیا کہ ریزرو بنک کا ایک نیا شعبہ قائم کرکے نگرانیٔ تبادلہ کا کام اس کے سپرد کردیا جائے۔ نگرانیٔ تبادلہ کی پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے درآمد اور برآمد پر قیود عائد کی گئی ہیں اور سونے کی برآمد پر بھی پابندیاں لگائی گئی ہیں۔ جنگ کے شروع کے دو سال گذر جانے کے بعد ہندوستان میں افراط زر کے مسئلہ نے بھی خاص اہمیت اختیار کرلی اور اس سلسلہ میں بہت زیادہ مباحث ہوچکے ہیں۔ شروع شروع میں حکومت افراط زر کے وجود سے انکار کرتی رہی لیکن اب اس کے حالات کی موجودگی سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے اور اس کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے ضروری تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ افراط زر کے پیدا ہونے کی سب سے اہم وجہ حکومت کی موجودہ مالیاتی پالیسی ہے۔ اتحادی اقوام کی جنگی ضروریات پوری کرنے کی وجہ سے لندن میں ہندوستان کے اسٹرلنگ فاضلات میں ہر مہینے اضافہ ہورہا ہے۔ آج کل ماہرین کی توجہ سب سے زیادہ انھیں فاضلات کی طرف ہے، اور ملک میں مباحث جاری ہیں کہ ان فاضلات کو کس طرح سے استعمال کیا جائے تاکہ ہندوستانی معیشت کی بہت سی خامیوں کو دُور کیا جاسکے۔

ہندوستانی زر کی پچھلے دس بارہ سال کی تاریخ سے مندرجۂ بالا چند مثالیں اس بات کا

اظہار کرتی ہیں کہ زر کی پالیسی اختیار کرتے وقت ہندوستانی قوم کے مفادات کا کبھی بھی خیال نہیں رکھا گیا۔ کساد بازاری کے دوران میں جبکہ مختلف ممالک نے زر کے انتظامات کے سلسلہ میں نئے نئے طریقے اختیار کیے اور زر کی پالیسی کے ذریعہ کساد بازاری کے بُرے اثرات کو جلد سے جلد دُور کرنے کی کوشش کی ہندوستانی معاشرہ کو تفریط زر کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ جنگ کے بعد کچھ دنوں تک البتہ ہندوستان کے لیے حالات موافق رہے اور اس کے بعد افراط زر اپنی تمام بُرائیوں کے ساتھ ملک میں نمودار ہوا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مستقبل میں زر کی پالیسی کا مرکزی مقصد ہندوستانی عوام کو فائدے پہنچانا رہے گا یا ماضی کے واقعات کو پھر دہرایا جائے گا؟ روپیہ کے مستقبل کا تعلق بہت کچھ بین الاقوامی نظام زر سے ہے۔

پچھلی جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد سب سے پہلے بین الاقوامی سیاسی حالات کے استحکام کے لیے بعض تدابیر اختیار کی گئی تھیں۔ ان تدابیر کا نتیجہ انجمن اقوام کی شکل میں نمودار ہوا تھا۔ موجودہ جنگ کے دوران ہی میں دنیا کے معاشی حالات کو بہتر کرنے کی خاطر سوچ بچار شروع کر دیا گیا ہے۔ مختلف ممالک کی معاشی اور مادّی ترقی کے لیے بین الاقوامی نظام زر کا قیام بہت ضروری ہے۔ اسی لیے تنظیم مابعد جنگ کے مباحث میں بین الاقوامی نظام زر کا مسئلہ درجۂ اوّلیت رکھتا ہے۔ جس طرح سے عالمی ریاست کے فقدان اور قومی حکومتوں کے وجود اور قومی رقابتوں کی وجہ سے امن عالم کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے، اسی طرح سے مختلف ممالک کے نظام زر جدا جدا ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ تجارت اقوام میں اتنی آزادی باقی نہیں رہتی جتنی کہ اندرونی تجارت میں ہوتی ہے اور معاشی جنگ کے خطرات ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ جنگ عظیم سے پہلے تقریباً چالیس سال تک دنیا میں سونا معیار قائم رہا جس کی حیثیت بین الاقوامی نظام زر کی سی ہو گئی تھی۔ بین الاقوامی تجارت اور مالیاتی لین دین میں سہولت پیدا ہوئی اور عالمی معیشت وجود میں آئی۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سونا معیار کوئی بالکل معیاری نظام زر نہیں تھا۔ اس میں بہت سی خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ اس کے قائم

رہنے کی اہم وجہ اس وقت کے خصوصی حالات تھے۔ جنگ عظیم کے دوران میں تقریباً تمام ممالک اس نظام کو ترک کرنے پر مجبور ہوئے۔ جنگ کے ختم ہونے کے کچھ سالوں کے بعد سونا معیار دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن جنگ کے حالات نے مختلف ممالک کی معاشی ہیئت ترکیبی میں بہت سی اہم تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں جن کی وجہ سے سونا معیار کو برقرار رکھنا ناممکن ہوا اور اس طرح سے بین الاقوامی نظام زر قائم کرنے کی کوشش ایک مختصر سے عرصہ میں ناکام رہی۔ ۳۱ء کے بعد دنیا میں زر کے معاملات میں افراتفری کا دور دورہ شروع ہوا۔ ہر ملک نے اپنے زر کی بیرونی قدر کو کم کر کے اپنی برآمد کو بڑھانے کی کوشش کی۔ یہی پالیسی دوسرے ممالک کو اختیار کرنی پڑی۔ اسی دوران میں معاشی ادب میں نگرانی تبادلہ، حسابی معاہدے اور نصابی طریقے کی جدید اصطلاحیں استعمال ہونے لگیں۔ دنیا میں معاشی قومیت کا چرچا ہوا اور تجارت بین الاقوام گھٹ کر تقریباً آدھی رہ گئی، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ جنگ کا بڑا سبب دنیا کے یہی معاشی حالات تھے۔ دنیا میں دوبارہ خوشحالی کا دور دورہ قائم کرنے کے لیے بین الاقوامی نظام زر کے قیام کی کوشش کرنی بہت ضروری ہے۔ حکومت برطانیہ، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور کنیڈا کی طرف سے بین الاقوامی نظام زر کے سلسلہ میں پچھلے سال تین منصوبے تیار کیے گئے تھے۔ امریکہ نے ان اعتراضات کی روشنی میں جو اس کے منصوبے پر کیے گئے اپنے منصوبے کی دو مرتبہ نظر ثانی کی اور مختلف ممالک کے لیے اس کو زیادہ قابل قبول بنانے کی کوشش کی۔ انگلستان، امریکہ اور بعض دوسرے اتحادی ممالک کے ماہرین ان منصوبوں پر غور کرنے کے لیے کئی مہینوں تک مصروف رہے اور مختلف مباحث کے بعد انھوں نے ایک مشترکہ اسکیم تیار کر کے اپریل ۴۴ء میں پیش کی۔ اس مشترکہ اسکیم کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے انگلستان اور امریکہ دونوں کے منصوبوں کی خوبیوں کو پیش نظر رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ اس مشترکہ اسکیم پر غور کرنے اور قبول کرنے کی غرض سے پچھلی جولائی میں تمام اتحادی ممالک کی ایک اہم کانفرنس امریکہ میں منعقد

کی گئی تھی ۔ اس کانفرنس میں ۴۴ مختلف ممالک کے نمائندوں نے حصہ لیا ۔ ہندوستان کی طرف سے حکومت ہند کے وزیر مالیہ ، معاشی مشیر اور ریزرو بنک کے گورنر نے شرکت کی ، اور دو غیر سرکاری نمائندے سر چیٹی اور مسٹر شراف بھی شریک رہے ۔ کئی ہفتوں کے مباحث کے بعد کانفرنس نے چند ترمیمات کے ساتھ اتحادی ماہرین کی مشترکہ اسکیم کو منظور کر لیا ہے اور یہ اسکیم شریک ہونے والے ممالک کی حکومتوں کے سامنے پیش کی جائے گی ۔ کانفرنس میں شریک ہونے والی اقوام پر قانونی پابندی اس وقت تک عاید نہیں ہوگی جب تک ان کی حکومتیں اسکیم کو قبول نہ کر لیں ۔

کانفرنس میں مبادلات خارجہ کو استحکام دینے کی غرض سے ایک بین الاقوامی ذخیرۂ زر قائم کرنے اور تنظیم مابعد جنگ اور غیر ترقی یافتہ ممالک کی معاشی ترقی کے لیے ایک بین الاقوامی بنک کے قیام کا تصفیہ کیا گیا ہے ۔ بین الاقوامی ذخیرۂ زر قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسا مستقل ادارہ موجود ہو جس کے ذریعہ زر کے بین الاقوامی مسائل کو مختلف اقوام آپس میں اتحاد عمل اور باہم مشورہ سے طے کر سکیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ ممالک کو اتنی آزادی بھی رہے کہ وہ اپنے حالات کو دیکھ کر زر کی پالیسی کا تعین کریں ۔ تجارت بین الاقوام کو فروغ حاصل ہو اور روزگار میں اضافہ کی وجہ سے مختلف اقوام کے معیار زندگی کو بلند کیا جا سکے ۔ ذخیرہ کی مجموعی مقدار ۸۸۰۰ ملین ڈالر مقرر کی گئی ہے ، اس میں سے ۸۸۰۰ ملین ڈالر کانفرنس میں شریک ہونے والی اقوام کے درمیان بطور حصہ Quota تقسیم کر دیا جائے گا ۔ یہ کہا گیا ہے کہ ہر ملک کا حصہ اس کی معاشی اہمیت کے لحاظ سے مقرر کیا گیا ہے ، گو اس میں کچھ زیادہ اصلیت نہیں ۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا حصہ ۲۷۵۰ ملین ڈالر ۔ برطانیہ ۱۳۰۰ ، روس ۱۲۰۰ ، چین ۵۵۰ ، فرانس ۴۵۰ ، اور ہندوستان کا حصہ ۴۰۰ ملین ڈالر مقرر کیا گیا ہے ۔ ذخیرہ میں شریک ہونے والے ممالک ذخیرہ سے لین دین اپنے مرکزی بنک یا سرکاری خزانہ کے توسط سے کریں گے ۔ اراکین ممالک کو اپنے حصہ کا ۲۵ فیصد یا اپنے سونے کے ذخیرہ کا ۱۰ فیصد جو بھی کم ہو سونے کی شکل میں

ادا کرنا پڑے گا۔ حصہ کی بقیہ مقدار کے برابر ذخیرہ کو اپنا زر دینا پڑے گا اور اس طرح سے
ذخیرہ کی ملکیت میں شریک ہونے والے تمام ممالک کا زر آ جائے گا۔ جب کبھی کوئی رکن ملک
کسی دوسرے رکن ملک سے درآمد کرنا چاہے تو وہ ذخیرہ کو اپنا زر دے کر دوسرے
ملک کا زر حاصل کر سکے گا۔ درآمد کرنے والے ممالک کو اس کی فکر نہیں رہے گی کہ انھیں
پہلے بیرونی زر جمع کرنا چاہیے، اس کے بعد ہی وہ دوسرے ممالک سے درآمد کر سکیں گے۔
لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ درآمد کرنے والے ملک کے زر کی مقدار ذخیرہ کے پاس
اس کے حصہ کا دو سو فیصد سے زیادہ نہ بڑھی ہو، اور جس زر کا مطالبہ کیا گیا ہے اس کی
مقدار حصہ کا ۷۵ فیصد سے کم نہ ہوئی ہو۔ خریدنے والے ملک کے زر کی مقدار حد سے
بڑھ جائے تو ذخیرہ سے دوسرا زر خریدنے کا صرف ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ذخیرہ
کے ہاتھ سونا فروخت کیا جائے۔ جس زر کا بہت زیادہ مطالبہ ہوا اور جس کو ذخیرہ
پورا نہ کر سکے تو اس کے لیے ذخیرہ کو اس کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ دوسرے ممالک
سے قرض لیکر یا دوسرے ممالک کے ہاتھ سونا فروخت کر کے زر کو حاصل کر سکتا ہے۔
رکن ممالک کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنا زر دے کر ذخیرہ سے سونا خرید سکیں۔
ذخیرہ اپنی مرضی سے سونا فروخت کر سکتا ہے۔

جب تک مختلف ممالک کی درآمد اور برآمد میں توازن قائم رہے کسی قسم کی خرابی
پیدا نہیں ہوگی۔ دِقّت اس وقت پیدا ہوگی جبکہ کوئی ملک اپنی برآمد کے مقابلہ میں زیادہ
مال درآمد کرنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں باہمی مشورہ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش
کی جائے گی کہ درآمد میں اضافہ کے اسباب کیا ہیں؟ اگر دوسرے ممالک کے مقابلہ میں
اس ملک کے مصارف پیدائش کی سطح زیادہ ہے تو اس کے زر کی بیرونی قدر کو کم کر کے
آسانی سے اس خرابی کو دُور کیا جا سکے گا، اور تجارت بین الاقوام میں دوبارہ توازن
قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس کے برخلاف اگر درآمد میں اضافہ کی وجہ یہ
ہے کہ دوسرے ممالک جن کی برآمد زیادہ ہے درآمد کرنے والے ملک سے مال خریدنے پر

تیار نہیں ہیں تو ذخیرہ ان ممالک کو واضح کردے گا کہ ایسا عدم توازن تجارت بین الاقوام کے نقطۂ نظر سے مضر ہے، اور اس لیے ان کی پالیسی میں جلد سے جلد تبدیلی ہونی چاہیے۔ مختصر یہ کہ تجارت بین الاقوام کے رجحانات پر بغور نظر رکھی جائے گی اور اس کی بے ترتیبیوں کو مشورہ اور مباحث کے ذریعہ سے دُور کیا جانے کا تعقبہ کیا گیا ہے۔ ہر ملک کے زر کی قدر مساوی Parvalue کا تعین شرکت کے وقت کیا جائے گا، اور اس کا اظہار سونے کے ذریعہ یا امریکی ڈالر کی شکل میں ہوگا۔ اس طرح سے زر کا تعلق سونے سے برقرار رکھا گیا ہے اور سونے کو دنیا کے نظام زر میں بہت کافی اہمیت حاصل رہے گی۔ ذخیرہ کے ہاتھ سونا فروخت کرکے کوئی بیرونی زر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ذخیرۂ زر میں شریک ہونے والے ممالک یہ بھی طے کریں گے کہ سونے کی قیمت کیا مقرر کی جائے، اور اس میں غیر معمولی تبدیلیوں کو روکا جائے۔ عالمی نظام زر میں سونے کی اہمیت کو برقرار رکھنے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سونا پیدا کرنے والے ممالک (روس اور برطانوی شہنشاہیت) اور سونے کا سب سے بڑا ذخیرہ کے مالک ملک (ریاستہائے متحدہ امریکہ) کی غرض داریاں قائم رکھی جا سکیں۔ ذخیرہ رکن ممالک کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گا اور انھیں اجازت ہوگی کہ وہ اپنے سونے کے ذخیرہ کا خیال کیے بغیر زر کی پالیسی معین کریں۔

اس نئے نظام کو سونا معیار نہیں کہا جا سکتا۔ سونا معیار کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی شخص زر کاغذی دے کر مرکزی بنک یا سرکاری خزانہ سے سونا حاصل کر سکتا ہے اور دوسرے سونے کی درآمد پر کسی قسم کی قیود عائد نہیں کی جاتیں۔ نئے نظام زر میں یہ خصوصیات نہیں پائی جاتیں۔ منظورہ اسکیم کا مقصد سونا معیار قائم کرنا نہیں بلکہ مبادلات خارجہ کو استحکام دینا ہے، اس لیے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ سونا زر کی اندرونی قدر کی تبدیلیوں پر حکمرانی نہ کرسکے۔ لارڈ کنیس نے اپنی ایک تقریر میں اسکیم کے متعلق اس کا اظہار کیا ہے کہ پُرانے سونا معیار میں سونے کی حیثیت مطلق العنان حکمران

کی سی تھی ۔ نئے نظام زر میں اس کی حیثیت دستوری بادشاہ کی سی رہ جائے گی ۔ سونا معیار کی سب سے بڑی خوبی یعنی مبادلات خارجہ کو استحکام ہی اس کی سب سے بڑی خامی ہے۔ مبادلات خارجہ کے استحکام کی وجہ سے زر کی اندرونی قدر یا قیمتوں کا ٹھیراؤ حاصل نہیں کیا جاسکتا ۔ سونے کی پیداوار میں کمی بیشی زر کی قدر اور اس کے توسط سے معاشرہ کے مختلف طبقات کو متاثر کرتی ہے ۔ اس طرح سے سونے کی درآمد اور برآمد کی وجہ سے سونا معیار کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے کبھی افراط زر اور کبھی تفریط زر کی پالیسی کو اختیار کرنا پڑتا ہے تاکہ تجارت خارجہ میں توازن قائم کیا جاسکے ۔ نئی اسکیم میں قدر مساوی میں تبدیلیوں کی اجازت دی گئی ہے ۔ کوئی رکن ملک اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو ذخیرہ کو اطلاع دے کر دس فیصد تک تبدیلی کرسکتا ہے ۔ ذخیرہ سے مشورہ کے بعد مزید دس فیصد کی اجازت مل سکے گی ۔ قدر مساوی میں یہ تبدیلی نئے نظام کو سونا معیار سے بالکل جدا کردیتی ہے، گو نئے نظام زر کا بھی تعلق سونے سے بہت کافی قائم رکھا گیا ہے۔ سونے کی قدر یا قیمت میں تبدیلی اس وقت کی جاسکے گی جبکہ ایسے تمام ممالک جنھیں ذخیرہ کا دس فیصد سے زیادہ حصہ حاصل ہو اس کے لیے تیار ہوں ۔ اس طرح سے نئے نظام میں نظم قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اس کے برخلاف سونا معیار میں بدنظمی پائی جاتی ہے ۔

ذخیرہ زر کے انتظامات ایک بورڈ کے سپرد رہیں گے جس کے اراکین کی تعداد بارہ مقرر کی گئی ہے ۔ پانچ نظماء ایسے رکن ممالک کے نمائندے ہوں گے جن کا ذخیرہ میں حصہ سب سے زیادہ ہے ۔ بقیہ سات نظماء میں سے دو کے انتخاب کرنے کا حق جنوبی امریکہ کی ریاستوں کو حاصل رہے گا ، اور پانچ کا انتخاب باقی اراکین کریں گے ۔ اس بورڈ کی اکثریت ہی پالیسی کا تعین کرے گی ۔ اسکیم میں بورڈ کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ رکن ممالک سے سونے کی مقدار اور مبادلات خارجہ وغیرہ کے متعلق بعض ضروری معلومات حاصل کرسکے ۔ شریک ہونے والے ممالک کو یہ بھی حق حاصل رہے گا کہ وہ تحریری اطلاع کے بعد ذخیرہ زر کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں ۔ منظورہ اسکیم میں ایک

ضروری دفعہ عبوری دور کے متعلق بھی شامل کی گئی ہے۔ ذخیرہ قائم ہونے کے بعد تین سال سے پانچ سال کی مدت کو عبوری دور سمجھا جائے گا۔ اس مدت میں رکن ممالک کو اس بات کی اجازت رہے گی کہ اگر وہ چاہیں تو مبادلات خارجہ پر نگرانی اور اسی قسم کی بعض دوسری پابندیاں قائم رکھیں۔ اس عرصہ میں ایک ملک کے زر کو دوسرے ملک کے زر میں تبدیل کرنے کا قانونی مطالبہ نہیں کیا جاسکے گا۔ کانفرنس کے معاہدہ میں یہ بھی تصفیہ ہوا ہے کہ جب تک ایسے ممالک جو ذخیرہ کے ۶۵ فیصد کے مالک ہیں شریک ہونے کے لیے تیار نہ ہوں، اسکیم پر عمل شروع نہ کیا جائے۔ اس دفعہ کا مطلب یہ ہے کہ جب امریکہ، برطانیہ اور روس چاہیں گے ذخیرہ زر قائم کیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ وہ اسی وقت تیار ہوں گے جبکہ وہ اسکیم میں اپنا مفاد دیکھیں۔ معاشی حیثیت سے کمتر ممالک اپنے فائدہ کی خاطر اسکیم پر عمل ہونے پر مجبور نہیں کرسکتے۔ اس طرح سے معاشی معاملات میں بھی بڑی بڑی قوتوں کے مفادات کی حفاظت کی کوشش کی گئی ہے۔

بین الاقوامی مالی کانفرنس میں ایک عالمی بنک قائم کرنے کے متعلق بھی طے ہوا ہے۔ اس بنک میں وہی ممالک شریک ہوسکیں گے جو بین الاقوامی ذخیرہ زر کے رکن ہوں۔ بنک قائم کرنے کی غرض یہ ہے کہ سرمایہ کے بین الاقوامی لین دین میں سہولتیں پیدا کی جائیں۔ یہ بنک ایسے ممالک کو جن کی معیشت جنگی حالات کی وجہ سے بہت زیادہ تباہ ہوئی ہے، یا جن میں جنگی معیشت کو امن کی معیشت میں تبدیل کرنے کے لیے بہت زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہو، قرضے دلانے میں مدد دے گا۔ ایسے ممالک بھی اس بین الاقوامی ادارہ کے توسط سے قرضے حاصل کرسکتے ہیں جن کے یہاں معاشی ترقی پوری طرح سے نہیں ہوئی ہے اور معاشی وسائل کو اچھی طرح سے کام پر نہیں لگایا گیا ہے۔ عالمی بنک سے ہندوستان تینوں مدات کے تحت امداد حاصل کرسکتا ہے اور اسی لیے بین الاقوامی ذخیرہ زر کے قیام سے کہیں زیادہ اس ادارہ کا قیام ہندوستانی نقطۂ نظر سے

اہمیت رکھتا ہے۔

بنک کا سرمایہ دس ہزار ملین ڈالر مقرر کیا گیا ہے، جس میں سے ۸۸۰۰ ملین ڈالر سرمایہ کانفرنس میں شریک ہونے والی قوموں میں تقسیم کیا جانے کا تصفیہ کیا گیا ہے اور ۱۲۰۰ ملین ڈالر بعد میں شریک ہونے والی اقوام کے لیے مختص کردیا گیا ہے منظورہ سرمایہ کا صرف ۲۰ فیصد بنک قائم ہونے کے وقت جاری کیا جائے گا اور ۸۰ فیصد حسب ضرورت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ شریک ہونے والے ممالک جاری شدہ ۲۰ فیصد سرمایہ کا ۲ فیصد سونے یا امریکی ڈالر میں ادا کریں گے اور ۱۸ فیصد مقامی زر میں بھی ادا کیا جاسکے گا۔ بنک ضرورت مند رکن ممالک کو دوسرے ایسے رکن ممالک جہاں سرمایہ کی افراط ہو، اپنی ضمانت پر قرضے دلائے گا، اور اس طرح سے سرمایہ کے بین الاقوامی لین دین میں ایک قسم کا تحفظ پیدا ہو جائے گا۔ بنک خود اسی وقت قرضے دے گا جبکہ اس کی ضمانت کے باوجود بعض ممالک قرضے حاصل نہ کرسکیں۔ ضرورت مند ممالک کم شرح سود پر قرضے حاصل کرسکیں گے اور بہت بڑی حد تک بیرونی سرمایہ کی خرابیاں دُور جائیں گی۔ بنک کی طرف سے کوئی ایسی پابندی بھی عائد نہیں کی جائے گی جس کے تحت قرض لینے والا ملک اپنی ضروریات کی چیزیں بعض خاص ممالک سے خریدنے پر مجبور کیا جائے، البتہ بنک اس کی نگرانی ضرور کرے گا کہ جس مقصد سے قرضہ لیا گیا ہے اس کی تکمیل پر قرضہ کی رقم صرف کی جائے۔ بنک ممالک کے سیاسی معاملات میں بھی کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گا۔

بنک کے سرمایہ میں بعض اہم ممالک کے حصہ کی مقدار حسب ذیل ہے:-

ریاستہائے متحدہ امریکہ	۳۱۷۵ ملین ڈالر
برطانیہ	۱۳۰۰ "
روس	۱۲۰۰ "
چین	۶۰۰ "
ہندوستان	۴۰۰ "

بنک کے انتظامی مسائل بارہ نظماء پر مشتمل ایک بورڈ کے سپرد رہیں گے ۔ پانچ نظماء سب سے زیادہ حصہ پانے والے ممالک کے مستقل نمائندے ہوں گے ۔ دو جنوبی امریکہ کی ریاستوں کے نمائندے اور بقیہ پانچ کا انتخاب دوسرے اراکین کریں گے ۔ بنک کے سلسلہ میں بھی ہندوستان کو بورڈ میں مستقل جگہ نہیں دی گئی ۔

بین الاقوامی مالی کانفرنس میں شریک ہونے والے ہندوستانی وفد کے غیر سرکاری نمائندوں نے بعض بیانات اور تقریروں کے ذریعہ کانفرنس میں اپنے رویہ اور کام کی تشریح کی ہے ۔ اراکین نے اس بات کی شکایت کی ہے کہ ہندوستانی وفد ہی صرف ایسا تھا جس کا لیڈر دوسری قوم سے تعلق رکھتا تھا ۔ ظاہر ہے کہ کوئی وفد جس کا انتخاب کسی قومی حکومت نے نہ کیا ہو کبھی بھی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتا ۔ اس کانفرنس میں ہندوستانی نمائندوں کی طرف سے بعض تجاویز پیش کی گئیں ۔ افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ نمائندوں کی اکثریت نے ان تمام تجاویز کی مخالفت کی اور ہندوستانی وفد اپنی کوششوں میں ناکام رہا ۔ ہندوستانی نمائندے یہ چاہتے تھے کہ ذخیرہ زر کے مقاصد میں غیر ترقی یافتہ ممالک کی صنعتی ترقی میں مدد دینا بھی شامل کر لیا جائے ۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ صرف تجارت بین الاقوام کو فروغ ہونے سے ہندوستان جیسے ممالک میں صنعتی ترقی نہیں ہو سکے گی اور عوام کا معیار زندگی بلند نہیں کیا جا سکے گا ۔ ان ممالک کی صنعتی ترقی سے دوسرے ممالک کو بجائے نقصان کے فائدہ حاصل ہوگا ۔ غیر سرکاری نمائندوں کا بیان ہے کہ دوسرے ممالک کے نمائندوں نے ان کے اس خیال سے ہمدردی کا اظہار ضرور کیا لیکن اس کے باوجود انھیں ناکامی اٹھانی پڑی ۔

جنگی حالات کی وجہ سے لندن میں ہندوستان کے غیر معمولی اسٹرلنگ فاضلات جمع ہو جانے کے سلسلہ میں دوسری تجویز پیش کی گئی تھی ۔ یہ مطالبہ کیا گیا کہ ان فاضلات کو بھی ذخیرہ زر میں شامل کر لینا چاہیے تاکہ ہندوستان والے ان فاضلات کے بدلے میں دوسرے ملکوں خاص طور پر امریکہ کا زر ڈالر حاصل کر کے صنعتی ترقی کے لیے ضروری اشیاء وغیرہ خرید سکیں ۔ خیال یہ ہے کہ جنگ کے ختم ہونے تک دوسرے ممالک کے

تقریباً ۱۲۰۰ ملین ڈالر کے برابر اسٹرلنگ فاضلات جمع ہو چکے ہوں گے جن کا ایک تہائی ہندوستان کی ملکیت ہوں گے ۔ ہندوستانی نمائندوں نے یہ دلیل پیش کی کہ اگر ان فاضلات کو ذخیرہ زر میں شامل نہ کیا گیا تو متعلقہ ممالک دو طرفہ معاہدوں کے ذریعہ سے اس اہم مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کریں گے ۔ جنگ کے بعد اس کی وجہ سے بہت سی مالیاتی دقتیں پیدا ہوں گی اور تجارت بین الاقوام کو نقصان پہنچے گا ۔ انگلستان، امریکہ اور فرانس کے نمائندوں نے اس تجویز کی مخالفت کی اور یہ کہا کہ ان فاضلات کو ذخیرہ زر میں شامل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ذخیرہ پر بہت زیادہ بار پڑے گا اور اس کا نظام اس بار کو برداشت نہیں کر سکے گا ۔ کانفرنس میں مخالفت کے رنگ کو دیکھ کر ہندوستانی وفد اس کے لیے بھی تیار تھا کہ کم سے کم ان فاضلات کا کچھ حصہ تو ذخیرہ زر کے توسط سے دوسرے زر میں تبدیل کرنے کی ہندوستان کو اجازت ضرور ملنی چاہیے ۔ ہندوستانی وفد کے اس مصالحتانہ رویہ کی بھی پروا نہیں کی گئی اور برطانوی نمائندوں نے یہ کہہ کر اس کو ٹال دیا کہ یہ مسئلہ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان دو طرفہ معاہدہ کے ذریعہ سے بڑی خوبی کے ساتھ طے پا سکتا ہے ۔

ہندوستانی نمائندوں کی طرف سے ذخیرہ میں ہندوستان کا زیادہ حصہ مقرر کرنے کے متعلق بھی مطالبہ بہت شد و مد کے ساتھ پیش کیا گیا تاکہ ہندوستان انتظامی بورڈ میں مستقل جگہ حاصل کر سکے ۔ حصہ کے لحاظ سے ہندوستان کو چھٹی جگہ ملتی ہے اور اس لیے بورڈ میں مستقل جگہ سے اسے محروم کر دیا گیا ۔ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حصہ مقرر کرتے وقت ممالک کی معاشی اہمیت کا خیال نہیں کیا گیا ۔ ہندوستان ہر لحاظ سے چین کے مقابلہ میں زیادہ معاشی اہمیت رکھتا ہے ۔ اس کے باوجود چین مستقل جگہ حاصل کر سکا اور ہندوستان ناکام رہا ۔ سیاسی مفاد نے یہ تصفیہ کیا کہ ہندوستان کو جو ایک آزاد ملک نہیں ہے مستقل جگہ حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ۔ امریکی نمائندوں نے ایک اور وجہ سے بھی اس سلسلہ میں ہندوستانی وفد کی مخالفت کی ۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ

برطانوی شہنشاہت کے دو مستقل نمائندے انتظامی بورڈ میں شریک ہوکر ان کے اقتدار کو نقصان پہنچائیں ۔ کانفرنس کی روئداد اس کی شہادت دیتی ہے کہ آزاد اقوام کی مجلس میں محکوموں کی آواز کی کوئی وقعت نہیں ہوتی ۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کے غیر سرکاری نمائندوں نے ہندوستانی مقدمہ کو بہت بہتر طریقہ سے کانفرنس کے سامنے پیش کیا ۔ ان پر یہ اعتراض ضرور ہو سکتا ہے کہ انھیں خاص طور پر جبکہ اسٹرلنگ فاضلات کے مسئلہ کو ٹال دیا گیا اور اسکیم میں عبوری دور کی دفعہ موجود ہے ۔ اختلافی نوٹ کے ساتھ معاہدہ پر دستخط کرنے چاہیے تھے بعض دوسرے ممالک کے نمائندوں نے اس رویہ کو اختیار کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے معاملہ پر دوبارہ غور کرنے کی گنجایش رکھی گئی ہے ۔ بغیر کسی قسم کے اختلافی نوٹ کے ہندوستان فی الحال اپنے اس حق کو بھی کھو چکا ہے ۔

اس وقت ملک میں اس سوال پر بحث ہو رہی ہے کہ آیا ہندوستان کو ذخیرہ زر اور عالمی بنک کی تنظیم میں شرکت کرنی چاہیے یا نہیں ؟ یہ مسئلہ مرکزی مقننہ میں پیش کیا جائے گا اور اس کے تصفیہ کے بعد حکومت ہند شرکت یا عدم شرکت کے متعلق طے کرے گی ۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تجارتی تعلقات کی وجہ سے کسی اہم بین الاقوامی تنظیم سے علیحدگی فائدے سے زیادہ نقصانات پہنچائے گی ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رہنا چاہیے کہ کسی ایسی تنظیم میں حصہ نہ لیا جائے جس کی وجہ سے نقصانات زیادہ پہنچیں اور کوئی ایسی ذمہ داری اپنے اوپر عائد نہ کر لینی چاہیے جو ہندوستانی معیشت کے لیے مضرت رساں ثابت ہو تصفیہ کرتے وقت مسئلہ کے ہر پہلو پر اچھی طرح سے سوچ بچار کر لینا چاہیے ۔ انتظار کرنا چاہیے کہ برطانیہ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ اس کے متعلق کیا تصفیہ کرتے ہیں ۔ ان دونوں ملکوں میں ذخیرہ زر کی بہت کافی مخالفت ہو رہی ہے اور دونوں ملکوں کی حکومتوں کو بہت کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ مشکل امر یہ ہے کہ ذخیرہ زر میں شرکت کے بعد ہی بین الاقوامی

بنک میں شرکت کی جاسکتی ہے ۔ موجودہ جنگ کے حالات نے ہندوستان کی حیثیت قطعی طور پر لین دار ملک کی بنادی ہے ۔ ذخیرہ زر میں شریک ہونے سے کچھ بہت زیادہ فوائد حاصل نہیں ہوں گے ۔ اس کے برخلاف شرکت کی وجہ سے بہت سی پابندیاں عائد کرلینی پڑیں گی۔ البتہ عالمی بنک کی تنظیم میں حصہ لینا ہندوستان کے لیے مفید ثابت ہوگا ۔ جنگ کے بعد ملک کی معاشی ترقی کے لیے بہت سے منصوبے تیار کیے جارہے ہیں ۔ ان منصوبوں کو کامیاب بنانے کے لیے دوسرے ممالک سے مشین ، خام اشیاء اور بامہارت محنت کی شکل میں امداد لینی ہوگی اور یہ امداد اس بنک کے توسط سے آسانی سے حاصل کی جاسکے گی ۔

دونوں اداروں میں شرکت سے پہلے ہندوستان کے اسٹرلنگ فاضلات کا مسئلہ ہماری حسب مرضی طے پانا ضروری ہے ۔ اس اہم مسئلہ کی تفصیلات بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ، البتہ اس کے متعلق چند ضروری باتوں کا تذکرہ کردینا چاہیے ۔ یہ اسٹرلنگ فاضلات حکومت برطانیہ کی جنگی ضروریات پوری کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ۔ حکومت ہند کا محکمۂ رسد ہر مہینے برطانوی فوجوں وغیرہ کے لیے کروڑوں روپیے کا سامان ہندوستانی بازاروں میں خریدتا ہے اور خریدکردہ اشیاء کی قیمت حکومت برطانیہ کی طرف سے اسٹرلنگ کے ذریعہ سے کی جاتی ہے ۔ یہ اسٹرلنگ لندن میں فاضلات کے طور پر جمع کردیے جاتے ہیں ۔ اسٹرلنگ فاضلات کی مقدار اب تقریباً ۱۲۰۰ کروڑ روپیے تک ہوگئی ہے ۔ حکومت ہند اسٹرلنگ فاضلات کو ریزرو بنک کے حوالے کردیتی ہے اور ریزرو بنک ان کے بدلے میں نوٹ جاری کرکے حکومت ہند کو دے دیتا ہے ۔ اسٹرلنگ فاضلات کے متعلق یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ برطانوی اخبارات میں منظم طریقہ پر پروپگنڈا ہوتا رہتا ہے ۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان نے اتحادی اقوام کی مصیبتوں کے دنوں میں اپنی تجارت خارجہ کو فروغ دے کر فاضلات کی اتنی بڑی مقدار جمع کرلی ہے ۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے ، مجبوراً دوسروں کی جنگی ضروریات پوری کرنے کی وجہ سے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کی چیزوں کی بہت بڑی مقداریں

ملک سے باہر بھیجنی پڑیں اور ملک میں اشیاء کی قلت اور گرانی پیدا ہوئی اور قحط کے حالات نمودار ہوئے۔ مزید براں چیزوں کی قیمت کی ادائی کے سلسلہ میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس نے ملک میں افراط زر کے حالات پیدا کر دئے ہیں۔ حکومت ہند نے حالات کو بہتر بنانے کے لیے نگرانی قیمت اور بعض دوسرے ذرائع بھی اختیار کئے لیکن شروع میں اسے پوری طرح ناکامی ہوئی۔ اس سلسلہ میں بعض اخبارات کی طرف سے یہ بھی بیان کیا گیا ہے جنگی مصارف کی تقسیم کے سلسلہ میں جو معاہدہ حکومت ہند اور حکومت برطانیہ کے درمیان نومبر ۱۹۳۹ء میں ہوا تھا اس وقت کے حالات کے لحاظ سے بالکل درست تھا۔ جنگ میں جاپان کی شرکت نے حالات کو بالکل بدل دیا ہے، اب ہندوستان کو براہ راست جنگی خطرات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہندوستان جنگی مصارف کے زیادہ بار کو خود ہی برداشت کرے۔ یہ دلیل کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتی۔ ہندوستانی قوم جنگ کے حقیقی بار کو برداشت کرنے میں کسی دوسری اتحادی قوم سے پیچھے نہیں ہے۔ اس کے علاوہ معاہدہ میں اتنی لچک پائی جاتی ہے کہ اس کے سلسلہ میں مختلف طریقے اختیار کر کے مصارف کا زیادہ بار ہندوستان کے کاندھوں پر بڑی آسانی سے منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ کسی دوسرے نئے معاہدہ کو قبول نہ کیا جائے جس میں زیادہ بار کو برداشت کرنے کے لیے کہا گیا ہو۔ انگلستان کے بعض ماہرین نے یہ بھی کہا ہے کہ ہندوستان میں افراط زر کے حالات کی وجہ سے قیمتیں کئی گنا بڑھ گئی ہیں اور برطانوی حکومت کے مصارف جنگ میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ جو لوگ اس خیال کو پیش کرتے ہیں وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ حکومت ہند کے محکمۂ رسد کی خریداری کنٹرول قیمتوں کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ ہندوستانی ریلیں وغیرہ بھی فوجی خدمات کو انجام دینے میں خاص رعایتیں کرتی ہیں۔ پھر اس بات کا بھی خیال رہنا چاہیے کہ افراط زر کے حالات پیدا ہونے کی ذمہ داری آخر کس پر ہے؟ لندن کے مشہور ہفتہ وار اخبار اکانمسٹ نے مشورہ دیا ہے کہ جنگ کے دوران میں ہندوستانی قوم

جنگ کے حقیقی بار کو مصائب کی شکل میں برداشت کر رہی ہے، اس لیے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان مصارف کو حکومت ہند کے مالیہ میں شامل کر لیا جائے اور ان کی پابجائی محاصل میں اضافہ کر کے اور قرضے حاصل کر کے کی جائے۔ یہ نیک مشورہ ہندوستانی قوم کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ ہر دو صورتوں میں حقیقی بار کو بالآخر ہندوستانی قوم ہی کو برداشت کرنا پڑے گا، لیکن اب جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس کی وجہ سے جنگ کے دوران کی مصیبتوں کی تلافی اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ ان فاضلات کو صحیح طریقہ سے کام میں لا کر صنعتی اور زرعی ترقی کی طرف قدم بڑھایا جائے اور ہندوستانی معیشت کی خامیوں کو جلد سے جلد دور کیا جائے۔

اسٹرلنگ فاضلات کے مسئلہ کے سلسلہ میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فاضلات ہندوستانی قوم نے بڑی مصیبتیں اٹھانے کے بعد حاصل کیے ہیں اور ان سے ہندوستانی مفاد کی خاطر بہتر سے بہتر کام لینا چاہیے۔ اب جبکہ ان فاضلات کو ذخیرہ زر میں شامل کرنے سے انکار کر دیا گیا ہے اس اہم مسئلہ کو ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان ایک معاہدہ کے ذریعہ سے ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ معاہدہ طے کرتے وقت ہندوستان کی سیاسی کمتری کا اثر نہ ہونا چاہیے، اور جو نمائندے منتخب کیے جائیں وہ بھی ہندوستان کے صحیح معنوں میں نمائندے ہوں۔ ان میں اتنی صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ اپنے ملک و قوم کی آواز کو پیش کر سکیں۔ موجودہ مرکزی حکومت کی ہیئت ترکیبی سے بہت کم توقع ہے کہ وہ واقعی صحیح قسم کے نمائندوں کا انتخاب کرے گی۔ اس کے لیے مرکز میں قومی حکومت کا قیام اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے۔

بین الاقوامی ذخیرہ زر کی اسکیم میں عبوری دور کی دفعہ ۱۴ کی موجودگی کی وجہ سے ہندوستان کے اسٹرلنگ فاضلات کا مسئلہ اور بھی زیادہ دقت طلب بن گیا ہے۔ اس دفعہ کے تحت شریک ہونے والے ممالک کو اس کی اجازت دی گئی ہے کہ اپنے یہاں کے خصوصی حالات کا خیال کرتے ہوئے جنگ کے بعد بھی

تین سے پانچ سال تک نگرانی تبادلہ اور اسی قسم کی دوسری پابندیاں برقرار رکھیں۔ اس کا اثر یہ پڑے گا کہ ہندوستان اپنے اسٹرلنگ فاضلات کو جنگ کے بعد بھی پانچ سال تک کسی دوسرے زر میں تبدیل نہیں کر سکے گا، کیونکہ یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ انگلستان اس دفعہ سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ ہمارے فاضلات میں مزید اضافہ ہوگا، اب ان کی مقدار تقریباً ۱۲۰۰ کروڑ روپیہ ہے۔ عبوری دَور کے ختم ہونے پر بڑھ کر ۱۵۰۰ کروڑ روپیہ ہو جائے گی۔ اس کے لیے جنگ کے دوران یا اس کے فوراً بعد ایسی تدابیر پر عمل ہونا چاہیے جن کی وجہ سے اسٹرلنگ فاضلات میں مزید اضافہ نہ ہو سکے۔ جب تک جنگ جاری ہے ایسی پالیسی اسی وقت اختیار کی جا سکتی ہے جبکہ حکومت برطانیہ اپنی خریداری کے طریقہ میں اہم تبدیلی کرے۔ حکومت برطانیہ کسی تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور موجودہ طریقہ ہی کو قائم رکھنا مناسب سمجھتی ہے۔ جنگ کے بعد اس قسم کی کوشش صرف اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جبکہ ہم اسٹرلنگ جتھہ کے ممالک سے زیادہ مال خریدیں اور اپنا کم مال فروخت کریں۔ دوسرے الفاظ میں ہم اپنے تجارتی تعلقات قائم کرنے میں برآمد دوسرے ممالک کو کریں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے تجارتی پالیسی میں بعض اہم تبدیلیوں کی ضرورت ہوگی۔ اسٹرلنگ سے روپیہ کے تعلق کو ختم کر کے ریزرو بنک کے دستور میں بعض اہم تبدیلیاں کرنی ہوں گی ہندوستانی تبادلہ بنک قائم کر کے ان کو فروغ دینا ہوگا۔ یہ تمام ایسی تبدیلیاں ہیں جن کے راستہ میں سیاسی دِقتیں حائل ہوں گی اور موجودہ حکومت شاید ان تبدیلیوں کی اجازت بھی نہ دے۔

اسٹرلنگ فاضلات کے مسئلہ کے فوری حل کے لیے یہ ضروری ہے کہ Empire Dollar Pool کے متعلق کوئی قطعی تصفیہ ہونا چاہیے۔ نگرانی تبادلہ کی پالیسی کے تحت حکومت برطانیہ نے یہ انتظامات کر رکھے ہیں کہ اسٹرلنگ جتھہ کے

ممالک سے برآمد شدہ مال اور سونے کے بدلے میں جو ڈالر حاصل ہوں ان کو قانوناً حکومت برطانیہ لے سکتی ہے تاکہ حاصل شدہ ڈالر سے جنگی ضروریات کی اشیا خریدی جاسکیں۔ ڈالر کے بدلے میں برآمد کرنے والے ملک کو حکومت برطانیہ کی طرف سے اسٹرلنگ ادا کر دیے جاتے ہیں۔ اس پول کے متعلق کسی قسم کی تفصیلات نہیں بتلائی جاتیں۔ جنگی راز کا عذر پیش کر کے مسئلہ کو ٹالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حکومت امریکہ جبکہ پٹہ اور قرضہ جیسے اہم قانون کے متعلق باقاعدہ طریقہ سے رپورٹ شائع کرنے میں کوئی نقصان نہیں سمجھتی تو پول کی تفصیلات بتلانے میں کونسا امر مانع ہوسکتا ہے۔ تفصیلی معلومات فراہم کرنے کے بعد اس پول کو جلد سے جلد ختم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے اور جنگ کے فوراً بعد یا اگر ہوسکے تو اس سے قبل ہی مختلف ممالک کو ان کے مال کی برآمد کی نسبت سے حصہ ملنا چاہیے تاکہ یہ ممالک امریکہ سے اپنی ضروریات کی چیزیں خریدنے کے قابل ہوسکیں۔

اسٹرلنگ فاضلات کے تصفیہ کے سلسلہ میں جو معاہدہ حکومت ہند اور حکومت برطانیہ کے درمیان ہو، اس کو طے کرتے وقت دونوں ممالک کے نمائندوں کو بعض اہم امور کا خیال رکھنا پڑے گا۔ ہندوستان اس کا مطالبہ پیش نہیں کرسکتا کہ ان فاضلات کی ادائی صرف چند سالوں میں ہو جائے۔ جنگ کے حالات کی وجہ سے برطانوی معیشت میں بہت سی بے ترتیبیاں پیدا ہوگئی ہیں جن کو دور کرنے میں کچھ مدت لگے گی اور وہ فوراً اس قابل نہیں ہوسکے گی کہ زائد برآمد کر کے فاضلات کی اتنی بڑی مقدار کی ادائی کرسکے۔ اس کے علاوہ خود ہندوستان کا مفاد اس میں ہے کہ وہ ان فاضلات کے بدلے میں چیزیں حاصل کرنے میں جلدی نہ کرے۔ ان فاضلات سے صنعتی اور زرعی ترقی کے سلسلہ میں کام لیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ صنعتی اور زرعی ترقی صرف دو چار سال میں نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح سے انگلستان کا یہ مطالبہ کہ وہ ان کی ادائی ۲۵ یا ۳۰ سال میں کرے گا، ہندوستان کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں ملک کی معاشی منصوبہ بندی کو جس کا مرکزی مقصد عوام کا

معیار زندگی بلند کرنا ہے، ایک طویل مدت کے لیے ملتوی کرنا پڑے گا۔ فاضلات کی ادائی کے لیے کوئی ایسی مدت کا تعین ہونا چاہیے جو دونوں ملکوں کے لیے قابل قبول ہو سکے۔

ہندوستانی نمائندے اس کے لیے بھی تیار نہ ہوں گے کہ اسٹرلنگ فاضلات کی تمام کی تمام رقم انگلستان یا اسٹرلنگ جتھ کے ممالک میں صرف کرکے ہندوستان اپنی ضروریات کی اشیاء پیدائش خریدے۔ ایسی صورت میں اسٹرلنگ جتھ کے ممالک خاص طور پر انگلستان والوں کی حیثیت اجارہ دارانہ ہو جائے گی اور وہ جس قسم کی چیزیں اور جس قیمت پر چاہیں فروخت کرکے ہندوستان کو خریدنے پر مجبور کریں گے۔ اس دقت کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کو اس کی آزادی حاصل رہے کہ وہ اپنے فاضلات کو دوسرے زر میں تبدیل کرکے امریکی یا یورپی بازاروں میں اشیاء خرید سکے۔ بین الاقوامی بنک کے توسط سے اس مسئلہ کو بہتر طریقہ پر حل کیا جا سکتا ہے۔ بنک کے دستور میں یہ دفعہ رکھی گئی ہے کہ کوئی لین دار ملک اپنے فاضلات کو دوسرے زر میں تبدیل کرنے کا مطالبہ نہیں کر سکے گا۔ لیکن اس دفعہ کا دین دار ممالک پر اطلاق نہیں ہوگا۔ انگلستان اپنی ساکھ کی بنا پر بنک سے قرضے لیے اور اپنے لین دار ممالک کو ان قرضوں کی رقم منتقل کر دے۔ لین دار ممالک ان قرضوں کی رقم کو صرف کرکے اپنی ضروریات کی چیزیں حاصل کر سکیں گے۔ بنک کو اس قسم کی کارروائی پر اعتراض یوں نہیں ہو سکتا کہ حاصل شدہ قرضوں کی رقمیں ممالک کی معاشی ترقی پر صرف کی جائیں گی۔ ہندوستان جیسے ممالک جو اس طرح سے قرضے حاصل کریں گے، انھیں اگر ایک طرف قرضوں پر سود ادا کرنا پڑے گا تو دوسری طرف دین دار ممالک سے انھیں ان کے فاضلات پر سود وصول بھی ہوگا۔ بعد میں دین دار ممالک ان قرضوں کی رقموں کو واپس کرتے رہیں گے۔

ہندوستان جیسے ممالک کے لیے بیرونی زر حاصل کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انگلستان بیرونی ممالک میں اپنے لگے ہوئے سرمایہ کی تمسکات کو

اپنے لین دار ممالک کے حوالہ کر دے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ جنگ کے ختم ہونے پر اس قسم کی تمسکات کی مالیت ...۳ ملین پونڈ ہوگی اور دوسرے ممالک کے قرضوں کی مالیت...۲۰ ملین پونڈ۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمسکات دے کر اپنے قرضوں کی ادائی کرنے کے لیے انگلستان والے ذرا مشکل سے تیار رہوں گے۔ معاشی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو فائدہ اس میں ہے کہ اسی طرح سے ادائی کر دی جائے۔ تمسکات دینے سے ان کی بیرونی ذرائع سے آمدنی میں کمی ضرور ہو جائے گی لیکن دوسروں کا مقروض ہونے کی وجہ سے انھیں سود ادا کرنا پڑے گا، اور چونکہ ان فاضلات کی حیثیت کم معیادی قرضوں کی سی ہے، سود کے علاوہ سالانہ ایک خاصی رقم ان کی ادائی کے سلسلہ میں دینا پڑے گی۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بحیثیت مجموعی برطانیہ کا نقصان نہیں بلکہ فائدہ اس میں ہے کہ تمسکات کے ذریعہ سے قرضے ادا کر دیے جائیں۔ لین دار ممالک ان تمسکات کو فروخت کر کے دوسرے ممالک کا زر حاصل کر سکیں گے اور اس طرح اسٹرلنگ فاضلات کو دوسرے زر میں تبدیل کرنے کی ایک سبیل نکل آئے گی۔ ہندوستان کو اگر ان تمسکات کا ۱۵ یا ۲۰ فیصد ہی مل جائے تو اس کی ضروریات کے لیے کافی ہوگا۔

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان اپنے تمام فاضلات کو ڈالر یا کسی دوسرے زر میں تبدیل کرنے کا مطالبہ نہیں کر سکتا، البتہ ان کے ایک خاص حصہ کو بدلنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ بقیہ فاضلات کے لیے انگلستان اور ہندوستان آپس میں معاہدہ کریں گے کہ وہ کس طرح سے ادا کیے جائیں۔ انگلستان کو ایسی چیزیں دینی چاہئیں جن کی ہندوستان کو ضرورت ہے، اور جن کی درآمد سے ہندوستانی معیشت پر برا اثر نہیں پڑے گا۔ ایسی اشیاء صرف جن کی درآمد سے ہندوستانی صنعتوں کو نقصان پہنچے، قبول نہیں کی جا سکتی ہیں۔ اور نہ پرانی اور ناکارہ مشینوں کو لینے کے لیے تیار رہونا چاہیے۔ دونوں طرف سے نیک نیتی سے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

برطانوی اخبارات میں اسٹرلنگ فاضلات کے متعلق پروپگنڈے کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہو چلے ہیں۔ لارڈ کینس، بین الاقوامی کانفرنس میں ہندوستانی نمائندوں کو اس کا یقین دلا چکے ہیں کہ انگلستان اپنے قرضوں کی ادائی کرنے کے لیے تیار اور اس کی نیت بالکل صاف ہے۔ خدا کرے کہ حکومت برطانیہ لارڈ کینس کے الفاظ کا پاس کرے اور کوئی ایسی کارروائی نہ کی جائے جس کا مقصد ہندوستانی قوم کو دھوکا دینا اور نقصان پہنچانا ہو۔ ہندوستانی قوم نے ان فاضلات کو بڑی مصیبتیں جھیلنے کے بعد حاصل کیا ہے۔ انگلستان والے بڑی آسانی سے ان قرضوں کی ادائی کر سکتے ہیں۔ پچھلے پانچ سال کے عرصہ میں برطانوی معیشت نے بڑی ترقی کی ہے اور اس کی قوت پیداآوری میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے کارخانوں کی کارکردگی بڑھ گئی ہے۔ مزدوروں پر جنگ کا بہت کم اثر ہوا ہے اور فنی تربیت کی وجہ سے ان کی قوت پیداآوری میں کافی اضافہ ہو چکا ہے۔ قومی معیشت کو نئی تنظیم دینے کے بعد اور جنگی معیشت کو امن کی معیشت میں تبدیل کرکے ان قرضوں کی ادائی کرنے میں کچھ بھی دقت اٹھانی نہیں پڑے گی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر اپنی قومی آمدنی کا صرف ایک فیصد ہندوستان کو انگلستان والے دیں تو ہندوستان کے فاضلات کی ادائی ہو سکتی ہے۔

اسٹرلنگ سے روپیہ کے تعلق کا مسئلہ بھی ہندوستانی زر کے مستقبل کے سلسلہ میں پیدا ہوگا۔ یہ تعلق ہندوستان کی محکومی کا نتیجہ ہے۔ اس کو برقرار رکھنے کی حمایت میں سب سے اہم دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ ہندوستان کے انگلستان سے مالیاتی اور تجارتی تعلقات بہت زیادہ ہیں اور مطالبات وطن کے تحت بہت بڑی رقم انگلستان والوں کو ادا کرنی پڑتی ہے جنگی حالات نے ان تعلقات کی اہمیت میں کمی کر دی ہے اور ان کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے۔ اب ہندوستان لین دار ملک بن گیا ہے اور اس لیے اس دلیل میں کوئی وزن باقی

نہیں رہا۔ دنیا کے کسی اہم زر سے تعلق قائم رکھنے میں کوئی ہرج نہیں۔ معیار طلاء کے ختم ہونے کے بعد سے دنیا میں زر کے مختلف جتھے قائم ہوئے اور بہت سے ممالک نے کسی ایک گروپ میں شرکت کرلی لیکن شرکت کرتے وقت انھیں پوری آزادی تھی کہ جب وہ چاہیں علیحدہ ہو جائیں اور جو شرح تبادلہ مناسب سمجھیں قائم کریں۔ ہندوستان کو دونوں قسم کی آزادی حاصل نہیں تھی۔ اسٹرلنگ جتھہ میں شرکت پر اسے مجبور کیا گیا اور شرح ایسی مقرر کی گئی جس کی وجہ سے ہندوستانی معیشت کو نقصانات پہنچے۔ موجودہ جنگ کے دوران میں اسٹرلنگ سے روپیہ کے تعلق کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ ہمیں اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ افراط زر کے حالات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اگر یہ تعلق نہ ہوتا اور ہندوستان کے ریزرو بنک کے دستور میں نوٹ جاری کرنے کے لیے اسٹرلنگ تمسکات نہ رکھی جاتیں تو انگلستان کو ہندوستانی اشیاء خریدنے کے سلسلہ میں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑتا جس کی وجہ سے افراط زر کے حالات اتنی بُری طرح سے نمودار نہ ہوتے جیسے کہ اب ہوئے ہیں۔ جنگ کے بعد حکومت ہند کو یہ طے کرنا ہوگا کہ یہ تعلق قائم رہے یا اس کو ختم کر دیا جائے؟ بین الاقوامی ذخیرہ زر کے قیام اور حالات کے بدل جانے کی وجہ سے اس کے قیام کی فی الحال کوئی ضرورت نظر نہیں آتی۔ ریزرو بنک کے دستور میں یہ دفعہ موجود ہے کہ بین الاقوامی حالات درست ہونے کی صورت میں وہ حکومت کو مشورہ دے کہ کس قسم کا نظام زر قائم کیا جائے۔ ریزرو بنک کو اپنی ماہرانہ رائے بغیر کسی قسم کے دباؤ کے پیش کرنا چاہیے اور ہندوستانی قوم کو نظام زر کے معاملات میں پوری آزادی ملنی چاہیے۔

اگر ہندوستان اسٹرلنگ سے روپیہ کا تعلق برقرار رکھنے ہی میں اپنا مفاد پاتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ یہ تعلق موجودہ شرح کے لحاظ ہی سے قائم رکھا جائے۔ اس سلسلہ میں روپیہ کی اندرونی اور بیرونی قدر کے دقت طلب مسئلہ سے بحث کرنی ہوگی۔ اندرونی قدر سے مراد یہ ہے کہ کونسی سطح پر اندرونی قیمتوں کو استحکام دیا جائے۔ بیرونی

قدر سے مراد شرح تبادلہ ہے ۔جنگ کے حالات نے مختلف ممالک کی قیمتوں میں بہت
زیادہ فرق پیدا کر دیا ہے ۔موجودہ جنگ شروع ہونے سے پہلے بھی ممالک کی معاشی
قومیت کی پالیسی نے دنیا کی قیمتوں کے نظام میں کوئی خاص تعلق برقرار نہیں رکھا تھا۔
اب جنگ کی وجہ سے بہت زیادہ تفاوت پیدا ہو گیا ہے ۔بعض ممالک کی جس میں خاص طور پر
مشرق قریب کے ممالک ہیں اور ہندوستان شامل ہے قیمتوں کی سطح بہت زیادہ بلند
ہو گئی ہے ۔یورپ میں جرمنی کے مقبوضہ ممالک میں بھی قیمتوں میں خاص اضافہ ہوا ہے۔
اتحادی اور محوری ممالک کی قیمتیں بہت کم بڑھی ہیں ۔محوری ممالک کے متعلق زیادہ صحیح
اعداد و شمار نہیں ملتے ہیں ،البتہ تھوڑا بہت اندازہ شائع شدہ اعداد و شمار سے ضرور
ہو سکتا ہے ۔ان کے یہاں قیمتوں میں کم اضافہ کا اہم سبب یہ ہے کہ وہاں جنگی معیشت
جنگ شروع ہونے سے بہت پہلے قائم کی جا چکی تھی ۔اتحادی ممالک کی قیمتوں بہت زیادہ
اضافہ نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں جنگی معیشت کو بڑی خوبی سے قائم کیا گیا ہے
اور مختلف معاشی کنٹرول قائم کرنے میں حکومت کو بہت زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔
جنگ کے ختم ہونے پر مختلف ممالک کی قیمتوں کا موجودہ فرق قائم نہیں رہ سکتا ۔ایسی
صورت میں جن ممالک کی قیمتوں اور مصارف کی سطح زیادہ ہو گی ان کی تجارت خارجہ کو
نقصان پہنچے گا ، اور ان کا مال کم مصارف والے ممالک کی چیزوں کا مقابلہ نہیں
کر سکے گا ۔اس لیے یہ مسئلہ درپیش ہو گا کہ قیمتوں کو کس سطح پر استحکام دیا جائے ۔قطعی طور پر
ابھی سے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ قیمتوں کا استحکام کس سطح پر زیادہ مفید ثابت ہو گا ۔ہمیں
یہ دیکھنا پڑے گا کہ ہمارے تجارتی تعلقات کن ممالک سے زیادہ ہیں اور ان میں قیمتوں
اور مصارف کے کیا رجحانات رہتے ہیں ۔قیمتوں کے ٹھہراؤ کے سلسلہ میں ایک بات کا
تذکرہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔جنگ عظیم کے بعد جنگ سے پہلے کی قیمتوں کی سطح کو
معیاری سمجھا گیا تھا ۔اور اکثر ممالک میں قیمتوں کو اس سطح پر لانے کی کوشش کی گئی تھی۔
موجودہ جنگ سے پہلے والی قیمتوں کو کسی طرح سے بھی معیاری نہیں کہا جا سکتا ۔اکثر ممالک میں

جنگ شروع ہونے تک عالمی کساد بازاری کے اثرات موجود تھے۔ ہندوستان میں قیمتوں کی سطح اور بھی کم تھی، اور اس سطح کو دوبارہ قائم کرنا کسی طرح سے بھی موزوں نہیں ہوگا۔ اس کے مقابلہ میں بعض حضرات نے جنگ کے بعد بھی قیمتوں کی موجودہ سطح کو برقرار رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ ان کی رائے میں تجارت خارجہ میں توازن روپیہ کی بیرونی قدر کو کم کرکے کیا جا سکتا ہے۔ اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم افراط زر کے موجودہ حالات کو قبول کرلیں، اور معاشرہ کے ایسے طبقات کی جن کی آمدنی معین ہے، حالت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تباہ کردیں۔ قیمتوں کی پالیسی اختیار کرتے وقت معاشرہ کے مختلف طبقات کا خیال رکھنا ہوگا، اور ایسی پالیسی پر عمل ہونا چاہیے جو اکثریت کے لیے مفید ہو۔ جنگ سے پہلے والی قیمتوں اور موجودہ قیمتوں کی کسی درمیانی سطح پر استحکام دینا مناسب ہوگا۔ جنگ سے پہلے کے مقابلہ میں قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے زرعی طبقہ بھی منافع کما سکے گا، اور نئے نئے مواقع پیدا ہونے کی وجہ سے متوسط الحال طبقہ کی آمدنی بڑھے گی اور وہ زیادہ قیمت ادا کرتے وقت زیادہ محسوس نہیں کرے گا۔ یہی خیال مصنوعات کی قیمتوں کے تعین کے وقت بھی پیش نظر رہے۔ مصنوعات کی قیمتوں کی کوئی ایسی سطح دریافت کی جائے جس پر مصنوعات تیار کرنے والے منافع کما سکیں اور صارفین بھی اس قیمت کو آسانی سے ادا کرسکیں۔ قیمتوں کو استحکام دینے کی پالیسی کے ساتھ ساتھ زراعت اور صنعت میں مصارف کی سطح کو بھی کم کرنا چاہیے۔ مصارف کی کمی کی وجہ سے قیمت خود بخود کم ہو جائے گی اور زرعی اور آج طبقہ منافع کما سکے گا۔ زراعت میں فنی طریقوں کو اختیار کرکے اور صنعت میں سرمایہ کی مقدار کو بڑھا کر اور نئی نئی ایجادات اور مشینوں سے کام لے کر مصارف میں بہت کچھ کمی کی جا سکتی ہے۔

روپیہ کی بیرونی قدر کا مسئلہ قیمتوں کی سطح کو استحکام دینے سے بھی زیادہ دقت طلب ہے۔ شرح تبادلہ کے متعلق ماہرین نے اپنی رائے کا اظہار شروع کردیا ہے۔ بعض ماہرین نے نظریۂ مساوات قوت خرید کے مطابق مختلف ممالک، خاص طور پر

امریکہ اور برطانیہ کی قیمتوں کا ہندوستان کی قیمتوں سے مقابلہ کرکے موزوں شرح معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان میں قیمتوں کی سطح ان دونوں ملکوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے اور موجودہ شرح تبادلہ کسی طرح سے موزوں نہیں۔ جنگ کے حالات ہی اس کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ جنگ کے ختم پر روپیہ کو کم قدر کرنا ہوگا۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ روپیہ کی شرح اگر ایک شلنگ مقرر کی جائے تو مناسب ہے۔ نظریۂ مساوات قوت خرید پر اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے حالات کا صحیح صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اور موزوں شرح کا معلوم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ موزوں شرح تبادلہ کا تعین بہت سے اثرات کرتے ہیں جن کا اظہار محض چند اعداد و شمار کے ذریعہ سے نہیں کیا جاسکتا۔ بعض دوسرے ماہرین کا خیال ہے کہ شرح تبادلہ کو بڑھا کر دو شلنگ مقرر کرنا چاہیے۔ شرح تبادلہ کو کم کرنے اور بڑھانے میں نقصانات بھی ہیں اور فوائد بھی۔ نقصانات اور فوائد کا آپس میں مقابلہ کرنے اور کافی غور و خوض کے بعد شرح تبادلہ کا تعین ہونا چاہیے۔ شرح تبادلہ بڑھانے کی وجہ سے بیرونی ممالک سے مشین وغیرہ سستی حاصل کی جاسکیں گی اور صنعتی ترقی کرنے میں مدد ملے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کی ضروریات کی بدیسی چیزیں بھی سستی ہوں گی اور ان کی درآمد بڑھ جائے گی۔ دیسی صنعتیں بیرونی مال کا مقابلہ نہیں کرسکیں گی۔ بہت سی ایسی صنعتیں جنھوں نے جنگ کے دوران میں ترقی کی، تباہ ہو جائیں گی۔ ایسی صورت میں سستی مشینوں وغیرہ کی درآمد سے کیا حاصل۔ زرعی اجناس پیدا کرنے والے بھی بیرونی اجناس کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے اور بیرونی بازار ان کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے ممالک کے کاشتکاروں کے ہاتھوں میں آجائیں گے۔ شرح تبادلہ میں کمی کا اتنا اثر ضرور ہوگا کہ مشینوں اور با مہارت محنت وغیرہ کی قیمت زیادہ ادا کرنی پڑے گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ بیرونی مال بھی مہنگا ہوگا اور ان کی درآمد گھٹ جائے گی۔ ہندوستانی صنعتوں کو

ایک طرح سے تامین حاصل ہو جائے گی۔ اور بیرونی ممالک میں بھی ہمارے صناع ترقی یافتہ ممالک کی مصنوعات کے مقابلہ میں اپنی چیزیں فروخت کرنے میں آسانی محسوس کریں گے اور زرعی اجناس تیار کرنے والوں کو بھی دوسرے ممالک میں اپنا مال فروخت کرنے میں سہولت ہو گی ۔غرض شرح تبادلہ میں اضافہ کی کسی طرح سے بھی حمایت نہیں کی جاسکتی ۔شرح تبادلہ میں کمی بہت ضروری ہے ۔لیکن کتنی کمی کی جائے، اس کا تصفیہ ابھی سے کرنا بہت مشکل ہے۔ ہمیں اس کا انتظار کرنا چاہیے کہ اسٹرلنگ اور ڈالر کے درمیان کیا شرح تبادلہ مقرر کی جاتی ہے اور دُنیا کے بازار پر اس کے کیا اثرات پڑتے ہیں ۔ دوسرے جنگ کے بعد مختلف ممالک کی معاشی پالیسی کس قسم کی رہتی ہے اور کیا حالات رہتے ہیں ۔

مستقبل میں ہندوستانی زر کے جو مسائل پیدا ہوں گے ان کو حل کرنے کے لیے ماہرین کا مشورہ بہت ضروری ہے ۔ ماہرین کی رائے ہے کہ ہندوستان کو کسی ایسی تنظیم میں شریک نہیں ہونا چاہیے جس میں اسے اس کی معاشی اہمیت کے لحاظ سے جگہ نہ دی گئی ہو بین الاقوامی ذخیرہ زر اور عالمی بنک، ہر دو کی مجلس نظماء میں مستقل جگہ پانے کا ہندوستان ہر حیثیت سے مستحق ہے اور اس کا مطالبہ حکومت ہند کی طرف سے شد و مد کے ساتھ کیا جائے۔ مالی کانفرنس میں جو تصفیے ہوئے ہیں، ان میں قطعیت نہیں پائی جاتی ، ان میں تبدیلی کی جاسکتی ہے ۔ ہندوستان کو اسٹرلنگ سے روپیہ کے تعلق اور شرح تبادلہ کے سلسلہ میں پوری پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے۔اسٹرلنگ فاضلات کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے بھی کوئی ایسا معاہدہ ہو جس کی وجہ سے ہندوستانی معیشت کے عدم توازن کو دُور کر کے متوازن معیشت قائم کی جاسکے ۔غرض زر کی جو بھی پالیسی اختیار کی جائے اس کا مرکزی مقصد معاشی منصوبہ بندی کو کامیاب بنانا ہو، تاکہ ہندوستانی عوام انسانوں جیسی زندگی گذارنے کے قابل بن سکیں

تنقید و تبصرہ

اقبال کا آرٹ اور فلسفہ Igbal: His Art and thought

مصنفہ سید عبدالواحد بی۔ ایس سی۔ بی۔ اے (آکسن)
ناشر شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور قیمت چھ روپے

اقبال کی زندگی اور ان کے فلسفہ و شاعری سے متعلق یکجا طور پر جہاں تک مجھے علم ہے زیر تبصرہ کتاب کے علاوہ انگریزی زبان میں اب تک دو ہی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ایک تو لاہور کے شیخ اکبر علی صاحب نے ۱۹۳۲ء میں "اقبال کی شاعری اور پیام" کے نام سے اور دوسری عبداللہ انور بیگ صاحب نے "شاعر مشرق" کے نام سے ۱۹۳۹ء میں شائع کی جس پر ڈاکٹر نکلسن کا پیش لفظ تھا۔ گویا اس لحاظ سے عبدالواحد صاحب کی یہ کتاب ایک تیسرا اضافہ ہے، لیکن یہ اضافہ معلوماتی حیثیت سے کہیں بڑھ کر تعدادی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے کہ اس میں کوئی خاص ایسی نئی باتیں نہیں بیان کی گئی ہیں جن سے معلومات میں قابل قدر اضافہ ہو، البتہ زبان اور طرز بیان وغیرہ کے اعتبار سے یہ کتاب دوسری کتابوں کے مقابلے میں بہتر ہے اور اس کے مطالعہ سے ایسے حضرات جنھوں نے اب تک اردو یا انگریزی میں دیگر کتابوں یا مضامین وغیرہ کا مطالعہ نہیں کیا ہے خاص طور پر مفید ہو سکتے ہیں۔

کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب حالات زندگی پر ہے لیکن اس میں

ایسے واردات اور محاضرات کا بہت ہی کم ذکر ہے جو کسی سوانح حیات کے لیے ضروری شمار کیے جاتے ہیں اور اس کو دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ دوسرے باب میں فلسفۂ خودی کی مناسب تشریح کی گئی ہے اور اس سلسلے میں خودی کی تعمیر و ترقی اور لوازم سے بحث کرتے ہوئے بے خودی، یعنی فلسفۂ معاشرت پر بھی کچھ روشنی ڈالی گئی ہے اس کے بعد کے دو ابواب میں علی الترتیب مشرقی اور مغربی افکار اور اقبال کے خیالات کا مقابلہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اقبال اپنے فلسفیانہ خیالات میں کن کن مشرقی اور مغربی مفکروں سے کس حد تک مماثلت رکھتے ہیں اور ان میں کس قسم کا فرق پایا جاتا ہے۔ پانچویں اور چھٹویں باب میں اقبال کے شاعرانہ آرٹ اور تغزل پر بحث کی گئی ہے۔ آرٹ برائے آرٹ کے بجائے آرٹ برائے زندگی کے مسلک کی تشریح اور شاعرانہ حسن کاری اور تغزل کی خوبیوں کی توضیح کے ساتھ ساتھ اقبال کی جدت طرازیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتویں باب میں اقبال کی مثنویوں کا ذکر ہے جس میں "جاوید نامہ" کی خاص طور پر صراحت کی گئی ہے، لیکن "ساقی نامہ" جیسی قابل ذکر اردو مثنوی کا کوئی خاص ذکر نہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کی خوبیوں کی بھی کچھ تصریح کر دی جاتی۔ آخری باب اقبال کی اردو اور انگریزی نثریات کے تذکرے پر مشتمل ہے جس میں اردو کے بعض مضامین اور خطوط کے اقتباس دئے گئے ہیں اور "ایرانی الہیات" اور "تشکیل جدید الہیات اسلامی" جو انگریزی زبان میں ہے، اس کا تعارف کرایا گیا ہے۔

مصنف نے اقبال کے خیالات اور مغربی افکار کے سلسلے میں اس عام خیال کی بڑی دقیقہ سنجی کے ساتھ تردید کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال اور نطشہ کے خیالات مماثل ہیں اور اقبال کا "انسانِ کامل" نطشہ کے فوق البشر سے ماخوذ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال اور نطشہ کے فلسفیانہ خیالات نہ تو بالکل مماثل ہیں اور نہ اقبال انسان کامل کے تصور میں نطشہ کے مرہون منت ہیں جیسا کہ انھوں نے

خود بھی ڈاکٹر نکلسن کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل انسان کامل کے فلسفیانہ تصور پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب نہ تو نطشہ کے عقاید کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا اور نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گذری تھیں ۔" لیکن مصنف کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ " مغربی مفکرین میں صرف فشتے، برگسان اور آئن اشٹائن سے مماثلت پائی جاتی ہے اور نطشہ سے کوئی مماثلت نہیں ۔" اقبال جس طرح ارتقائے انسانی اور فلسفۂ سعی و عمل میں بالکلیہ نطشہ کے ہم خیال نہیں، اسی طرح فلسفۂ زمان و مکان میں برگسان یا آئن آشٹائن سے بھی بالکلیہ متفق نہیں ۔ لہٰذا قطعیت کے ساتھ فیصلہ کر دینا کہ اقبال اپنے فلسفیانہ خیالات میں محض فشتے، برگسان اور آئن آشٹائن سے موافقت رکھتے ہیں اور نطشہ کے بالکل مغائر ہیں، درست نہیں معلوم ہوتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ اقبال اپنے فلسفے میں دیگر مفکرین سے اسی نقطہ پر علٰحدہ ہو جاتے ہیں جو قرآنی روح اور اسلامی عقاید کے خلاف ہوتا ہے، یا انسان کی عمرانی فلاح و ترقی اور تسکین حیات کے مغائر نظر آتا ہے ۔ چنانچہ اقبال کا انسان کامل نطشہ کے فوق البشر کی اسی اعتبار سے ایک اصلاح یافتہ شکل ہے جس میں بعض مماثلت کے ساتھ دیگر ایسی خصوصیتیں بھی ہیں جو نطشہ کے یہاں نہیں ہیں اور اپنے اندر عمرانی اہمیت رکھتی ہیں ۔ اسی طرح اقبال اور برگسان کے فلسفۂ کائنات میں بہت کچھ مماثلت کے باوجود خاص فرق یہ ہے کہ اول الذکر کائنات کو بامقصد سمجھتے اور اس کے ارتقائی اظہار کو از خود نہیں بلکہ ایک خاص معنی میں بااراده اور فعلیت مطلقہ کا منشا قرار دیتے ہیں جو اسلامی الٰہیات کے مطابق نظر آتا ہے ۔ لہٰذا جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ کہ اقبال فلسفۂ خودی اور زمانہ کے تخیل میں بنیادی طور پر فشتے اور برگسان سے زیادہ متفق ہیں اور انسان کامل کے تصور میں نطشہ سے چند خاص باتوں ہی میں ہم خیال ہیں ۔

کتاب کے بقیہ مباحث میں جن باتوں کا ذکر ہے وہ لائقِ تسلیم ہیں لیکن اس کتاب کے لکھنے میں مصنف کی ایک خاص بات قابل اعتراض ہے جس کا ذکر نامناسب نہیں، یعنی کتاب میں اکثر و بیشتر ماخوذ خیالات اور عبارتوں کا نہ تو کوئی حوالہ دیا گیا ہے اور نہ دیباچے میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ کن کن کتابوں سے مصنف نے خاص طور پر مدد لی ہے ۔ اقبال کی شاعری میں جس قسم کا آرٹ پایا جاتا ہے اس سے خاص طور پر دو کتابوں میں بحث کی گئی ہے ۔ ایک تو شیخ اکبر علی صاحب کی مذکورۂ بالا کتاب اور دوسری ڈاکٹر یوسف حسن خاں صاحب کی کتاب "روح اقبال" جس میں اقبال اور آرٹ کے عنوان کے تحت نہایت عمدہ اور بڑی حد تک سیر حاصل بحث موجود ہے ۔ عبدالواحد صاحب نے اس سلسلے میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ زیادہ تر روح اقبال ہی سے ماخوذ ہے ۔ بہت ساری مثالیں اور تشریحات وہی ہیں جو ڈاکٹر صاحب موصوف نے پیش کی ہیں مثلاً صفحہ ۵۸۔ ۴۵ پر رمزیت اور رومانیت کے عناصر سے جو بحث کی گئی ہے وہ مع مثال "روح اقبال" صفحہ ۵۱ ۔ ۵۲ ۔ ۶۳ تا ۶۶ سے ماخوذ ہے ۔ نیز رومانیت کے سلسلے میں شیطان کا جو کردار ہے اس پر جس طرح بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے جو جو اشعار بطور مثال پیش کئے ہیں وہ سب کے سب اس ترتیب کے ساتھ عبدالواحد صاحب نے بھی بیان کر دئے ہیں ۔ اسی طرح صفحہ ۱۶۳ پر آرٹ کی ایمائی خوبیوں کا جو ذکر ہے وہ روح اقبال صفحہ ۷۸ سے ماخوذ ہے اور مثال میں وہی نغمہ سازیاں والی نظم کے چند بند پیش کئے گئے ہیں جس کا پہلا مصرعہ "تا قفہ سیار من آ ہوئے تاتار من" ہے ۔ صفحہ ۱۶۷ پر ایک اور رومانی موضوع، یعنی "حور اور شاعر" والی نظم کا تذکرہ بھی بالکل ڈاکٹر صاحب کی کتاب کے صفحہ ۷۲ کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے ۔ صفحہ ۵ ۔ ۱۷۴ پر فطرت کی مصوری کے سلسلے میں دونوں مثالیں وہی ہیں جو روح اقبال کے صفحہ ۷۸ ۔ ۸۶ پر ہیں، یعنی ؎

رُخت یہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر		الخ	الخ
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں		"

اقبال کے شاعرانہ آرٹ کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اکثر الفاظ کی صوت سے کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً قندھار کے کوہستانی علاقے کی کیفیت کی اس طرح تصویر کھینچی گئی ہے۔

رنگ ہا بو ہا ہوا ہا		آب ہا تابندہ جو سیماب ہا
لالہ ہا در خلوت کہسار ہا		نار ہا یخ بستہ اندر نار ہا

اس میں "ہا" کی صوت کہسار کی متانت اور سنجیدگی کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی طرح حسب ذیل اشعار۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی		شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش		کہسار کے سبزہ پوش خاموش

میں "ش" کی صوت سے خاموشی کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ روح اقبال کے صفحہ ۸۸۔ ۹۳ پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ عبدالواحد صاحب نے بھی اپنی کتاب کے صفحہ ۷۷ پر اس کو نقل کر دیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف اس باب کی حد تک بلکہ دوسرے مباحث مثلاً خودی اور انسان کامل وغیرہ کے سلسلے میں بھی "روح اقبال" سے مصنف نے بہت کچھ رہبری حاصل کی ہے۔ اشعار کے انتخاب میں یہ صورت تو اور بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

"روح اقبال" کے علاوہ دوسری کتاب سے بھی بہت کچھ ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً آرٹ کا منشا ظاہر کرتے ہوئے جو آخری جملہ صفحہ ۱۴۹ پر نظر آتا ہے وہ اکبر علی صاحب کی کتاب کے صفحہ ۴۶۔ ۵۳ سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح صفحہ ۴۹ پر تصوف کی جو تشریح ہے وہ اس کتاب کے ۱۶۸ سے لفظی ہیر پھیر کے ساتھ ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح صفحہ ۱۸۱ میں اقبال کی نئی بحروں اور اوزان کا ذکر

مع مثال اسی کتاب کے صفحہ ۶۱ سے ماخوذ ہے۔ اس کے علاوہ مثنویات کے باب میں جاوید نامہ کی جو صراحت پیش کی گئی ہے وہ سب اسی کتاب کے صفحہ ۴۲۔۴۳ پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اکثر جن باتوں کا ذکر کم و بیش یکساں الفاظ میں جن اشعار کے ساتھ اکبر علی صاحب نے اپنی کتاب میں کیا ہے وہی زیر تبصرہ کتاب میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً "نوائے سروش" والی غزل سے دونوں نے حسب ذیل شعر پیش کیا ہے

اے زاہد ظاہر بیں گیرم کہ خودی فانی است — لیکن تو نمی بینی طوفاں بہ حباب اندر

حالانکہ اس غزل کے حسب ذیل اشعار کلیدی نکتہ کی حیثیت رکھتے ہیں ؎

ترسم کہ تو می رانی ذورق بہ سراب اندر — زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر

بے درد جہاں گیری آں قرب میسر نیست — گلشن بہ گریباں کش اے بو بہ گلاب اندر

وصل الٰہی کے اس عام صوفیانہ خیال پر ان ہی اشعار میں ایک لطیف طنز پایا جاتا ہے جیسے چراغ دہلوی نے اپنی مشہور غزل کے مصرعہ

"او در من و من در او چوں بو بہ گلاب اندر"

سے تعبیر کیا ہے لیکن مصنف نے "اختصار پسندی" کی رَو میں ان کو فراموش کر دیا۔ بلا اعتراف ماخوذ عبارتیں چوتھے باب میں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً اقبال اور کانٹ کے خیالات کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ نیرنگ خیال کے اقبال نمبر میں ایک مضمون پروفیسر یوسف سلیم کا ترجمہ کیا ہوا "اقبال اور فلسفۂ مغرب" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اسی سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح اقبال اور برگساں کے فلسفہ کا جو ایک ادھورا سا ذکر صفحہ ۱۴۰ پر ہے وہ لفظ بہ لفظ اسی مضمون سے لیا گیا ہے۔ غرض معلوم نہیں ایسے کتنے اور ماخذ ہوں گے جن کے اعتراف سے مصنف نے نہ جانے کیوں گریز کیا ہے، بلکہ اس پر یہ کہہ کر ایک قسم کا پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ "میں اقبال کے فلسفہ و شعر کا گذشتہ تیس سال سے مطالعہ کر رہا ہوں، دوران مطالعہ میں مختلف دقتوں کا سامنا کرنا پڑا جسے میں نے

اگر ایسا نہیں ہے تو مصنف صاحب کو بتانا چاہیئے تھا کہ پاکستان کی آزادی ہندوستان کی مادی اور اخلاقی وسائل سے علٰحدہ رہ کر کس طرح اپنے بل بوتے پر قایم رہ سکے گی۔ اوّل تو یہ بات مصنف نے واضح نہیں کی کہ اگر ہندوستان کے شمال مشرقی اور شمال مغربی منطقوں میں آزاد اسلامی مملکتیں قایم ہو بھی گئیں تو آیا ان کا نظم و نسق جدید مغربی جمہوری اصول پر چلایا جائے گا یا قرآنی احکام کے مطابق ؟۔

ہم درّانی صاحب کے اس خیال سے متفق ہیں کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف اوّل الذکر کے جارحانہ قومی اور نسلی تعصب سے اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اکثریت کی حکومت کا اصول اگر ہندوستان میں تسلیم کر لیا جائے تو ایک مخصوص فرقہ کو دائمی غلبہ حاصل ہو جاتا ہے جو اس اصول کی روح کے قطعی طور پر منافی ہے ۔ دراصل اکثریت کی حکومت کا اصول خاص قسم کے سیاسی اور معاشرتی ماحول ہی میں قابل عمل قرار دیا جا سکتا ہے ہندوستان کے مسئلہ کی نوعیت ان ملکوں سے بالکل مختلف ہے جہاں اکثریت کے اصول کے مطابق حکومت کی تشکیل کی جاتی ہے اور یہ اکثریت ہمیشہ ادلتی بدلتی رہتی ہے ۔ ہندوؤں کو جو دائمی اکثریت حاصل ہوگی اسے اس ملک کے مسلمان ظاہر ہے اپنے مفاد کے خلاف سمجھتے ہیں لیکن اس ضمن میں مصنف صاحب کو یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیئے کہ وہ شمال مشرقی اور شمال مغربی منطقوں میں مسلمانوں کی حکومت کے جو دعویدار ہیں تو وہ بھی صرف اکثریت کے اصول پر ۔ جس طرح مرکزی حکومت کی تشکیل میں وہ اکثریت کے اصول کو موزوں نہیں قرار دیتے اسی طرح شمال مشرقی اور شمال مغربی منطقوں میں بھی انھیں اسی اصول کا سہارا نہیں لینا چاہیئے اکثریت کے اصول سے قطع نظر مسلمانوں کی اس ملک میں تاریخی حیثیت اس قدر وزنی ہے کہ وہ اگر اہم سیاسی امور میں برابری کے دعویدار ہیں تو یہ بیجا نہیں ۔ بغیر ان کے کامل تعاون کے ہندوستان کی عظمت اور آزادی کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

مسٹر درّانی نے ہندوؤں کی جارحانہ قوم پرستی کی شکایت کی ہے لیکن اس کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اسی قسم کے جذبات کی دعوت دیتے ہیں (صفحہ ۷۸) جو کسی طرح مناسب

نہیں ۔ اس طرح مسئلہ قیامت تک بھی حل نہ ہوگا بلکہ اس میں اور زیادہ پیچیدگیاں پڑتی جائیں گی ۔

PAKistan از ڈاکٹر شوکت اللہ شاہ ۔ شائع کردہ منروا بک ڈپو ۔ انارکلی ۔ لاہور ۔ قیمت ۸؍ ہے ۔

اس کتاب میں مصنف نے مسئلہ پاکستان کی ابتدا اور دو قوموں کے نظریہ کے نشو و نما کا حال بیان کرنے کے بعد پاکستان کی حمایت اور مخالفت میں جتنے بھی دلائل ممکن ہیں سب بڑے سلیقے سے ایک جگہ جمع کر دئے ہیں ۔ آخر میں یہ ثابت کیا ہے کہ مسلم لیگ جس قسم کی علیحدگی مسلم منطقوں کے لیے چاہتی ہے اس سے ان منطقوں کے رہنے والوں کو سخت نقصان ہوگا ۔ ڈاکٹر شوکت شاہ صاحب نے آخر میں یہ بھی بتایا ہے کہ سیاسی آزادی بغیر معاشی آزادی کے کوئی معنی نہیں رکھتی ۔ یہ تو صحیح ہے لیکن یہ فرض کر لیا گیا کہ پاکستان کے تحت معاشی آزادی حاصل کرنا ممکن نہ ہوگا ۔ اصل بات یہ ہے کہ پاکستان سے مسئلہ کا نفسیاتی حل حاصل نہیں ہوتا جو سیاسی اور معاشی محرکات سے کم اہم نہیں ہے ۔ اگر پاکستان کی اسکیم پر عمل کیا جائے تو اس ملک کے مختلف فرقوں میں اختلاف کی خلیج اتنی وسیع ہو جائے گی کہ پھر وہ کسی طرح پاٹے نہیں پٹے گی ۔ ان کی دائمی کش مکش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ ہندوستان اپنی آزادی برقرار رکھ سکے گا اور نہ پاکستان ، بلکہ زیادہ امکان اس کا ہے کہ کوئی تیسری جماعت ان دونوں پر غلبہ حاصل کر لے گی ۔

اگر لائق مصنف اس امر پر بھی روشنی ڈالتے تو اچھا ہوتا کہ پاکستان کے خیال کو ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک بڑی مملکت میں کیوں اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے ؟ جن پر اس کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے انھیں اب کھویا ہوا اعتبار حاصل کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں تاکہ ملک کی وحدت برقرار رہ سکے اور مختلف

طبقے اطمینان اور عزت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے باہمی اعتماد پیدا ہو کہ بغیر اس کے ہندوستان کا سیاسی مستقبل تاریک رہے گا اور مسئلہ کے جو حل بھی پیش کئے جائیں گے وہ مزید الجھنیں پیدا کرنے کا موجب بنیں گے۔

ی۔ ح۔ خ